شعاع

مارچ 2024

www.Pklibrary.com

سالگرہ نمبر

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

واٹس ایپ
03172266944

بانی — محمود ریاض
مُدیرِ اعلیٰ — اختر ریاض
مُدیرہ — رضیہ جمیل
مُدیرۂ خصوصی — امتہ الصبور
فلم/ٹیلی وژن — شاہین رشید
قانونی مشیر — نورالدین سرکی اینڈ کمپنی
ایڈووکیٹس اینڈ لیگل ایڈوائزرز

پہلی شعاع، مدیرہ 6
حمد، محمد اعظم چشتی 7
نعت، ادا جعفری 7
نبی ﷺ کی باتیں، ادارہ 8

انٹرویو

سائرہ یوسف سے ملاقات، شاہین رشید 19
دستک، شاہین رشید 17
جب تجھ سے ناتا، ف۔م۔ بٹ 13

ناول

والعصر، امتہ العزیز شہزاد 30

مکمل ناول

شہر شام ہجر، فرح بخاری 174
ماء الملوک، نگہت سیما 118
دستور وفا، مریم عزیز 148
پھول زلفوں میں، [illegible] تنویر 78

ناولٹ

چوتھی بہو، راشدہ رفعت 56

افسانے

مالِ غنیمت، ہاجرہ ریحان 50
وقتی فائدہ، لبنیٰ آصف 76
معتبر، صائمہ نور 113
چند لقموں کی خاطر، [illegible] 144

مارچ 2024
جلد 37 شمارہ 07
قیمت 150 روپے

نظمیں غزلیں

نظم	امجد اسلام امجد	196
غزل	مبارک صدیقی	196
نظم	خالد معین	197
غزل	ظریف احسن	197

مستقل سلسلے

خط آپ کے	ادارہ	22
باتوں سے خوشبو آئے	شگفتہ جاہ	200
کھلتا کسی پہ	حبیبہ خان	203
تاریخ سے جھروکے	امت الصبور	204
مسکراہٹیں	ادارہ	198
موسم کے پکوان	واصفہ سہیل	208
خوبصورت بندے	ادارہ	210

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری
پاکستان (سالانہ) ------ 1800 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، یورپ ---- 25000 روپے
سالانہ خریداری کے لیے ای میل کریں
subscriptions@khawateendigest.com

MEMBER APNS CPNE
رکن آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز

خط و کتابت کا پتہ
ماہنامہ شعاع
37- اردو بازار، کراچی

pklibrary.com

رضیہ جمیل

شعاع کی پہلی بات

شعاع مارچ کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

یہ شمارہ آپ کو ملے گا تو رمضان المبارک کا مقدس مہینہ سایہ فگن ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہم پر بہت مہربان ہے۔ وہ ہمیں بار بار موقع دیتا ہے کہ ہم گناہوں سے توبہ کر کے اس کی طرف لوٹ آئیں۔ اپنی نیکیوں میں اضافہ کریں اور اس کی رحمت و بخشش سے فیض یاب ہوں۔ اس لیے ہمیں رمضان المبارک کا مہینہ عنایت فرماتا ہے۔ اس مہینے میں فرض اور نفل عبادتوں کا ثواب کئی گنا بڑھا دیا جاتا ہے۔ رمضان المبارک کا مہینہ ہمارے لیے قدرت کا انعام ہے۔

اس ماہ مبارک میں رحمت و بخشش کے در کھل جاتے ہیں۔ اس مہینہ میں ایک رات ایسی ہے۔ جس کی عبادت ہزار مہینوں کی عبادت کے برابر ہے۔

روزے کی روح تقویٰ اور پرہیز گاری ہے۔ روزہ کا مقصد تب ہی پورا ہوگا جب آپ جھوٹ، چغلی، غیبت اور لڑائی جھگڑے سے بچیں۔ مختلف چینلز اور یوٹیوب جب سے ہماری زندگی میں داخل ہوئے ہیں، یوں لگتا ہے جیسے رمضان المبارک نت نئے کھانے پکانے اور کھلانے کا مہینہ ہے۔ کھانے پر اہتمام ضرور کریں لیکن یہ نہ بھولیں رمضان المبارک کی اصل روح اپنے کردار کو سنوارنا اور عبادت کر کے اللہ کا قرب حاصل کرنا ہے۔

عید نمبر

اپریل کا شمارہ عید نمبر ہوگا جس میں قارئین سے سروے بھی شامل ہوگا۔

سروے کے سوالات یہ ہیں۔

(1) جس حساب سے مہنگائی بڑھ رہی ہے، اس نے اچھے اچھوں کے بجٹ پر اثر ڈالا۔ آپ کے رمضان کے اخراجات اور عید کی تیاریوں پر مہنگائی کس حد تک اثر انداز ہوئی؟

(2) شادی سے پہلے اور اب شادی کے بعد عید میں کیا فرق محسوس ہوتا ہے؟

(3) آپ بچپن میں عید کیسے مناتی تھیں۔ اب کیسے مناتی ہیں؟

(4) اپنی ذات کے حوالے سے آپ عید کے لیے خاص طور پر کس چیز کا اہتمام کرتی ہیں۔ چوڑیاں، مہندی، کپڑے، گھر کی آرائش یا کوئی خصوصی ڈش۔

ان سوالات کے جوابات اس طرح بھجوائیں کہ ہمیں 20 مارچ تک موصول ہو جائیں۔

ایک اور چراغ مٹی میں رکھ دیا ہے

ہم سفر بچھڑتے چلے جاتے ہیں۔ دنیا تو آباد ہے، آباد ہی رہے گی۔ یہ کائنات تخلیق کرنے والے کا اٹل ضابطہ ہے۔ لیکن جب دوست احباب بچھڑنے لگیں تو تنہائی کا احساس گہرا ہو جاتا ہے۔

ساجدہ حبیب بھی دنیا سے رخصت ہوئیں۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

ساجدہ حبیب جتنا اچھا لکھتی تھیں، اتنی ہی پیاری شخصیت کی مالک تھیں۔ ان کی وفات ہمارے لیے بہت بڑا سانحہ ہے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں اعلا مقام عطا فرمائے۔ آمین

حمد

اے خدا تیرے جمال و زیبائی
خوب ہے تیری عالم آرائی

تُو کہاں ہے کہاں نہیں ہے تُو
محوِ حیرت ہے تابِ گویائی

سب میں موجود اور سب سے جُدا
کون سمجھے یہ رازِ تنہائی

پارہ پارہ قبائے استدلال
ریزہ ریزہ ہے دامِ جویائی

کیا نظر آئے ماسوا کا جہاں
دیکھ کر تیری شانِ یکتائی

یاس میں، غم میں اور مشکل میں
تیری رحمت ہی سب کے کام آئی

اعظم اس نام سے ہے گلشن میں
زندگی، تازگی و رعنائی

محمد اعظم چشتی

نعت

طوفان میں جیسے دُور سے ساحل دکھائی دے
میں اُن کو سوچ لوں مجھے منزل دکھائی دے

یہ اور راستے ہیں حدی خواں انجیل کے چل
طیبہ کا ذرّہ ذرّہ مجھے دل دکھائی دے

گم ہو نہ جاؤں راہ میں اے صاحبِ کرم
اک بار پھر وہ جادۂ منزل دکھائی دے

طرزِ دُعا بھی سونپ رہی ہوں نگاہ کو
کیوں حرفِ التجاؤں میں حائل دکھائی دے

وہ لمحۂ گریز قدم میری کائنات
جب آئینہ سا دل کے مقابل دکھائی دے

وہ راہرو نہیں ہے اسے کارواں کہو
اس در کی آرزو میں جو شامل دکھائی دے

مل جائیں گے وہیں سے اُجالے، جہاں ادا
تنویرِ مہر و ماہ بھی سائل دکھائی دے

ادا جعفری

صلوٰۃ التسبیح

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

"اے عباس رضی اللہ عنہ! کیا میں تمہیں ایسی عبادت کے بارے میں بتاؤں کہ جس پر عمل کرنے سے اللہ تعالیٰ تمہارے اگلے اور پچھلے، نئے اور پرانے قصداً اور سہواً، چھوٹے اور بڑے، چھپے اور ظاہر تمام گناہوں کو بخش دے گا۔ تم روزانہ چار رکعت نماز تسبیح پڑھا کرو۔ اگر ممکن نہ ہو تو جمعہ میں (سات دنوں میں ایک بار) یہ بھی نہ کر سکتے ہو تو مہینے میں ایک ایک دفعہ پڑھ لیا کرو۔ اگر یہ بھی نہ کر سکتے ہو تو سال میں ایک مرتبہ پڑھو اور اگر ایسا بھی نہ کر سکو تو پھر ساری عمر میں کم از کم ایک دفعہ یہ نماز پڑھ لو تو اللہ تعالیٰ تمہارے تمام گناہ معاف کر دے گا۔"

فوائد و مسائل:۔

"آج کل کی بے پناہ مصروفیات میں نماز تسبیح کا روزانہ پڑھنا یقیناً مشکل کام ہے، حتیٰ کہ مہینے میں بھی ایک دفعہ اس کا اہتمام کرنے کا موقع شاید چند ہی خوش نصیب لوگوں کو ملتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز تسبیح کی اتنی فضیلت بیان فرمائی ہے کہ اگر اسے سال میں ایک دفعہ بھی ادا کیا جائے تو اس کے بے پناہ اجر و ثواب سے مستفید ہوا جا سکتا ہے۔ لہٰذا اس بابرکت نماز کی ادائیگی کے لیے رمضان المبارک سے قبل یا اس کے بعد چار رکعت نماز تسبیح بہ آسانی ادا کی جا سکتی ہے۔ اس طرح بابرکت اور بے پناہ اجر و ثواب کی حامل نماز کا اہتمام ممکن ہے۔

آپ چار رکعت نفل اس طرح ادا کریں کہ ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ کے بعد اور کوئی دوسری سورت پڑھیں۔ اس کے بعد قیام کی ہی حالت میں کلمہ تمجید پندرہ بار پڑھیں۔

"سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر۔" پھر رکوع میں جائیں۔ رکوع کی تسبیحات پڑھیں۔ پھر ان ہی کلمات کو دس بار دہرائیں۔ پھر رکوع سے اٹھ جائیں اور سمع اللہ لمن حمدہ کے بعد دس بار یہی کلمات پڑھیں۔

پھر سجدے میں جائیں۔ (سجدے کی تسبیحات اور دعائیں) پڑھنے کے بعد یہی کلمات دس بار پڑھیں۔ پھر سجدے سے سر اٹھا کر جلسہ میں اور (جلسے کی دعائیں پڑھنے کے بعد) یہی کلمات دس بار پڑھیں۔

پھر دوسرے سجدے میں چلے جائیں اور سجدے کی تسبیح کے بعد دس بار یہی کلمات دہرائیں۔ (پہلے سجدے کی طرح) پھر سجدے سے سر اٹھائیں اور جلسہ استراحت میں کچھ اور پڑھے بغیر دس بار اس تسبیح کو دہرائیں۔

یوں ایک رکعت میں 75 تسبیحات ہو جائیں گی۔ اسی طرح چار رکعت پڑھی جائیں گی۔

تشہد میں تسبیحات التحیات سے پہلے پڑھیں۔

اعتکاف

اعتکاف کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ انسان چند دنوں کے لیے دنیا کی مشغولیات اور مصروفیات سے قطع تعلق کر کے مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کی بندگی اختیار کرتے ہوئے اس کا رنگ اپنے اوپر چڑھا لے۔ رمضان المبارک کے آخری دس دنوں میں مسجد میں

pklibrary.com

مختلف ہونا مسنون عمل ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پوری زندگی باقاعدگی سے اعتکاف میں بیٹھنے کا اہتمام فرماتے رہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں۔

"جب رمضان المبارک کا آخری عشرہ آتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی کمر کس لیتے، راتوں کو جاگتے، اپنے گھر والوں کو جگاتے اور اتنی محنت کرتے جتنی کسی اور عشرے میں نہ کرتے۔" (بخاری و مسلم)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ:۔

"نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رمضان المبارک کے آخری عشرے کا اعتکاف فرماتے رہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو وفات دی۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات بھی اعتکاف کرتی رہیں۔" (بخاری و مسلم) اعتکاف، تزکیہ نفس اور تقویٰ اختیار کرنے کا بہترین نسخہ ہے۔ سال کے 365 دنوں میں انسان دنیا کے مسائل اور دیگر مصروفیات میں ڈوبا رہتا ہے۔ اگر ان 365 دنوں میں صرف دس اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول اور اپنے سال بھر کے گناہوں اور خطاؤں کی بخشش کے لیے وقف کر دیے جائیں تو یہ کوئی مہنگا سودا نہیں۔ اعتکاف کے دس دنوں کے لیے الگ سے ایک خصوصی ٹائم ٹیبل ترتیب دیا جاسکتا ہے۔ جس میں چند گھنٹے آرام کے سوا زیادہ تر وقت تلاوت، مطالعہ قرآن پاک، مطالعہ حدیث، مطالعہ اسلامی کتب، حفظ اور ذکر واذکار اور دیگر عبادت الٰہی میں گزارا جاسکتا ہے۔

شب قدر

رمضان المبارک وہ مہینہ ہے جس میں ایک رات ایسی ہے جسے ہزار مہینوں سے بہتر قرار دیا گیا ہے۔ قران پاک میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔

"ہم نے اس قرآن کو شب قدر میں نازل کیا ہے اور تم کیا جانو کہ شب قدر کیا ہے؟ شب قدر ہزاروں مہینوں سے زیادہ بہتر ہے۔" (القدر 297۔3)

یہ مبارک رات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق رمضان المبارک کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں تلاش کی جاسکتی ہے۔ اس رات کی فضیلت کو پانے کے لیے رمضان المبارک کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں عبادت پر خصوصی توجہ دینی چاہیے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"ایک سال رمضان المبارک آیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تم لوگوں پر ایک مہینہ آیا ہے جس میں ایک رات ہے جو ہزار مہینوں سے افضل ہے۔ جو شخص اس رات سے محروم رہ گیا، وہ سارے کے سارے خیر سے محروم رہ گیا۔ اس رات کو خیر و برکت سے محروم وہی رہتا ہے جو واقعی محروم ہے۔" (ابن ماجہ)

فوائد و مسائل:۔

1۔ چونکہ آخری عشرہ شروع ہونے تک روزہ داروں کی کافی تربیت ہو چکی ہوتی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کی عبادت کو سونے سے کندن بنانے کے لیے رمضان المبارک کے آخری عشرے اور بالخصوص طاق راتوں میں لیلۃ القدر تلاش کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس حکم کا مقصد روزہ داروں کو زیادہ سے زیادہ عبادت الٰہی اور ذکر الٰہی کی ترغیب دینا ہے۔ چونکہ رمضان المبارک اپنی بھرپور رفعتوں کے ساتھ اختتام کی جانب بڑھ رہا ہوتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو جہنم کی آگ سے بچانے کے لیے قیام اللیل اور اعتکاف کے ذریعے تربیت دینا چاہتا ہے۔

2۔ انسان کی تعلیم و تربیت کے لیے آسان سے مشکل کا اصول ایک کارگر نسخہ سمجھا جاتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ اپنے محبوب بندوں پر یک لخت کوئی بوجھ ڈالنے کے بجائے ان کی تعلیم و تربیت ماہ رمضان المبارک میں اسی اصول یعنی آسان سے

مشکل کے تحت کرنا چاہتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے پہلے دو عشروں کی نسبت آخری عشرے میں زیادہ ریاضت اور عبادت کی تاکید فرمائی ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: ''میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ شب قدر کون سی ہے تو میں اس میں کیا پڑھوں؟'' تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اللھم انک عفو تحب العفو فاعف عنی۔''

ترجمہ: ''اے اللہ! بے شک تو بہت معاف کرنے والا ہے اور معاف کرنے کو پسند کرتا ہے، پس تو مجھے معاف فرما دے۔''

3۔ انسان سال کی 365 راتیں سو کر گزارتا ہے۔ اگر ان 365 راتوں میں ایک رات اللہ تعالیٰ کی رضامندی کی خاطر عبادت میں جاگ کر گزاری جائے تو اس کے اجر و ثواب کا وعدہ ہزاروں راتوں کے برابر کیا گیا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے اس سے بھی بڑھ کر اجر و ثواب دیتا ہے۔

اللہ کی راہ میں خرچ کرنا

نماز، روزہ اور حج کا تعلق زیادہ تر بدن سے ہے۔ لیکن زکوٰۃ اور صدقات کا براہ راست تعلق مال و دولت سے ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ربانی ہے۔

''اور جو لوگ سونا چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور ان کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے سو آپ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں ایک بڑی دردناک سزا کی خبر سنا دیجیے جو کہ اس روز واقع ہوگی کہ ان کو دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا۔ پھر ان سے ان لوگوں کی پیشانیوں کو اور ان کی کروٹوں اور پشتوں کو داغ دیا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا یہ ہے وہ مال جس کو تم نے اپنے لیے جمع کر رکھا تھا۔ سو اب اپنے جمع کرنے کا مزا چکھو۔'' (التوبہ 9۔34۔35)

اسی طرح ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

''تم ہرگز نیکی حاصل نہ کر سکو گے جب تک وہ مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہ کرو جو تمہیں بہت عزیز ہے۔'' (آل عمران 92:3)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں۔ ''حضور صلی اللہ علیہ وسلم سارے انسانوں میں سب سے زیادہ فیاض اور سخی تھے، لیکن جب رمضان المبارک کا مہینہ آتا تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سخاوت اور فیاضی کی کوئی انتہا نہ رہتی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فیاضی میں بارش لانے والی ہوا کی مانند ہو جایا کرتے تھے۔'' (بخاری)

فوائد و مسائل:۔

1۔ راہ خدا میں صدقہ و خیرات سے جہاں مال کی پاکیزگی کا فریضہ ادا ہوتا ہے۔ وہیں اس سے نہ صرف اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور نعمتیں بارش کی مانند خرچ کرنے والوں پر برستی ہیں، بلکہ اس سے معاشرے میں موجود طبقاتی تقسیم اور عدم مساوات کی خلیج کو بھی پاٹنے کا موقع ملتا ہے۔ غریبوں اور ناداروں کی مشکلات میں کمی لانے اور ان کی مالی اعانت کے لیے اللہ تعالیٰ نے معاشرے کے صاحب ثروت اور مال دار افراد پر ان کے مال و دولت کی پاکیزگی کی خاطر سال میں ایک دفعہ زکوٰۃ کی ادائیگی کو فرض قرار دیا ہے۔

2۔ زکوٰۃ کے لغوی معنی پاکیزگی کے ہیں۔ جبکہ شریعت کی رو سے زکوٰۃ مال کے اس حصے کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں بتائے ہوئے طریقے یعنی نصاب کے مطابق معاشرے کے صاحب ثروت افراد معاشرے کے غریب، نادار، مساکین اور ضرورت مند افراد میں تقسیم کرتے ہیں۔

3۔ زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے ماہ رمضان المبارک بہترین مہینہ ہے۔ ایک تو اس ماہ مبارک میں کسی بھی فرض اور نفل عبادت کا اجر اللہ تعالیٰ کئی گناہ بڑھا کر دیتا ہے اور دوم چونکہ معاشرے کے

صاحب ثروت اور مال دار افراد تو اپنی مال داری اور ثروت کی وجہ سے افطاری میں انواع واقسام کی نعمتوں سے مستفید ہوتے ہیں۔ لیکن معاشرے کے غریب اور مفلوک الحال افراد جو روزے کی شدت کے باوجود اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے دن بھر محنت مزدوری کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، لیکن پھر بھی ان کو کھانے پینے اور پہننے کی وہ سہولیات نصیب نہیں ہوتیں جو کسی بھی انسان کا بنیادی حق ہیں۔ اس لیے اگر اس ماہ مبارک میں مال دار اور صاحب ثروت افراد معاشرے کے محروم افراد کے دکھوں کا احساس کرتے ہوئے اپنی زکوٰۃ اور صدقات پوری ایمان داری کے ساتھ ادا کریں تو اس سے معاشرے میں غریب اور بے سہارا افراد کے دکھوں اور غربت کو بانٹنے میں کافی مدد مل سکتی ہے۔

رمضان المبارک میں خرچ کرنے کی اہمیت بیان کرتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

''جو شخص اس مہینے میں کسی روزہ دار کو افطار کرائے تو اس کے لیے گناہوں سے مغفرت اور دوزخ کی آگ سے رہائی ہے۔ اس کو اتنا ہی ثواب ملے گا جتنا روزہ دار کو، اس سے روزہ دار کے ثواب میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی۔''

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! ہم میں سے سب کے پاس اتنا سامان تو نہیں ہوتا کہ روزہ دار کو افطار کرائیں۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''اللہ تعالیٰ یہ ثواب اس کو بھی عطا کرتا ہے جو ایک گھونٹ دودھ، ایک کھجور اور پانی کے ایک گھونٹ سے کسی روزہ دار کو افطار کرائے گا۔'' (بیہقی)

اس حدیث شریف سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اگر کوئی صاحب حیثیت نہیں ہے اور اس کے پاس کسی کو دینے کے لیے یا کسی کو افطار کرانے کے لیے کچھ زیادہ نہیں ہے تو ایک گھونٹ پانی یا ایک گھونٹ دودھ یا ایک کھجور سے بھی کسی مسلمان بھائی کو افطار کرا کے گناہوں کی مغفرت اور جہنم کی آگ سے بچنے کا اہتمام کر سکتا ہے۔

4۔ اسلام صدقات وخیرات کی بھی بھرپور حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رمضان المبارک میں ایک ایک دانہ اور ایک پیسہ صدقہ وخیرات کرنے پر کم از کم سات سو گناہ اجر کا وعدہ فرمایا ہے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ جس کو وہ چاہے گا، اس سے بھی زیادہ عطا کرے گا۔

5۔ زکوٰۃ کی ادائیگی کے علاوہ اس ماہ مبارک میں کوشش کرنی چاہیے کہ روزانہ کچھ نہ کچھ مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کیا جاتا رہے، جس سے مال ودولت میں برکت پیدا ہوگی۔ اس عمل سے جہاں صدقہ وخیرات کرنے والوں میں شکر گزاری اور ایثار وقربانی کا جذبہ فروغ پائے گا۔ وہاں اس عمل سے غریب اور بے کس انسانوں کی امداد کی راہ بھی ہموار ہوگی۔

6 تقویٰ کے حصول کے لیے جہاں بدنی عبادت کی بہت زیادہ تاکید بیان کی گئی ہے۔ وہاں مالی عبادت یعنی صدقہ وخیرات اور زکوٰۃ کی بروقت مستحقین کو ادائیگی بھی لازمی شرط ہے۔ اسلام مال اور دولت کو سینت سینت کر جمع کرنے کی ویسے بھی مخالفت کرتا ہے، اس لیے اس مبارک مہینے کے توسط سے زیادہ سے زیادہ مال ودولت اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کا خصوصی اہتمام کرنا اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کا باعث بن سکتا ہے۔ زکوٰۃ تقسیم کرتے وقت اس بات کا خصوصی خیال رکھنا چاہیے کہ اس میں کسی غریب اور مستحق زکوٰۃ کی عزت نفس مجروح نہ ہو، بلکہ انتہائی عاجزی اور خاموشی سے کسی کو بتائے بغیر مستحق لوگوں کی مدد کرنی چاہیے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

''صدقہ وخیرات اس طرح کرنا چاہیے کہ اگر یہ دائیں ہاتھ سے دیا جائے تو بائیں ہاتھ تک کو اس کی

خبر نہ ہو۔"

یعنی بڑی رازداری اور خاموشی سے بغیر کوئی احسان جتلائے اپنے ضرورت مند مسلمان بھائی کی مدد کرنی چاہیے۔ اسلام میں احسان جتانے کو برا فعل قرار دیا گیا ہے۔

فطرانہ

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے۔

"صدقہ فطر کو اس لیے واجب کیا گیا ہے، تاکہ روزوں میں روزہ دار سے جو فضول اور بے حیائی کی باتیں سرزد ہو جاتی ہیں۔ ان کا کفارہ بنے۔ مساکین و غریبوں کے لیے کھانے، پینے کا انتظام ہو جائے۔ جو اسے نماز عید الفطر سے پہلے ادا کرے تو فطرانہ قبول ہوتا ہے۔ اور جو اسے نماز عید کے بعد ادا کرے تو یہ بھی دوسرے صدقات کی طرح کا ایک صدقہ ہوگا۔" (ابوداؤد)

1۔ جیسا کہ اس حدیث مبارک میں فطرانے کا بنیادی مقصد روزے کی حالت میں سرزد ہونے والی خطاؤں کا کفارہ ادا کرنا ہے، یعنی اگر رمضان المبارک میں روزہ دار سے بھول چوک اور بشری کمزوریوں کے باعث ایسی خطائیں سرزد ہو گئی ہیں جن کی وجہ سے روزے کی قبولیت اور اس کے اجر و ثواب میں کمی کا امکان ہو تو اس کمی کے ازالے کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ فطر یا فطرانے کی ادائیگی کا حکم دیا ہے۔

2۔ فطرانہ کی ادائیگی میں غیر ضروری تاخیر سے اجتناب کیجیے۔ کوشش ہونی چاہیے کہ فطرانہ عید الفطر سے قبل ادا کر دیا جائے، بلکہ عید الفطر سے بھی اگر دو چار دن پہلے اپنے حصے کا فطرانہ مستحق افراد میں تقسیم کر دیا جائے تو اس طرح معاشرے کے ضرورت مند اور مستحق افراد کو بھی عید الفطر کی خوشیوں میں شریک ہونے کا موقع مل سکے گا۔ مستحقین کو فطرانے کی بروقت ادائیگی سے مستحقین بھی اپنے مال بچوں کے لیے کھانے پینے کی اشیا، کپڑے اور بعض دیگر ضروریات زندگی کی خریداری عید سے قبل ہی کرنے کے قابل ہو سکیں گے۔ جتنا فطرانہ ایک شخص پر واجب ہے اس کی عدم ادائیگی یا ادائیگی میں ٹال مٹول اور تساہل سخت گناہ ہے۔ لہٰذا عدم ادائیگی کا تو تصور ہی محال ہے۔ البتہ اگر کسی کی استطاعت ہو تو واجب الادا فطرانے سے زائد مال بھی معاشرے کے غریب اور مستحق افراد میں تقسیم کر سکتا ہے۔ واجب فطرانے سے زائد۔ صدقہ و خیرات کی ادائیگی سے مال و دولت میں برکت پیدا ہوگی اور اس اخلاص سے اللہ تعالیٰ کی رضا بھی حاصل ہوگی۔

3۔ اسلامی اخوت و محبت کا بھی یہ تقاضا ہے جو انسان عید الفطر کے موقع پر اپنے اہل و عیال اور دیگر عزیز رشتہ داروں کی خوشی کی خاطر خوراک، لباس اور دیگر ضروریات زندگی کے ڈھیر لگانے سے بھی دریغ نہیں کرتا اسے چاہیے کہ اپنے معاشرے کے محروم اور غریب و نادار افراد کو بھی اپنی خوشیوں میں یاد رکھے۔ فطرانے کے واجب ہونے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ معاشرے کے صاحب ثروت افراد کو اس بات کا پابند بنایا جائے کہ جہاں وہ عید الفطر کی خوشیاں اپنے لیے سمیٹنے میں مصروف ہوں وہاں اپنے ارد گرد رہائش پذیر ایسے مسلمانوں کو بھی یاد رکھیں جو اپنی غربت اور لاچاری کی وجہ سے اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال پر خرچ کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ اللہ تعالیٰ نے بیواؤں، یتامیٰ، غربا اور مساکین کی معاشی مجبوریوں کا ازالہ کر کے اسلامی معاشرے کو معاشی عدم مساوات کے بھنور میں گرنے سے بچانے کے لیے زکوٰۃ، صدقات اور فطرانے جیسے احکامات نازل کر کے دین اسلام کو رہتی دنیا تک پوری انسانیت کے لیے معاشی لحاظ سے ایک بہترین نمونے کے طور پر پیش کیا ہے۔

☆☆

pkibrary.com

جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے

ف ۔ م ۔ بٹ

س 1: شادی کب ہوئی؟

18 جنوری 1974، کافی برس پہلے سرما کی خوب صورت شام کو میں گوجرانوالہ سے رخصت ہو کر پیاسنگ سیالکوٹ ایک انتہائی بھرے پرے گھر میں چلی آئی۔

میرے ساس سسر ماشاء اللہ حیات تھے اور انتہائی اچھے تھے۔ نیک صورت، نیک سیرت تھے کھاد کے بغیر فصلیں اناج کھانے والے خالص ترین لوگ تھے۔ میری کئی جیٹھانیاں تھیں۔ ظاہر ہے جیٹھ بھی تھے انگلیوں پہ گن لوں، ذرا ٹھہریئے کل چار اور ایک دیور سب شادی شدہ تھے سوائے ایک جیٹھ کے۔

ان کی میرے بعد میری کزن (ماموں زاد) سے شادی ہوئی جو کہ میرے شوہر منیر سے شادی کی خواہش مند تھی اب وہ حیات نہیں، وہ میرے جیٹھ کی بیوی بنی اور لندن چلی گئی مگر اسی کزن شہناز کی دونوں خالائیں میری جیٹھانیاں تھیں وہ اپنی بھانجی شہناز کو ہی دیورانی کے روپ میں دیکھنا چاہتی تھیں مگر منیر کی بیوی کی صورت میں قدرت نے مجھے مسز منیر بنا دیا اور اسے مسز قدیر۔

میری دونوں جیٹھانیاں کبھی مجھے وہ عزت نہ دے سکیں جو میرا حق تھا مگر میرے شوہر نے جو زندگی مجھے دی جو حق مجھے اپنے والدین سے دلوایا وہ آنے والی ہزاروں لڑکیوں کے لیے مشعل راہ ہے۔

میں نے اسی لیے اس عنوان پر لکھنا پسند کیا تا کہ اتنے سال گزر جانے کے بعد بھی میری خوش نصیبی پر لڑکیاں رشک کریں اور اپنے گھروں کے لیے میرے جوابات کے آئینے پسند کریں دیکھیں، پرکھیں، سوچیں اور پھر ایک گائیڈ لائن اپنے لیے وضع کر کے زندگی کو بھرپور طریقے سے گزاریں جیسا کہ حق بنتا ہے۔

جی تو جناب سنیے میری کہانی قلم کی زبانی ہم سب مل کر تمام باتوں کے باوجود اکٹھے تھے۔ کھانا پکنا پکانا، کھانا وغیرہ سب مل کر برتن دھوتے مگر مجھ سے کم دھلواتے نئی نئی دلہن ہونے کی بنا پر، آہستہ آہستہ کبھی کبھار میں کھانا بھی بنا لیتی، برتن بھی دھلوا دیتی۔

ہمارے گھر کے بالکل سامنے دودھ دہی غلام رسول سوئیٹس کی مشہور دکان تھی آج کئی برس گزرنے کے بعد بھی غلام رسول سوئیٹس کا نام سیالکوٹ میں بہت مشہور ہے۔ امام صاحب کا مزار، جمعرات کو لگنے والا میلہ اور گلی کشمیری بہت گہما گہمی والے علاقے تھے۔ ہمارے سسرالی صبح صبح بٹ فیملی والے دودھ، دہی، پراٹھے، روٹی کا ناشتہ کرتے تھے۔ کھانا میری دونوں جیٹھانیاں مل کر بناتیں۔ دوپہر کو سب اپنا اپنا ایک ہی ہنڈیا وہ بھی بغیر گیس کے چولہے پر پکاتیں، نکالتیں، پروستیں اور کھاتیں۔

ان کے بچے بھی تھے ایک جیٹھانی کے چار، دوسری کے تین ایک جیٹھ بے اولاد تھے میں فی الحال فارغ تھی۔ میاں گورنمنٹ کامرس کالج مشہور زمانہ قلعہ سیالکوٹ میں اردو کے انسٹرکٹر+ اسلامیات لازمی، اختیاری دونوں کے پروفیسر تھے۔ قریشی صاحب اللہ ان کو غریق رحمت فرمائے جو آج موراں والی خانقاہ کے زیر سایہ سیالکوٹ کینٹ میں آرام فرما ہیں۔ پرنسپل تھے۔ زندگی گڈ گڈ گزرتی جا رہی تھی۔ محبت کرنے والا شوہر، خیال رکھنے والے انصاف پسند ساس، سسر جنہوں نے تمام بہوؤں کو آزادی دے رکھی تھی آزادی رائے+ آزادی حیات۔

گوشت کی دکان ہمارے گھر کے دائیں طرف اور چاچا نائی کی دکان گھر کے بائیں طرف سسرالی جائیداد ہی میں تھی۔ بارونق ایریا تھا اور گھر بھی کافی بڑا

pklibrary.com

تھا، سب کے اپنے اپنے کمرے تھے باورچی خانہ مشترکہ واش روم، مشترکہ چھت مشترکہ تھی۔

جوائنٹ فیملی سسٹم کا دارومدار گھر کے بڑے بزرگوں پر منحصر ہوتا ہے لیکن گھر کے باقی ممبرز بھی بھرپور تعاون کریں تو ایک آئیڈیل گھرانہ بنتا ہے۔ یہ نہیں تھا کہ ایک دوسرے کی باتیں بری نہیں لگتی تھیں یا کام تقسیم نہیں ہوتے تھے یا شوہروں کو گھر کی باتیں راز داری سے نہیں بتائی جاتی تھیں سب خامیاں+خوبیاں ساتھ ہی تھیں لیکن برداشت، وسیع النظری، وسیع القلبی ،حوصلہ ہوا کرتا تھا۔

یہ میرے ساس سسر نے اپنے تمام بیٹوں کو ورثے میں دیا تھا میری کوئی نند نہیں تھی۔ مردوں سے بھرا گھرانہ ادب، عزت، حیا یہ کردار میں نمایاں تھیں ایک جیٹھ منیجر آف مسلم بینک، دوسرے آفیسر آف پوسٹ آفس اور دو ملک سے باہر ابوظہبی ایئرپورٹ پہ گورنمنٹ کے ملازم، تیسرے لندن میں گورنمنٹ کے ملازم تھے میرے والے پروفیسر اور سب سے چھوٹے والے بھی بینک میں جاب کرتے تھے۔ بہت لائق گھرانہ تھا۔ میرے اپنے والد بھی ہیلتھ افیسر تھے چچا+خالو ریلوے میں گارڈ تھے۔

بڑے اچھے گھرانے سے 1974ء میں جوڑا بنا جب ناتا جڑا تو میری عمر صرف 18 سال تھی میں اپنی بہنوں میں اکلوتی یعنی دو بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی میری ایک نہیں بہن تھی مگر چچی+خالہ کو میرے والدین نے دے دی تھی۔ خیالوں کے تانے بانے کہاں کہاں آج ملنے لگے ہیں، برسوں کی تمہیں اٹھنے لگی ہیں اور رنگ برنگی تتلیاں میرے اردگرد منڈلانے لگی ہیں۔ بیتے لمحوں کی دستکیں سن کر کواڑ محبت کھلنے لگے ہیں۔ بہت شکریہ خواتین+شعاع کیونکہ میری چھوٹی بہن نزہت شاہد خواتین، شعاع، کرن، حنا، اخبار خواتین، زیب النساء، حور سب رسالے ڈائجسٹ پڑھتی تھی۔

1975ء سے لے کر 1990ء تک اس نے ہر رسالہ ایسے سنبھال کر رکھا ہوا تھا اپنے لڑکپن سے شادی اور بعد تک کہ مانو اوراق چاہے بوسیدہ ہو گئے ہوں ان کی صفائی ستھرائی میں ذرہ برابر فرق نہ آیا تھا یہ آپ کے ڈائجسٹ ہم نے پڑھے اور اپنی بچیوں کو بھی میٹرک کے بعد پڑھنے دیئے کیونکہ دلگیری نہیں تھی۔ اور آج میری بڑی بیٹی جو شادی کے ایک سال بعد 1975ء جنوری کی 10 تاریخ کو پیدا ہوئی اسی کی فرمائش پر اس سلسلے میں حاضر ہوں۔

س2: شادی سے پہلے مشاغل اور دلچسپیاں؟

مشاغل اور دلچسپیاں ریڈیو سننا اور ڈائجسٹ پڑھنا، اسکول، کالج کی پڑھائیاں تھوڑا بہت فیشن اپنے دور کے مطابق، بیل باٹم، امبریلا کٹ دوچوٹیاں بن ڈال کر، آنکھوں میں بڑے بڑے سلائی کے ساتھ ڈورے+خوشیاں ہی خوشیاں، کوکنگ ویکنگ کم کرتی تھی بس اپنا خیال رکھنا پسند تھا۔ کپڑے وغیرہ بھی درزی سے والدین سلوا کر دیا کرتے۔ گھر میں رزق کی ریل پیل تھی الحمدللہ۔

س3: شادی میں مرضی شامل تھی یا بزرگوں کے فیصلے پر سر جھکا دیا۔

بزرگوں کے فیصلے پر ٹوٹلی سر جھکایا میرے شوہر محمد منیر بٹ کی یک طرفہ محبت شامل تھی اسی لیے تو انہوں نے میری ماموں زاد کی ضد بازی کو نظر انداز کر کے میرے گھر میں میرے لیے رشتہ بھیجا اور میرے والد محترم نے پڑھے لکھے انسان کو عزت و احترام سے اپنا داماد بنایا الحمدللہ۔

س4: جیون ساتھی کے حوالے سے کیا تصور تھا ذہن میں؟

آئیڈیل وائیڈیل کے چکر ہمارے ہاں نہیں تھے بس یہی دیکھنا چاہتی تھی کہ نیک شریف گھر والا اور گھر والے ملیں اس وقت بچیاں گھر میں تو آزاد تھیں ذہنی طور پر بھی روشن خیال تھیں مگر یہ جو فلرٹ کا رواج، لو میرج کا رواج، نیٹ ویڈنگ کا رواج، موبائل فرینڈ شپ کا رواج شاذ و نادر ہی تھا۔ پڑھتے پڑھاتے، گڑیوں سے کھیلتے کھلاتے شادی اکثر جلد ہو جایا کرتی تھی۔

س5۔ سسرال والوں کے لیے خیالات منگنی

کتنا عرصہ رہی فون پر بات یا ملاقات؟

سسرال والوں کے لیے نیک جذبات، نیک خیالات نیک پروین بچیوں کے ہوا کرتے ہیں سو سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔

منگنی ہوئی دو سال منگنی رہی فون شون کا کوئی چکر نہیں تھا تو پھر ملاقات کا چکر کیسے ہوتا ہمارا رہن سہن کھلا ضرور تھا مگر یہ کام ہمارے آباؤ اجداد میں سخت بندشیں رکھتے تھے کنزرویٹو فیملی اس معاملے میں بن جایا کرتی تھی بھئی یہی اچھی بات تھی۔

س6: شادی کے لیے کس چیز کی قربانی دی؟

میٹرک پنڈی سے کیا قرآن پاک ترجمے کے ساتھ پڑھا۔ راولپنڈی چک لالہ گورنمنٹ اسکول سے کیا کیونکہ میرے والد محمد شفیق کی گاؤں گاؤں تقرری دو، تین سال بعد ہونے لگی اور میرے ننھے دو بھائی والد والدہ کے ساتھ گھومتے رہے، میں بڑی تھی مجھے پنڈی چچی + خالہ یعنی میری بہن کے ساتھ رہنے کا پانچ سال میٹرک تک موقع ملا۔

قربانی شربانی بھی کوئی نہ دینی پڑی، راستے قدرت نے ہمیشہ صاف دیئے کیونکہ سب گواہی دیتے ہیں آج بھی کہ فوزیہ بہت ہی بھولی بھالی لڑکی اور خاتون بنی۔ چغلیوں سے پاک صاف۔ میری بیٹیاں البتہ مجھ پر کم گئیں۔ میرے شوہر کی بہن نہیں تھی اور ہمارے گھر بیٹا نہ ہوا ماشاء اللہ سات بچیاں ہوئیں۔

س7: شادی بخیر وخوبی انجام پائی؟

بخیر وخوبی انجام پائی شادی میرے والدین نے اکلوتی ہونے کی بنا پر ٹرک بھر کے جہیز دیا، سونے کے جڑاؤ ہار، چوڑیاں، کنگن، شوہر بہت قابل پڑھے لکھے، ایماندار، محنتی اور زور بازو پر بھروسہ کرکے اللہ پر توکل کرنے والے محبت کرنے والے ساتھی تھے۔ چھٹی بیٹی کی پیدائش پر وہ ماشاء اللہ پرنسپل آف کامرس کالج شکر گڑھ بنے پھر ڈسکہ اور پھر لاسٹ میں سیالکوٹ کینٹ، دوران سروس ستاون سال کی عمر میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

چار بچیوں کی شادی کر گئے پانچویں کی میں نے کی، چھٹی انگیج ہے ساتویں بی اے کے ایگزام دینے والی ہے یوں میری منزلیں مکمل ہونے کو ہیں۔ گوجرانوالہ ماڈل ٹاؤن ہماری سکونت رہی دونوں بہنیں ماں بھی اور ہم بھی یعنی میری خالہ بھی اکلوتی تھی بہن بھی اکلوتی اسی شہر سے رخصت ہوئے وہ لالہ موسی میں سیالکوٹ اور گھر خالی۔

ساڈھا چڑیاں دا چنبھا اے بابل اساں اڈ جانا
ساڈی لمبی اڈاری اے بابل اساں فر نئیں اونا

س8: شادی کے بعد شوہر نے دیکھ کیا کہا؟

الحمدللہ کیونکہ انہوں نے داتا دربار لاہور منت مانگی تھی شادی ہو جائے اور باقی یہ بتانے کی باتیں تھوڑے ہوتی ہیں۔

س9: سسرال میں وہ مقام ملا جو حق تھا؟

کوئی خاص نہیں میرے شوہر نے الحمدللہ میرا بڑا مان رکھا، خیال رکھا، چاہا۔ چھ ماہ بعد ٹرانسفر ہوئی میرے میاں صاحب مجھے راولپنڈی لے گئے وہیں رہے 1974ء کے صرف چھ ماہ سسرال سیالکوٹ رہی، 1977ء تک پنڈی قیام رہا پھر 1977ء میں سیالکوٹ قلعہ آ گئے، وہیں گورنمنٹ کالج میں کوارٹروں میں زندگی کے قیمتی مہ و سال 1986ء تک گزار دیے تبدیلیاں اس لیے نہیں آئیں اپنا ماحول اپنا شوہر وقت گھر سجانا سنوارنا 1975، 76، 77 میں تین بیٹیاں، گھر میں زندگی، سسرال بہت پیچھے رہ گیا میں الگ رہی۔ اپنی خوب صورت فیملی کے ساتھ، دور کے ڈھول سہانے ہو گئے

سسرال والے ماضی ہو گئے۔ مگر میل ملاقات جاری رہے آنے جانے تہواروں پہ اور مختلف مواقعوں پر سلسلے جاری رہے۔

س 10: کھانوں میں فرق؟

ہم بٹ لوگ تھے ہمارے ہاں سب کچھ کھایا پکایا کھلایا جاتا تھا اور ہے۔

س 11: سسرال میں تنقید و تعریف؟

سسرال میں تنقید کسی نہ کسی ذریعے سے ہو ہی جاتی ہے۔ اگر ساس سسر اچھے نہ ہوں تب اور بقایا شریکہ برادری والے، رشتے جیٹھانی، دیورانی، نند، نندوئی وغیرہ مگر میرے ساس سسر اچھے تھے، جیٹھانی نامہ تو آپ کو سنا چکی ہوں اور گڈ لک پابیڈ لک میری تمام دیورانیاں، جیٹھانیاں آپس میں بہنیں ہی تھیں۔ دو+ دو+ دو ایک جیٹھ کی مسز فوت ہوئیں تو انہوں نے دوسری بہن سے شادی کر لی، وہ حیات ہیں بقایا تمام دو، دو ویسے ہی آئیں اور میں اکیلی تھی سو ملنے ملنے میں وہ بات نہیں رہی کچھ رشتے میں گڑبڑ پیدا کی گئی تھی سو تنقید کرنا ان کا حق تھا۔

ان کا جلنا، حسد کرنا آج تک برقرار رہا میرے دور رہنے پر بھی۔ اور میری بیٹیوں کو بھی اسی بناء پر خاندان میں نہ جگہ ملی سب باہر ہی گئیں اور خوش باش ہیں۔ پھر اللہ کا حکم بھی مان لیا، تعریف صرف اور صرف ساس سسر اور شوہر نے کی۔

س 12: شوہر سے تعلقات؟

مقام، حق، رائے، سب کچھ شوہر تھے وہ ہی اتنے ذہین، فطین، قابل تھے کہ میں نے ان کے تمام حکم مانے، اپنی مرضی نہیں جتائی اس لیے مجھے قدرتی سب حق ملے وہ بہت مضبوط شخصیت کے مالک تھے زندہ دل انسان تھے سب کو اپنی جگہ پر رکھنے والے اس لیے کہ وہ ہی میرے آگے رہے مجھے سپورٹ کرتے رہے۔

میرے لیے امتحان بہت کم لکھے میرے رب کریم نے مجھے سوز نگیاں بھی ملیں تو شکر کے لیے کم ہیں۔ میری ماں کو لوگ صابرہ، شاکرہ، عابدہ کہتے ہیں ان کی قبر پر لکھا ہے اور میرے اندر یہ تمام کوالٹیز الحمد للہ بغیر کسی تکبر کے اللہ پاک نے ڈالی ہوئی ہیں۔ لوگوں کی پلس میری بیٹیوں کی رائے ہے کہ امی نرم مزاج جلد معاف کرنے والی، نہ لڑنے والی، نہ چغلیاں کرنے والی اور سسرال میں گونگی گائے مشہور تھیں اور ہیں۔ لوگ راہ چلتے میرے لیے دعائیں کرتے، کراتے، رشتے کرواتے ہیں۔

خوش قسمتی کے تارے سات بیٹیوں کی صورت میں میرے آنگن میں چمکتے دمکتے جگمگاتے ہیں۔ ان کی بھی اولادیں ہیں تمام داماد سوائے دو کے فارن کنٹریز میں ہیں سب خوش باش ہیں الحمد للہ۔ دو بچیوں کی البتہ اولاد اللہ کے پاس چلی گئی ہے وہ دونوں ابھی اس نعمت سے محروم ہیں اسی طرح زندگی کا سفر جاری ساری ہے۔ خود بی پی، شوگر کی مریض بھی ہوں (دعائے صحت کی طالب) مگر الحمد اللہ خوش، مطمئن ہوں۔

س 13: جوائنٹ فیملی سسٹم یا یا علیحدہ؟

علیحدہ رہنا پسند کرتی ہوں کیونکہ جھگڑے ہوتے ہیں مجھے تو بیٹھ جیٹھانیوں کا ان کے رویوں کا سامنا کرنا پڑا پھر میرے شوہر بھی اور سسر بھی مجھے الگ رکھنے پر مجبور ہوئے ورنہ آپ سوچیے سات بیٹیاں ہوں اور سسر جوائنٹ فیملی سے بنے کو الگ رہنے کا مشورہ دیں، باقی سب اکٹھے رہیں کیونکہ اپنا اپنا غیر غیر، وہ سب آپس میں دو دو بہنیں ہونے کی بنا پر گھر جو آبائی تھا۔ وہاں بھی حصہ دار بنیں اور ایک دوسرے کو سپورٹ کیا جس جس نے حصے لیے اس نے اپنی اپنی بہن کو رہنے کے لیے مکان اور سامان دونوں دیے، خانہ بدوشی ہمارے حصے میں آئی لیکن تعلقات، اخلاق سفر کی یادیں، لوگ سب بہت پیار کرنے والے ملے زندگی کے طویل سفر میں اگر گھر سے نہ نکلتے تو پھر یہ محبتیں کیسے نثار کر کے آپ کو بتاتی اس لیے جو ہوا سو ہوا اور بہت بہتر ہوا۔

☆☆

دستک دستک دستک

شاہین رشید

یمنیٰ زیدی

''کیا حال ہیں؟''

''اللہ کا شکر ہے۔''

''بہت وقت ہو گیا تم سے بات کیے ہوئے۔ بہت زیادہ مشہور ہو گئی ہوں۔ اس لیے؟''

''نہیں نہیں، ایسی بات نہیں۔ بس کچھ ایسا خاص ہے نہیں بتانے کے لیے..... اور آپ کو پتا ہے کہ میں ہمیشہ ان ایزی ہوتی ہوں انٹرویو دینے کے لیے۔''

''فلم نایاب میں آپ کا انتخاب کیسے ہوا؟''

''نایاب میری پہلی فلم ہے اور جب مجھے اس میں کام کرنے کی آفر آئی تو میں نے کہا کہ پہلے اس کی کہانی سنوں گی۔ کیونکہ آپ کو پتا ہے کہ جب بندے کو تھوڑی شہرت مل جاتی ہے تو پھر ایسے فلم کی آفرز آنی شروع ہو جاتی ہیں۔ سو مجھے بھی آئی تھیں۔ اور اسی طرح ''نایاب'' کی بھی آئی۔ میں نے اس کی کہانی سنی تو مجھے اچھی لگی۔ سو ہاں کر دی۔''

اس فلم میں فیملی ریلیشن شپ کو بہت اہمیت دی گئی ہے اور جب وہ گھر والوں سے کر کٹر بننے کے لیے کہتی ہے تو ظاہر ہے کہ گھر والے خوش نہیں ہوتے..... کہ کیوں کھیل رہی ہو، تمہاری شادی نہیں ہوگی۔ عمر نکل جائے گی وغیرہ وغیرہ۔ مگر پھر وہ لڑکی اپنے خوابوں کو کس طرح پورا کرتی ہے یہ اس کی بنیادی کہانی یا میرا کردار تھا۔ تو بس اسی لیے میں نے اس کردار کو کرنا قبول کیا۔''

''کر کٹر بننے میں مشکل ہوئی اور سلور اسکرین کا نشہ تھا تم پر؟''

''کر کٹر بننے میں تھوڑی مشکلات ہوئیں اور میں نے پریکٹس بھی بہت بہت کی، اللہ کا شکر ہے کہ سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔ اور آپ نے بالکل ٹھیک کہا کہ سلور اسکرین کا اپنا ہی نشہ ہوتا ہے اور میں تو چاہتی بھی یہی تھی کہ ایسا کردار کروں جو سلور اسکرین پر اچھا لگے۔''

''محنت تو بہت کی ہوگی۔ صلہ ملا؟''

''جی محنت تو بہت کی، الحمد للہ صلہ بھی ملا اور بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ہم بہت محنت کرتے ہیں مگر صلہ نہیں ملتا اور بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ہم اتنی محنت بھی نہیں کرتے اور صلہ اچھا مل جاتا ہے۔''

''مطلب یہ تمہارا تجربہ ہے؟''

''جی بالکل، میرا تجربہ ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں اداکاری کی فیلڈ میں نہیں تھی تو میں نے مختلف جگہوں پر جاب کی۔ جاب میرے لیے ضروری نہیں تھی۔ بس میرا شوق تھا۔ تو مجھے یہ بھی یاد ہے کہ میری فیملی کہتی تھی کہ تمہیں جاب کی کیا ضرورت ہے جتنی تم محنت کرتی ہو، اتنا تمہیں صلہ نہیں ملتا۔ تو میں

ان سے کہتی تھی کہ اگر محنت زیادہ ہے اور آؤٹ پٹ کم ہے تو کوئی بات نہیں۔ یہ مت دیکھا کریں کہ اس میں محنت ہے اور پیسہ کم ہے کیونکہ بہت سی جگہیں ایسی ہوتی ہیں جہاں محنت کم ہوتی ہے مگر پیسہ زیادہ ہوتا ہے تو کم محنت پر زیادہ پیسہ اسی محنت کا ثمر ہوتا ہے جو ہمیں زیادہ محنت پر کم معاوضہ ملتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ہمیں ہماری محنت کا صلہ کسی نہ کسی طور پر دے ہی دیتا ہے۔ میری بات سمجھ میں آ گئی آپ کے۔"

"جب اداکاری کا آغاز کیا تو نروس تھیں؟"

"بہت نروس تھی اور جب پہلا پروجیکٹ کیا تو مجھے لگا کہ نہ صرف سب میری طرف دیکھ رہے ہیں بلکہ باتیں بھی میری ہی کر رہے ہیں۔ خیر شروع شروع میں تو مشکل ہوتی ہے۔ پھر بندہ سیٹ ہو جاتا ہے۔"

"سنا ہے کہ "تیرے بن" کا پارٹ ٹو آ رہا ہے؟ کیا امیدیں ہیں؟"

"جی..... میں نے بھی سنا ہی ہے۔ امیدیں تو اچھی ہی ہونی چاہئیں۔ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔"

"یمنیٰ! میں نے دیکھا ہے کہ تمہارے ڈراموں میں کہ تم بہت سادی سی دکھائی دیتی ہو۔ نہ بہت زیادہ میک اپ نہ فیشن ایبل لباس، بس سیدھی سادی معصوم سی لڑکی؟"

"ہاہاہا..... سچ بتاؤں میں عام زندگی میں بھی گلیمرس نہیں ہوں۔ آپ یقین کریں فلم نایاب میں میں نے نہ بالوں میں وگ لگائی اور نہ ہی ہیوی میک اپ کیا بس اتنا ہی کیا جتنا کیمرے کی ڈیمانڈ تھی اور نہ ہی کوئی بہت اعلا لباس پہنا اور ایک ایک لمحے کو ایک ایک سین کو میں نے انجوائے کیا۔ نئی اسکرین نئی ڈائریکشن۔ مزہ آیا بہت زیادہ۔"

"یمنیٰ تم ہر کردار میں کامیاب ہوتی ہو۔ لک ہے؟ یا کام ہے؟"

"سچ بتاؤں..... ہماری ایک بہت ہی پیاری آرٹسٹ نے کہا کہ یمنیٰ زیدی اس لحاظ سے بہت لکی ہے کہ اسے ہمیشہ اچھے کردار مل جاتے ہیں۔ بات ٹھیک ہے کہ میں لکی ہوں مگر اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ میں محنت بھی بہت کرتی ہوں۔"

"کردار لیتے وقت کیا سوچتی ہو؟"

"کچھ نہیں کہانی سنتی ہوں یا پڑھتی ہوں۔ میرے دل کو کہانی پسند آ جائے تو "یس" مجھے اس سے غرض نہیں ہوتی کہ میک اپ ہلکا تو نہیں ہو گا کپڑے ایسے ویسے تو نہیں ہوں گے۔ بس میرا رول اچھا ہو۔ چیلنجنگ ہو اور مجھے کرنے میں مزہ آیا۔"

"تمہیں پتا ہے، تم لوگوں کی کتنی پسندیدہ آرٹسٹ ہو؟"

"جی..... جی مجھے پتا ہے۔ سوشل میڈیا میں محبت کرنے والے پرستاروں کے کمنٹس پڑھتی رہتی ہوں..... اور سچ میں میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنے پیار بھرے کمنٹس کا کیا جواب دوں۔ بس شکریہ ادا کر سکتی ہوں۔"

"اب تک کتنے سیریلز کر چکی ہو؟"

"یہ تو بالکل بھی یاد نہیں۔ کچھ کے نام یاد ہیں۔ وہ آپ کو بتا دیتی ہوں۔ جیسے "تیرے بن۔ پیار کے صدقے۔ بخت آور۔ ڈری جانی ہے۔ پری زاد" جو بہت ہی مقبول ہوا تھا۔ "عشق لا" بھی بہت پسند کیا گیا تھا۔"

"اور تم کیا کہو گی کون سا بہترین تھا؟"

"یہ تو بہت ہی مشکل سوال ہے۔ مجھے تو وہ ہی بہترین لگتا ہے جو ناظرین کو پسند آ جائے۔ ہاں "بخت آور" کا رول ذرا مشکل تھا۔ کبھی لڑکے کا روپ تو کبھی لڑکی کا روپ بہت احتیاط سے چلنا پڑتا تھا کہ کہیں گڑبڑ نہ ہو جائے۔"

"چلو..... خوش رہو شکریہ، تم نے مجھے وقت دیا۔"

☆☆

سائرہ یوسف سے ملاقات

شاہین رشید

سائرہ یوسف اپنے کام کے حوالے سے ایک جانا پہچانا نام ہے۔ بہترین اداکارہ، بہترین ماڈل اور ماضی کی بہترین وی جے آج کل ڈراموں میں تو نظر نہیں آرہیں۔ البتہ کمرشلز میں آپ انہیں دیکھ رہے ہوں گے۔"

"کیسے مزاج ہیں؟"

"الحمدللہ۔"

"کیا مصروفیات ہیں؟"

"مصروفیات کا نہ پوچھیں، ڈھیروں ڈھیر ہیں۔"

"آج کل ڈراموں میں کم اور کمرشلز میں زیادہ نظر آرہی ہیں وجہ؟"

"کوئی خاص وجہ نہیں میں، ایک کمپنی کی برانڈ ایمبیسڈر بھی ہوں۔ مجھ پر میری بیٹی کی ذمہ داری بھی ہے بے شک اس کو چاہنے والے بہت ہیں مگر پھر بھی..... اور کمرشل میں ٹائم کم لگتا ہے تو بس اس لیے ڈراموں میں کم اور کمرشلز میں زیادہ نظر آتی ہوں۔"

"آپ کی بہنیں بھی تو اس فیلڈ میں ہیں۔ کام کررہی ہیں؟"

"جی وہ اپنے گھروں میں خوش ہیں اپنے بچوں کے ساتھ۔ شوبز سے تھوڑی دور ہیں۔"

"بہت عرصہ ہوگیا آپ کا انٹرویو نہیں کیا۔ تو لوگ آپ کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں؟"

"جی ضرور..... میں 20 اپریل 1988ء میں اس دنیا میں آئی۔ ہمارا تعلق افغانستان سے ہے۔ امی ہماری افغانستان میں پیدا ہوئیں جبکہ ابو ہمارے کوئٹہ میں..... لیکن ابو کے آباؤ اجداد کا تعلق بھی افغانستان سے ہے۔ ہم چار بہنیں ہیں۔ میرا نمبر تیسرا ہے۔ اور میں نے "اے لیول" کیا ہوا ہے۔ اے لیول کے بعد ہی اس فیلڈ میں آگئی۔"

"آپ کا نمبر تیسرا ہے اور سنا ہے کہ جو تیسرے نمبر کی اولاد ہوتی ہے وہ بے چاری نہ تین میں نہ تیرا میں ہوتی ہے۔ ایسا ہے؟"

"ہاہاہا..... بالکل ٹھیک کہا آپ نے..... اصل میں ماں باپ کا سارا فوکس پہلے بچے پر اور پھر آخری بچے پر ہوتا ہے تو پھر جو درمیان میں ہوتے ہیں وہ بے چارے تو بس ایسے ہی ہوتے ہیں۔"

"آپ کتنی بہنیں اور بھائی ہیں؟"

"ہم لوگ چار بہنیں ہیں اور بھائی کوئی نہیں ہے۔ تو مجھے بھائی کی کمی بہت محسوس ہوتی تھی۔ اور لوگوں کا بھی یہی کہنا ہے کہ بھائی ضرور ہونا چاہیے کہ بہنیں کنٹرول میں رہتی ہیں۔"

"کیا واقعی بہنیں کنٹرول میں رہتی ہیں؟"

"مجھے نہیں پتا..... اور میرا نہیں خیال کہ ایسا ہوتا ہوگا کیونکہ والدین کی تربیت اچھی ہو تو لڑکیاں بگڑتی

pklibrary.com

نہیں اور تربیت اچھی نہ ہو تو لڑکے لڑکیاں دونوں ہی بگڑ جاتے ہیں۔ تو اللہ کا شکر ہے کہ ہمارے والدین نے ہماری بہت اچھی تربیت کی ہے۔ ہاں بھائی کی کمی محسوس ہونا اور بات ہے۔ محفل میں جب لڑکیاں اپنے بھائیوں کی باتیں کرتی ہیں۔ ان کی محبت کی خیال رکھنے کی بات کرتی ہیں تو مجھے ان پر رشک آتا ہے۔"

"فیلڈ میں کیسے آئیں؟ پہلا ڈرامہ کون سا تھا؟ کس نے حوصلہ افزائی کی اور کس نے حوصلہ شکنی؟"

"فیلڈ میں آنے کی کہانی بھی کچھ یوں ہے کہ جب علیشبہ چھوٹی تھی تو اسے ٹی وی میں کام کرنے کی آفر آئی۔ ابو تو اس بات کو بالکل بھی پسند نہیں کرتے تھے کہ ان کی بیٹیاں شوبز میں آئیں۔ چنانچہ جب بہن کو آفر ہوئی جبکہ وہ چھوٹی تھی تو ابو نے مخالفت کی۔ لیکن جن لوگوں نے آفر دی تھی۔ انہوں نے میری دادی سے بات کی اور انہیں کنوینس کیا کہ اس فیلڈ میں آنے کے کیا فائدے ہیں۔ پھر دادی نے ابو کو کنوینس کیا..... تو ابو مان گئے۔ یوں علشبہ کی شوبز میں انٹری ہوگئی۔

اس کے بعد ہم لوگ پشاور چلے گئے۔ تین سال کے بعد کراچی آئے تو آتے ہی علشبہ کو پھر آفر ہوئی۔ تب میں بھی اس کے ساتھ چلی گئی۔ علشبہ کا آڈیشن تھا۔ جب وہ آڈیشن سے فارغ ہوئی تو مجھے کہا گیا۔ مگر میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ لہٰذا میں نے منع کر دیا۔ مگر وہاں موجود لوگوں نے یونہی مجھ سے ایکٹنگ کروائی اور..... جو میں نے کرلی۔ پھر کہا گیا کہ آپ تو اچھی ایکٹنگ کر لیتی ہیں تو میں حیران رہ گئی کہ اچھا تو یہ ہو رہا تھا۔ خیر پھر مجھے ایک پروجیکٹ کی آفر آ گئی۔ جسے میں نے قبول کرلیا۔ پھر اسی پروجیکٹ نے مجھے شہرت بھی دے دی اور مزید راستے بھی ہموار کر دیے۔

میرا پہلا پروجیکٹ ڈرامہ سیریل "میرا نصیب" تھا جو کہ بہت ہی زیادہ مقبول ہوا تھا۔ یہ بات میں ڈرامے کی کر رہی ہوں۔ ویسے مجھے پہلی بار ایک کمرشل ملا تھا جو کہ آئس کریم کا تھا اور میری قسمت کہ یہ کمرشل بھی بہت پسند کیا گیا۔"

"ٹیلنٹ اور قسمت دونوں ہی آپ کو اس فیلڈ میں لانا چاہتے تھے؟"

"بالکل ٹھیک کہا آپ نے ......اور آپ کو بتاؤں کہ نہ صرف کے کے بعد دیگر کمرشلز ملتے گئے بلکہ مجھے ایک پروگرام کی میزبانی کرنے کی بھی پیش کش ہوئی۔ یعنی مسلسل دو سال کمرشلز کیے..... پھر بطور وی جے ایک پروگرام کی میزبانی بھی کئی سال کی۔ پروگرام کا نام موسٹ وانٹڈ تھا۔

اور میں اس بات کو مانتی ہوں کہ آپ ایک ڈرامہ کریں اور کئی کمرشل کریں شہرت آپ کو ڈرامے سے ہی ملے گی کیونکہ ڈرامہ بہت لوگ دیکھتے ہیں۔"

"اب تک کتنے سیریلز اور فلمیں کر چکی ہیں؟"

"اللہ...... یہ سوال نہ پوچھیں۔ 2011ء سے اس فیلڈ میں ہوں خود سوچیں کہ کتنا کچھ کر لیا ہو گا میں نے۔"

"ہوں...... پتا ہے؟ آپ نے کبھی نیگیٹو رول نہیں کیے۔ وجہ؟ معصوم شکل یا کچھ اور...... کس طرح کے رول کرنے سے انکار کر دیں گی؟"

"پتا نہیں کیا وجہ ہے مگر میں تو نگیٹو رول کرنے کے لیے تیار ہوں۔ واقعی یا تو شکل معصوم ہے بقول آپ کے...... یا پھر ڈائریکٹرز سمجھتے ہیں کہ میں نگیٹو رول کر نہیں سکتی۔ ویسے اگر مجھے بولڈ کردار ملے تو میں کرنے سے انکار کر دوں گی۔ کیونکہ مجھے اچھا نہیں لگے گا کہ میری فیملی مجھے بولڈ کردار میں دیکھے۔

اور بولڈ سے مراد یہ ہے کہ کپڑے ڈیسنٹ ہوں۔ ڈائیلاگ دلگر نہ ہوں۔ اداکاری میں کوئی چھچھوراپن نہ ہو۔ کیونکہ ٹی وی کے لیے کہا جاتا ہے کہ یہ ایک فیملی میڈیا ہے۔ ڈرائنگ روم میڈیا ہے۔"

pklibrary.com

جہاں نیلی کے لوگ بلا جھجک ڈرامہ دیکھ سکیں۔

"کچھ سال پہلے آپ نے ایک ڈرامہ "صنف آہن" کیا تھا اس کے بارے میں کچھ کہیں گی؟"

"میری ڈرامہ ہسٹری میں "صنف آہن" میرا بہترین سیریل تھا اور اس میں ہم نے جو بھی پرفارم کیا خود کیا۔ کسی سے مدد نہیں لی اور سب کچھ ہم نے سیکھا تھا۔ سب سختیاں ہم نے ہی سہیں۔ باقاعدہ ٹریننگ لی تھی اور بہت اچھا لگا تھا۔ فوجی یونیفارم پہن کر تو اپنا آپ بہت اچھا اور پروقار لگا اور سوچا کہ کاش میں بھی حقیقت میں اس کا حصہ ہوتی۔"

"تو آپ حصہ بن تو سکتی تھیں کیونکہ آپ کی ایج کی لڑکیوں کی ہی ٹریننگ دکھائی جارہی تھی؟"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ لیکن میری بیٹی میری ذمہ داری ہے اور وہ میرے بغیر رہ نہیں سکتی جبکہ اس سے سب بہت محبت کرتے ہیں۔"

"اپنے ڈرامے دیکھتی ہیں؟ اور دل چاہتا ہے کہ میں انڈین فنکارہ ہوتی؟"

"انڈین فنکارہ؟ ہرگز نہیں مجھے اپنا ملک بہت پیارا ہے۔ اس کے نام سے میری عزت ہے۔ شہرت ہے اور ہاں میں نے اپنے ڈرامے دیکھے ہیں اور دیکھتی ہوں۔ اب تو کافی ٹائم سے میں نے ڈرامہ نہیں کیا۔"

"انسان جہاں کام کرتا ہے اس جگہ سے پیار ہو جاتا ہے..... اور کوئی برائی نظر نہیں آتی..... شوبز کے بارے میں کیا کہیں گی؟"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں کہ انسان جہاں کام کرتا ہے وہ فیلڈ اچھی لگنے لگتی ہے تو مجھے بھی اپنی فیلڈ سے پیار ہے۔"

"آپ میں شہرت پاکر کوئی تبدیلی آئی؟"

"جب شہرت ملنا شروع ہوئی تھی تب تھوڑا چینج آیا تھا اچھا لگتا تھا۔ مگر اب بات پرانی ہوگئی ہے۔ اور عادت بھی ہوگئی ہے۔ ویسے اچھا تو بہت لگتا ہے۔ لوگ ملتے ہیں، تعریف کرتے ہیں، اچھے انداز میں

بقیہ صفحہ 207 پر

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے 4 خوبصورت ناول

میرے خواب لوٹا دو — نگہت عبداللہ
کسی راستے کی تلاش میں — میمونہ خورشید علی
اُجالوں کی بستی — فاخرہ جبیں
ایک میں اور ایک تم — تنزیلہ ریاض

منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37، اردو بازار، کراچی
فون نمبر: 32735021

رضیہ جمیل

خط آپ کے

خط بھجوانے کے لیے پتا۔
ماہنامہ شعاع۔ 37۔ اردو بازار کراچی۔
Email:shuaa@khawateendigest.com

آپ سب کی پسندیدہ مصنفہ نگہت سیمانے چکوال سے ہماری محفل کو رونق بخشی ہے، لکھتی ہیں

ابھی ابھی ساجدہ حبیب کے متعلق پتا چلا، بہت افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ بہت خوب صورت تحریر کی مالک ایک بہت پیاری لکھاری تھیں۔ ان کی کشمیر پر اور وطن کے حوالے سے لکھی گئی کہانیاں ناقابل فراموش ہیں۔ ان کی کہانی کا آغاز بھی منفرد انداز میں ہوتا تھا۔ وطن سے محبت کا جو جذبہ ان کی کہانیوں سے جھلکتا تھا، اس نے انہیں میرے دل کے بہت قریب کردیا تھا۔

شعاع باقاعدگی سے مل رہا ہے، بہت شکریہ، فلک تنویر اور آسیہ رئیس میرے لیے نئے نام ہیں۔ بہت خوب صورت لکھ رہی ہیں اور اب مجھے فہمیدہ جاوید سے کچھ کہنا ہے۔ بہت شکریہ پیاری میری تحریروں کو پسند کرنے اور انہیں یاد رکھنے کے لیے۔ ایک لکھاری کے لیے اپنے قاری کی پسندیدگی بہت قیمتی ہوتی ہے، میرے لیے آپ کا لکھا گیا ہر لفظ بہت انمول ہے۔ خوش رہیں اور دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

پیاری نگہت! ساجدہ حبیب تو ہم سب کو بہت عزیز تھیں۔ ان کی جدائی سے ہمیں بھی بہت دکھ ہوا ہماری ایک بہت پیاری مصنفہ دنیا سے رخصت ہوگئیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔

صدف ناصر نے گوجرانوالہ سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

ماہ فروری کا "شعاع" نئی اور پیاری سی ماڈل کے ساتھ اچھا لگا۔ کیونکہ بچوں کے شاندار رزلٹس کی وجہ سے ویسے ہی سب کچھ اچھا اچھا ہی لگ رہا ہے۔ زیادہ خوشی اس بات کی ہے کہ "پارہ رزلٹ" میں بچوں نے فل مارکس سے کامیابیاں حاصل کیں۔ الحمدللہ!

"پہلی شعاع" سے سو فیصد متفق تو ہیں "پیاری بہن" مگر اداسی اس بات سے ہے کہ یہ سب نفرتوں، محبتوں، اعتدال اور کدورتوں کی باتیں کیا صرف آپ کے اور ہمارے لیے ہیں، دوسروں پر نہ تو ہماری اچھائیاں اثر انداز ہوتی ہیں نہ ہی ان کے اپنے دلوں سے کوئی اچھائی نکل رہی ہے۔

"حمد" اور "نعت" سے اداس دل کو "شاد" کرلیا کیونکہ ہمیں اللہ ہی کافی ہے۔

"پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں" حسب روایت پیاری لگیں۔ "جنتی عورت" اور "قابل رشک مومن" نے بے حد متاثر کیا۔

"ناتا جوڑا" تقریباً دونوں بہنوں نے عجز وانکساری کے بل بوتے پر اپنی اور دوسروں کی زندگیوں کو پرسکون بنادیا۔ "شگفتہ بھٹی" سے ملاقات سبق آموز رہی۔ اللہ تعالیٰ ان کو شفائے کاملہ عطا فرمائے۔ (آمین)

"خط آپ کے" کی طرف بڑھے۔ آپ کی اتنی محبت اور تعریف سے دل جھوم اٹھا، بے حد شکریہ۔ جزاک اللہ خیرا! عروج عباس، عالیہ ملک، تسنیم کوثر، فہمیدہ جاوید سمیت سب ہی کے تبصرے خاصے مکمل اور شاندار، بس ایک "ناہید اسماعیل" گم ہوگئی ہیں۔

"نئے سال کی دہلیز پر" اس ماہ بھی یہ سلسلہ مزا دے گیا۔ "ریحانہ وقاص" کی بہن کو بریانی کے تین ہزار اور "مزنہ کرن" لوگوں کے پائے خراب ہونے کا صدمہ دل پر محسوس ہوا۔ (ہاہاہا)

مکمل ناول کی بات کریں تو "شہر شام ہجر" نے ہر بار کی طرح دل موہ لیے۔ "شہناز" اور "ارحم" کے لیے بھی

کہہ سکتے ہیں کہ "آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا"۔

"ماء الملوک" نگہت سیما کی شان دار تحریر۔ "زل" اور "آزین" کی جوڑی بہت اچھی ہے، حویلی کی رونق اور شادی عنقریب خاصا انجوائے کروائے گی۔

"حبس کے موسم" "نعیمہ ناز" کی ایک اور شاہکار تحریر۔ بیک وقت دو دو محاذوں پر نبرد آزما یہ تحریر اسرائیل و فلسطین کے مسائل اور اقدامات کو بیان کرتی ہمیں ذاتی و معاشرتی مسائل پر بھی آنکھیں کھولنے پر مجبور کر گئی۔

ہاں "نعیمہ" سے ایک شکایت ہے کہ یہ اچھے خاصے ناول کو اینڈ پر جا کر کافی عجلت میں سمیٹ دیتی ہیں تحریر اور کردار مبہم انداز میں اختتام پذیر ہو جاتے ہیں۔

"ناولٹ" میں "صاحبی انجمن" کے نام نے کوفت زدہ کر دیا۔ پہلی دفعہ سنا اور پڑھا۔ مطلب سے بالکل نابلد رہے۔ پلاٹ بھی پرانا بالکل متاثر نہیں کر پایا۔ ویری سوری پلیز۔ "عمرین ابدال" نے دنیا کی "رنگ بازی" لوگوں کی اصلیت اچھے طریقے سے بے نقاب کی "عتیقہ بیگم" نے تو دھوکے بازی اور شاطر پن کی ہر حد ہی پار کر ڈالی۔ الامان الحفیظ! پورے بیس تولے سونا حق مہر میں لکھ کر بعد میں فوراً ہی معاف کروا ڈالا۔

"ماورا" کی بہادری کو سلام پیش کریں گے، جس نے سر محفل بھگو بھگو کر ماریں سب کو۔ ایسی نئے ٹاپک پر تحریریں ہر ماہ ہونی چاہئیں۔

"افسانے" "تمام تحریروں کے بعد ڈر ڈر کر پڑھتی ہوں کہ اس کے بعد رسالہ ختم ہو جاتا ہے۔ تو کنجوسوں کی طرح پڑھنا پڑتے ہیں۔ (ہاہاہا)

"راشدہ رفعت" باز آ جائیں آپ، ناول لکھنے کے بجائے افسانہ لکھ دیتی ہیں۔ اور لکھا بھی تقریباً ہر لڑکی کی زندگی پر ہے، مالٹے رات کے وقت بھی آ جائیں تو بس نہیں چلتا کہ ابھی دھوپ نکلے اور مالٹے کھائے جائیں۔ بہرحال تحریر خاصی سبق آموز ہے۔ پکی پکائی تو کسی کو نہیں ملتی۔ اگلے گھر جاتے ہی، گرم دوپہروں جیسے گرم رویے برداشت کر کے ہی نرم دھوپ اور میٹھے لہجے نصیب ہوتے ہیں۔

"فائقہ رابعہ" کے "ادھورے خواب" نے ہنسایا بھی اور سمجھایا بھی کہ بن بلائے نہیں جاتے کسی کے گھر۔ (ہاہاہا) حالانکہ "بھلے زمانوں" میں تو پورا پورا گھرانہ اٹھ کر چلا جاتا تھا، دنوں مہمان نوازی سے لطف اٹھایا جاتا، میزبانوں کے ماتھے پر شکن تک نہیں آتی تھی، اب تو ہمیں پتا چل جائے کہ کوئی تشریف لانے لگا ہے۔ فوراً آنکھیں ماتھے پر۔ "فرزانہ چیمہ" کی "عذرا" سے ملے۔

"بات کا بتنگڑ" نہ بنائیں، یہ "ملیا سمون" نے ہمیں بتایا۔ شادی شدہ لڑکیاں بھی تو ہوش کے ناخن لیں بھئی منٹ منٹ کی رپورٹ سسرال کی دے کر نہ اپنی زندگی خراب نہ کریں نہ میکے والوں کو پریشان کریں۔

"الفاظ اور جملے" عنوان سے اسکول لائف کا اردو کا پریڈ یاد آ گیا۔ (ہاہاہا) بہر کیف "لبنیٰ آصف" کا بہت دلچسپ اور اچھا افسانہ ہے۔

"محبت کا سنی آنچل" ہماری قاری بہن "عارفہ فضل شاہ" کا بہترین اور مزے کا افسانہ "حبیبہ" کی رائٹر بننے کی کاوشیں اچھی لگیں۔ ورنہ میرے جیسے لوگ بھی ہیں، جو دو افسانے بھیج کر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے۔ (ہاہاہا)

"عمیر" اور "سویرا" کی شرارتوں نے مزا دیا۔

"مستقل سلسلوں" کی طرف بڑھے تو "منور رانا" کی غزل بے حد بھائی۔

"باتوں سے خوشبو" کا ہر لفظ ذہن نشین کر لیا۔ بالخصوص "سادگی" نے بہت متاثر کیا۔ کہاں عظیم لوگوں کی سادگیاں اور کہاں ہماری قوم کے "برانڈز" اللہ اللہ! "مسکراہٹیں" مزے کی ہیں۔ "افتخار عارف" اور "جوش صاحب" کی "زبان دانی" نے خوب ہنسایا سب کو۔ "کھلتا کسی پر کیوں" کل اٹھارہ اشعار میں سے بس "افضل ناصر" کا انتخاب اچھا لگا۔ جبکہ ماہ جنوری میں بھی اشعار زبردست رہے تھے۔

"تاریخ کے جھروکے" اس ماہ "جوزفین بونا پارٹ" کی تاریخ دہرا رہا ہے۔ اور افسوس! وفا اور محبت کے معاملے میں نپولین انتہائی بدقسمت رہا۔ "موسم کے پکوان" کچھ تو سر پر گزر گئے کچھ اچھے لگے۔ (ہاہاہا) مطلب ففٹی ففٹی رہے۔

پیاری صدف! بچوں کی امتحان میں اچھے نمبروں سے کامیابی پر مبارک باد۔ بلاشبہ ایک ماں کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی خوشی نہیں ہو سکتی۔

pklibrary.com

آپ نے لکھا ہے کہ محبتوں اور اعتدال کی باتیں ہمارے اور آپ کے لیے ہیں تو پیاری بہن! ہمیں دوسروں کی باتوں سے کیا لینا۔ ہر شخص اپنے عمل کے خود ہی جوابدہ ہے۔ جھوٹ، غیبت پھیلانا انتہائی قبیح فعل ہے۔ اور جو لوگ یہ کر رہے ہیں، وہ اپنا انجام بھول گئے ہیں۔ اس دنیا کی عدالت میں بچ بھی جائیں تو ایک دن اللہ کے حضور تو جانا ہے۔ جہاں پر جھوٹ سچ کا حساب دینا ہوگا۔

ناہید اسماعیل نے ایک ناولٹ بھجوایا تھا جو شائع ہو گیا لیکن وہ اپنا ایڈریس اور فون نمبر لکھنا بھول گئیں۔ اب پریشان ہیں کہ مزید لکھوانے کے لیے رابطہ کیسے کریں۔

فائزہ رابعہ نے مہمانوں کو بن بلائے آنے سے منع نہیں کیا، اطلاع دے کر آنے کے لیے کہا ہے۔ اس لیے کہ اگر بغیر اطلاع کے کسی کے گھر پہنچ جائیں تو ممکن ہے کہ وہ گھر پر نہ ملے۔ کہیں گیا ہوا، ویسے بھی اب فون کی سہولت ہے۔ تو آسانی سے بھی کسی کے گھر جا سکتے ہیں۔

ثمین منہاس گاؤں دھریالہ جالب ضلع جہلم سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

پچھلے دو سال سے آپ کا ماہنامہ شعاع پڑھتی ہوں میں آج بہت سے لوگوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔ جن کی وجہ سے میں اپنی زندگی میں واپس آئی اور جن کی وجہ سے میری بے مقصد زندگی کو جینے کا مقصد ملا۔ اس کے علاوہ میں "طاہر فراز" صاحب کی بہت شکر گزار ہوں۔ جن کی غزلیں اکثر پڑھنے کو ملی ہیں۔ اندر کا شاعری کا شوق پھر سے زندہ ہو گیا ہے پہلے اپنی دل جوئی کے لیے لکھتی تھی اس بار میں نے سوچا کہ کیوں نہ شعاع کے لیے لکھا جائے یہ سوچا کہ اپنے فن کو ضائع کیوں کریں اس لیے ایک غزل لکھی ہے۔

حالت نواب کی سی ہے
آنکھیں شراب کی سی ہے
آپ کی باتیں گلاب کی سی ہیں
مگر
شعاع سے دوستی ہر سوال کے جواب کی سی ہے

پیاری ثمین آپ شعاع باقاعدگی سے پڑھتی ہیں۔ یہ جان کر بہت خوشی ہوئی۔ آپ کو شاعری کا شوق ہے، بہت اچھی بات ہے لیکن ہمارا مشورہ یہ ہے ابھی آپ شاعری کرنے کے بجائے اچھے شاعروں کا کلام پڑھیں۔

عروج یوسف نے کراچی سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

بہت عرصے بعد خط لکھ رہی ہوں۔ میرے سسر (اللہ ان کی مغفرت فرمائے) یعنی پاپا خط پوسٹ کر دیتے تھے۔ دو سال پہلے ان کا انتقال ہو گیا۔ لیکن اس مرتبہ خط لکھے بغیر نہ رہ سکی۔ سب سے پہلے تو شگفتہ بھٹی صاحبہ کی ملاقات (اف یہ موبائل نے ایموجز کا اتنا عادی کر دیا ہے کہ بات ادھوری لگنے لگی ہے اب ان کے بغیر) خیر تو اس ملاقات نے نہ صرف آنکھیں نم کر دیں بلکہ دل کی وہ کیفیت جو بیان نہیں کی جا سکتی۔ اللہ تعالیٰ انہیں مکمل طور پر شفائے کاملہ عاجلہ عطا فرمائے اور ہم سب کو ایسی ناگہانی آفات سے محفوظ رکھے۔ آمین ثم آمین

پھر جو کہانی دل میں گھر کر گئی بہت بہت خوب صورت۔ فلسطین کے مسئلے کو بہت خوب صورتی سے ایک اور اہم مسئلے سے جوڑ کر دونوں کو بہت ہی بہترین انداز سے تراشا گیا۔ "حبس کے موسم" ان شاء اللہ ہمارے فلسطین کے بہادر لوگوں کے حق میں ہی فیصلہ لکھا جائے گا وہ بھی اپنے گھر میں آزادی سے جئیں گے ان شاء اللہ۔

پھر "صاحبی الجن" قید خانے کے ساتھی جسے "صاحبی الجن" پڑھا گیا۔ عشنہ حسین کی تحریر اچھی لگی۔ مگر سب ہنسی خوشی گھر میں رہتے تو کتنی خوشی ہوتی، مگر رائٹرز کی کہانی ان کی مرضی۔ (پھر ہارٹ بریک والا ایموجی یاد آ رہا ہے)

"شام شہر ہجر" فرح بخاری کی کہانی اچھی لگتی ہے بہت سے رشتے سمجھ میں نہیں آتے مگر انداز تحریر بہت سادہ اور اچھا ہے۔ اور شعاع کا ٹائٹل بہت سو بر سالگا اور پھر وہی دوپٹے کی فرمائش۔ اگر ہوتا تو اور بھی شان دار لگتا۔

باقی باتیں ان شاء اللہ پھر کبھی ہو سکے تو دعاؤں میں یاد رکھئے گا کیونکہ شعاع میری پہلی محبت، خواتین دوسری اور کرن تیسری اور آخری اور یہ کتنے سال پرانی محبت ہے بتاؤں۔ تقریباً 34,35 سال ہے۔ اولڈ از گولڈ لہٰذا اس گولڈ کی قدر کیجیے (پھر وہی ہارٹ والا ایموجی) اور ایک اور اسپیشل کہانی عنبرین ابدال کی "رنگ باز" اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح معنوں میں دین کو سمجھنے والا بنا دے ہم سب نے اپنی مرضی کا اسلام بنا رکھا ہے۔ اللہ ہمیں ہدایت دے آمین۔

پیاری عروج! آپ نے ہمیں خط لکھا بہت شکریہ۔ شعاع سے اتنا پرانا تعلق ہے یہ جان کر خوشی ہوئی اور افسوس بھی ہوا کہ اتنا عرصہ ہم آپ کی رائے سے محروم رہے۔ اب ہمیں باقاعدگی سے خط لکھتی رہیے گا۔ اللہ تعالیٰ آپ کے پاپا (سسر) کو ابدی زندگی میں راحت دے۔ جانا تو ہم سب کو ہی ہے کامیاب وہ ہے جس سے رب راضی ہو جائے۔

صاحب الجن سہواً لکھا گیا، کہانی کا نام صاحب البجن تھا۔

انیسہ عائش نے کوٹ رادھا کشن قصور سے لکھا ہے

دم تحریر ہمارے سر پہ امتحانات کے گہرے کالے بادل چھائے ہیں۔ جی ہاں صرف دو دن کی دوری پر ہمارے پیپر ہیں اور ہم بیٹھے آپ کو خط لکھ رہے ہیں۔ خط آپ کے میں آپ کا جواب اور ایچ ایس ایچ کا ردعمل خوش کر گیا۔

سب سے پہلے قسط وار سلسلوں کا رخ کیا۔ شہر شام ہجر آخری قسط آئندہ ماہ پڑھ کر شکر کا کلمہ ادا کیا۔ والعصر کا اختتام افسردہ تھا پھر پہنچے ماہ الملوک پر۔ موسٹ فیورٹ۔ بہت ہی خوب صورت اور تجسس سے بھرپور ناول۔ مرتضیٰ پر بہت غصہ آرہا ہے اور اب شایان بھی شامل ہو گیا ہے دیکھیے اب کیا ہوگا۔ پھر نعیمہ ناز کا حبس کے موسم پڑھا، بہت معلوماتی سبق دیتا ہوا ناول تھا اس میں سارہ کا کردار بہت اچھا لگا۔ رنگ باز جیسے جیسے پڑھتے گئے، مروا کے سسرال والوں کی کنجوسی پر غصہ آتا رہا مگر آخر میں ان کو غلطی کا احساس ہو گیا۔ افسانوں میں سب سے اچھا افسانہ محبت کا سنی آنچل رہا۔ سرما کی دھوپ بہت خوب صورت افسانہ تھا۔ الفاظ اور جملے مزاحیہ انداز میں سبق دے گیا۔ بات کا بتنگڑ میں خضرا کی حماقت کی وجہ سے سب کو شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا۔ عذرا معذرت کے ساتھ ہمیں اچھا نہیں لگا۔ سب سے آخر میں پڑھا صاحب البجن۔ زبردست اور بہترین۔ دونوں بھائیوں کی محبت پر رشک آیا۔ ہمیں گلہ ہے کہ اسے مزید طول دینا چاہیے تھا۔ دستک، مجھ سے ناتا جوڑا اور شگفتہ بھٹی سے ملاقات اچھی رہی۔

پیاری انیسہ! بہت شکریہ آپ نے خط لکھ کر اپنی رائے سے آگاہ کیا۔ آپ کے افسانے مل گئے ہیں۔

عروج عباس نے کراچی سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

فروری کا شعاع اس بار سات کو مل گیا اور پڑھنے کا نمبر اس کا نو فروری کو آیا کہ پہلے ہم خواتین ڈائجسٹ پورا پڑھتے، پھر شعاع کی باری آتی ہے۔ ماڈل کو بلیک اسٹائلش سے سوٹ میں دیکھا تو دماغ نے کہا کہ لگدی لاہور دی اے، سورج کی نرم گرم سی شعاعوں میں بیٹھ کر پہلی شعاع پڑھی، سیدھی دل پہ اثر انداز ہوئی اور اک سکون بھری سانس خارج کی کہ الحمدللہ انا جیسی بیماری سے ہم محفوظ ہیں، ہر چیز کو اعتدال میں رکھا ہے سوائے مطالعے کے شوق کے اور لکھنے کا شوق تو بچپن سے ہی ہے کہانیاں، افسانے نہیں لکھنے کا ایک کزن کے کہنے پہ افسانہ لکھا تھا، معلوم نہیں اس کا کیا ہوا البتہ شاعری کی مشق اکثر کرتی رہتی اور لوگ سراہتے بھی ہیں۔

حمد و نعت پڑھی اور پیاری پیاری باتیں تو ہماری شخصیت کو پیارا بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ بشرطیکہ ہم باعمل ہوں، جب مجھ سے ناتا جوڑا ہے بھی دلچسپ سلسلہ ہے، بہنوں کو دل کی کہنے کا اچھا موقع دیتا ہے۔ لیکن بہنیں اپنا نام لکھنے سے کیوں کتراتی ہیں بہت سی بہنوں کے شوہر کو آپریٹو اور اچھا سسرالی ماحول بھی ہو پھر بھی نام نہیں ہوتے، چلیں فرضی ہی سہی لیکن کوئی نام لکھ دیا کریں حروف تہجی سے یاد ہی نہیں رہتا کہ بس۔ بہن کی باتیں زیادہ پراثر تھیں، یا الف بہن کی اس بار شاہین صاحبہ نے شگفتہ بھٹی سے ملوایا، بھئی ہم تو آپ کے عزم و حوصلے کے فین ہو گئے واقعی عورتوں کو اسی طرح مضبوط ہونا چاہیے اللہ بلیس یو۔

شگفتہ خط آپ کے میں بہت سی بہنیں بلاناغہ لکھتی ہیں، ان کے نام پڑھتے ہی ہم تبصرہ پڑھ لیتے ویسے اب میں بھی بلاناغہ لکھنے والیوں میں شامل ہو چکی ہوں، ہیں نا؟

سب سے پہلے قسط وار میں ماہ الملوک پڑھا اپنی مخصوص رفتار سے، پرت در پرت کھلتا اپنا سحر ہم پہ طاری کر رہا ہے، زل کے بابا شاہ زیب کی شخصیت کافی سسپنس لیے ہوئے ہے، زل اور اختر بانو پر ایک کہاوت یاد آتی ہے کہ ماں بیٹی دو ذات پھوپھی بھتیجی ایک ذات۔

اس بار سحرش کا کردار بھی پڑھ کے اچھا لگا۔ فرح بخاری، شام ہجر میں شہناز کا اپنی بہن سے اس حد تک غافل ہونا اچھا نہیں لگا رضوانہ کے خلاف سازشیں کرتے کرتے اپنی بہن کے ساتھ جانے انجانے میں برا ہونے کی وہی ذمہ دار ہے۔

اس بار شعاع میں بھی ایک ہی مکمل ناول تھا اور بہترین تھا، سارہ کا کردار پسند آیا، کم سے کم اتنی ہمت تو سب میں ہونی چاہیے کہ حق اور باطل میں فرق کر سکیں اور زباں سے اظہار کر سکیں طاہر سرفراز اور صباحت عروج کی غزلیں شان دار تھیں۔ کھلتا کسی پہ کیوں میرے دل کا معاملہ، میں سعدیہ جواد۔ کھاریاں کا شعر زبردست تھا۔ سروے میں چار بہنیں شامل تھیں اور چاروں کی ہی باتیں دلچسپ تھیں، ریحانہ وقاص کی زیادہ دلچسپ لگیں جو انہوں نے شروع میں تمہید باندھی، سعدیہ مصطفیٰ کی نقاب کی عادت اچھی لگی۔ اللہ پاک آپ کو تاحیات استقامت دے اس عادت اور نیکی پہ۔

پیاری عروج: تفصیلی تبصرے کے لیے تہہ دل سے ممنون ہیں آپ نے ہر کہانی پر بہت اچھا اور جامع تبصرہ کیا ہے۔ رائٹنگ بھی بہت اچھی ہے اور خط بھی۔ پڑھ کر دل خوش ہو گیا۔

عارفہ فضل شاہ گاؤں حمید سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

اتنے انتظار کے بعد شمارہ ملتا ہے اور ایک دن میں ختم کر کے پھر اگلے شمارے کا انتظار شروع ہو جاتا ہے۔ وہ دن بہت یاد آتے ہیں جب پیارے ڈائجسٹ کا رنگ زردی مائل اور ڈیل ڈول خوب ہوتا تھا۔ اتنا موٹا ڈائجسٹ کئی افسانوں ناولٹوں اور ناولوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ سلسلوں کے صفحات بھی کئی گنا زیادہ ہوتے تھے۔ پھر وقت گزرا تو رنگت زرد سے سفید ہوگئی اور سائز تھوڑا سا کم ہو گیا۔ اب تو سوکھا پتلا اور رنگت سیاہی مائل۔

اسے بھی غنیمت سمجھتی ہوں کہ شعاع خواتین اور کرن میری واحد تفریح ہیں۔ اگر یہ بھی نہ ہوں تو کیا کروں گی۔ 80 فیصد فیس بکی رائٹرز کی اوور رومانٹک تحریروں سے تو وحشت ہوتی ہے۔ فحاشی کی حد تک چھوجاتی تحریریں۔ ادب جن سے شرمندہ ہے۔ کہاں تک سنو گے کہاں تک سنائیں۔ آتے ہیں پیارے شعاع کی جانب۔ فروری کا شمارہ بہت پسند آیا۔ افسانے سارے پسند آئے۔ حبس کے موسم۔ اجتماعی وانفرادی رویوں کی بھرپور عکاسی کرتا ہوا ناول۔ فلسطین کے دکھ پہ دل روتا ہے۔ صاحب انجمن (قید خانے کے ساتھی) بہت اچھی تحریر تھی۔ عیشہ حسین شاید نئی رائٹر ہیں عنبرین ابدال کا ناولٹ نہیں پڑھ سکی کیونکہ شروع کے صفحات موجود نہیں تھے۔ میں نے اٹیچل کو اردو ادب اور شاعری کی نسبت سے پر مزاج ناول "آسمان سے گری" بھیجا تھا۔ براہ مہربانی رائے دے دیجیے۔

پیاری عارفہ! آپ کی ساری تحریریں موصول ہو چکی ہیں۔ جو قابل اشاعت ہیں، باری آنے پر شائع ہو جائیں گی آسمان سے گری" ابھی پڑھا نہیں گیا۔

پروین وحید ڈھاوڑ نے گاؤں ڈھاوڑ بلوچستان سے لکھا ہے

آپ کے رسالے میری واحد دلچسپی ہیں ہر ماہ باقاعدگی سے پڑھتی ہوں اور دل ہی دل میں تبصرہ بھی کرتی ہوں۔ دل میں اس لیے کہ رسالے تھوڑا سا لیٹ ملتے ہیں ایک دو ماہ سے شعاع ٹائم پر مل رہا ہے اس لیے خط لکھ رہی ہوں۔ میں بلوچستان کے ایک بے انتہا پیارے اور سرسبز شہر ڈھاوڑ میں رہتی ہوں۔ یہاں کا رہن سہن اور طور طریقے بہت ہی پیارے ہیں اور یہاں کے لوگ بھی بہت اچھے ہیں۔

اب آتے ہیں تبصرے کی طرف، اس ماہ کا ٹائٹل دیکھ کر ایک دم مبہوت ہی رہ گئی۔ بڑائی اس رب کی جس نے اتنے سارے چہرے تخلیق کیے۔ اور ڈریس بھی بہت پیارا تھا میرا پیارا کلر بلیک۔ اور سب سے زیادہ ماڈل کے بال حسین تھے۔ مسکراہٹوں میں مسکراہٹ کی کمی تھی۔ حمد اور نعت عمدہ۔ پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں ہمیشہ بہترین سبق اور نصیحت ملتی ہے۔ جب مجھ سے ناتا جوڑا دونوں بہنوں کے تجربے پڑھے زندگی ہر کسی کے لیے ایک ہی پہلو رکھتی ہے۔ بنت ش۔ ب کے لیے دلی افسوس اتنی کم رفاقت۔ اتنے پیارے رشتے کا یوں ساتھ چھوڑ جانا۔ اللہ صبر عطا فرمائے (آمین) شگفتہ بھٹی سے ملاقات ابھی نہیں کی۔ کہانیوں میں سب سے پہلے شہر شام ہجر پڑھا۔ اس قسط میں مومن اور ایلیا کا رول کم لگا۔ گلناز کے ٹھیک ہونے کی تو ہمیں بھی چاہت تھی پر اس طرح اچانک کچھ عجیب سا لگا۔ اور کمال خان کا مرنے کے بعد اس طرح سے بیان کرنا اچھا نہیں لگا اگر زندہ ہوتا تو اور بات تھی۔ فرح کو اب منصب اور وسیلہ کو ملا دینا چاہیے۔

حبس کے موسم نعیمہ ناز نے بہت اچھا لکھا حقیقت کے بہت قریب۔ ہم میں سے اکثر اس مسئلے سے دوچار ہیں برا ہوتا دیکھتے ہیں۔ سمجھتے ہیں آواز نہیں اٹھا سکتے صاحبِ انجمن۔

بہترین۔ رنگ باز دکھی کر گیا۔ ہمارے معاشرے کا المیہ۔ دین کو صرف اپنے مفادات کے لیے استعمال کرنا۔

افسانے سارے ہی اچھے۔ راشدہ رفعت کا افسانہ سب سے بیسٹ تھا۔ اور عارفہ فضل شاہ کا بھی بہت پسند آیا۔ قانتہ رابعہ جی ہمارے ساتھ بھی ایسا بہت دفعہ ہو چکا ہے الفاظ اور جملے پڑھ کر اپنے روزمرہ کے جملوں کو چھانٹی کیا اور اچھے اچھے جملے بولنے کا تہیہ کیا۔

باتوں سے خوشبو آئے یہ سلسلہ بہت پسند ہے۔ کھلتا کسی پہ کیوں میں جب بھی محسن نقوی کی شاعری ہو، بہت پسند آتی ہے۔ خوب صورت پیسے کے ٹوٹکے گا ہے بگاہے آزما لیتے ہیں۔ منور رانا کی غزل اچھی لگی۔ آخر میں ایک فرمائش سائرہ رضا اور ایمل رضا کا مکمل ناول شامل کیجیے۔

پیاری پروین! آپ کا خط پڑھ کر ہمیں دوہری خوشی ہوئی۔ پہلی خوشی کہ آپ شعاع پڑھتی ہیں اور دوسری خوشی کہ آپ کے گاؤں سے ہمیں پہلا خط موصول ہوا ہے۔ اس سے پہلے ہم نے گاؤں ڈھاڈر کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ بلوچستان کے ایک دور دراز گاؤں سے کسی لڑکی کا خط لکھنا اور اسے پوسٹ کرانا کتنا دشوار گزار مرحلہ ہوگا۔ ہم تصور کر سکتے ہیں۔ آپ کی محبتوں کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

یسریٰ ملک نے کندیاں میانوالی سے لکھا ہے

ادارے کے تمام لوگوں اور میری پڑھنے والی سب بہنوں کو میرا سلام۔ شعاع اور خواتین سے میرا رشتہ تقریباً بائیس سال پرانا ہے۔ باقاعدگی سے ہر ماہ یہ رسالے پڑھتی ہوں۔ آج پڑھتے پڑھتے میرا بھی دل چاہا کہ میں بھی خط لکھوں۔ مجھے نہیں پتا کہ ان ڈائجسٹوں میں خط کیسے لکھتے ہیں۔ میں نے اس سے پہلے کبھی خط نہیں لکھا۔ اس ڈائجسٹ نے ایک ماں کی طرح مجھے زندگی کو جینے کا ہنر سکھایا۔ اللہ آپ لوگوں کو دن دگنی رات چوگنی ترقی دے آمین۔

اب آتے ہیں شمارے کی طرف، تو جناب کالے رنگ میں پیاری سی ماڈل نے دل جیت لیا۔ پہلی شعاع پڑھی، بالکل ٹھیک کہا آپ نے زندگی بہت چھوٹی ہے، اسے نفرتوں سے نہیں بلکہ محبتوں سے سجائیں تا کہ ہمارے بعد بھی لوگ ہمیں اچھے لفظوں میں یاد کریں۔ حمد اور نعت کے بعد پیارے نبی کی پیاری باتیں پڑھیں، روز بروز علم میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ماشاءاللہ۔ تجھ سے ناتا جوڑا میں بہنوں سے ملاقات اچھی لگی۔ سسرال سسرال ہی ہوتا ہے میکہ کبھی نہیں بن سکتا چاہے کچھ بھی کر لو، یہ میرا تجربہ ہے (سب کا متفق ہونا ضروری نہیں۔)

شگفتہ بھٹی صاحبہ اللہ انہیں صحت کاملہ عطا فرمائے آمین۔ جنید اختر کی دستک بھی خوب رہی۔ نئے سال کی دہلیز پر سب بہنوں کو پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ خط آپ کے میں بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ ریحانہ وقاص، سونیا ربانی، زینب نور۔ صدف ناصر اور خاص کر گوشی جمال کا خط تو پورا افسانہ ہوتا ہے اللہ سب کو سلامت رکھے۔ آمین۔

”داحصر“ خوب جا رہا ہے۔ ماضی اور حال کا خوب صورت امتزاج۔ ”سرما کی دھوپ“ نے بہت مزا دیا ملٹنوں کے ساتھ ”ادھورے خواب“ قانتہ رابعہ بہت منفرد لکھتی ہیں۔

”رنگ باز“ بہت اچھے موضوع پر قلم اٹھایا عبیرین ابدال نے۔ اللہ ہدایت دے ایسے لوگوں کو۔

”ماء الملوک“ بہت پیارا ناول ہے نگہت سیما کا نام ہی کافی ہے۔

”محبت کا سی آنچل“ عارفہ فضل نے تقریباً ہر نئی شادی شدہ لڑکی کا احوال بیان کیا۔ ”الفاظ اور جملے“ لبنیٰ آصف نے میری کہانی لکھ ڈالی اب کوشش کروں گی خود کو تھوڑا بدلنے کی۔ جس کے موسم ”نعیمہ ناز نے کمال کر دیا میرے خیال میں نمبر ون ہے ان کا ناول حق سچ کی بات کرنا بہت آسان ہے لیکن عمل اتنا ہی مشکل جتنا سارا کے لیے تھا فلسطین کے مسلمان جو کچھ برداشت کر رہے ہیں۔ ان کے صبر اور حوصلے کو سلام۔ ”بات کا بتنگڑ“ جلد بازی ہمیشہ نقصان دیتی ہے۔ تھوڑا صبر کر لیں تو کوئی معاملہ خراب نہیں ہوگا۔ ”صاحبی الجھن“ ”یونیک سا نام عیشہ حسین نے بہت اچھا لکھا منفرد کہانی، ویسے ایسے بھائی کہاں ملتے ہیں عیشہ ہمیں بھی بتائیے گا۔ ہمارا بھی ایک سوتیلا بھائی ہے۔ جو کچھ انہوں نے ہمارے ساتھ کیا ہے آپ سوچ بھی نہیں سکتیں۔

”شام شہر ہجر“ فرح بخاری نے کیا خوب لکھا ہے۔ اگلی قسط آخری ہوگی یہ پڑھ کر اداس ہو گئے ہم تو عادی ہو گئے تھے۔ مومن۔ منصب۔ وسیلہ۔ تانیہ کے۔ ”عذرا“ ایسا

pklibrary.com

بہت سے لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے خوب سے خوب تر کی تلاش میں آخر میں کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ باتوں سے خوشبو آئے۔ بہت خوب صورت سلسلہ ہے۔ ہر بار پڑھ کر دل خوش ہو جاتا ہے۔ مسکراہٹوں میں ذہانت اور خوش خبری نے خوش کیا۔ کھلتا کسی پہ کیوں میں، اقصیٰ ناصر کا شعر نمبر ون پہ تھا۔ تاریخ کے جھروکوں سے جوزفین کی روداد پڑھ کر حیران رہ گئے۔ آخر میں مجھے جوڑوں کا مسئلہ ہے۔ لکھنا میرے لیے بہت مشکل کام ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ ہم اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کا کام بھی بخوشی لکھ دیتے تھے۔ اب گھر کے سودے کی لسٹ بنانا بھی بہت مشکل ہے۔

پیاری یسریٰ! بہت خوب صورت لکھائی۔ ہر کہانی پر رواں اور تفصیلی تبصرہ، جوڑوں کے درد کے باوجود ایسا خط لکھنا واقعی مشکل ہوگا۔ اللہ تعالیٰ آپ کی تکلیف دور فرمائے۔ اور آپ کو صحت کاملہ سے نوازے۔ آمین۔ ہر ماہ نہ سہی لیکن ایک دو ماہ کا وقفہ دے کر ضرور خط لکھیں۔

زرینہ خانم لغاری نے مظفر گڑھ سے لکھا ہے

فروری کا پیارا سا رسالہ ملا۔ نئے سال کی دہلیز پر میں نے بھی سروے بھیجا تھا نجانے کہاں غائب ہو گیا۔ دستک پرر کے ہم اب ڈرامے دیکھتے ہی نہیں اسی لیے کسی کو پہچانتے ہی نہیں، خیر جو بہن ڈراموں کی شوقین ہیں ان کے لیے اچھا سلسلہ ہے، پچھلے شماروں میں کزن فوزیہ نذیر کا بھی نانا جوڑا شائع ہو گیا آپ کا شکریہ۔

شگفتہ بھٹی کے حالات پڑھے ہمارے بھائی کا بھی کینسر سے انتقال ہوا تھا۔ شگفتہ کی اسٹوری پڑھ کر خیال ہے کہ ہم نے کیوں نا اپنے بھیا کو دیار رسول بھیج دیا شاید وہ بھی صحت یاب ہو کر آ جاتے، یہ خیال ہی نہ آیا اللہ شگفتہ کو صحت کاملہ عطا فرمائے آمین۔

والعصر بے چارے عیسیٰ پر بہت ترس آتا ہے فیروزہ دمنٹی لیٹر پر چلی گئیں۔ وریٰ کے ساتھ تو جو بھی ہو کم ہے۔ سرما کی دھوپ۔ اف دوسرے گھر آ کر بچیاں دھوپ کے لیے بھی ترستی ہیں، ماں باپ کا گھر تو جنت ہوتا ہے۔ رنگ باز بڑے ہی مکار لوگ تھے ایسے لوگوں سے دنیا بھری پڑی ہے، شکر سیدھی راہ پر آ گئے۔ ماء الملوک کا کیا مطلب ہے حالانکہ اردو میں ہمیشہ فرسٹ آتی تھی لیکن آپ جانے کیسے لفظ ڈھونڈ لاتی ہیں۔ کہانی مزے دار ہے۔ شیخو یقیناً زیب النساء کا گمشدہ بھائی ہے۔ محبت کا سنی آنچل دیکھیں نئی لکھنے والی بہنوں کو کیسی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے الفاظ جملے سبق آموز کہانی تھی۔

حبس کا موسم وری گڈ کہانی ہے حق سچ کا ساتھ دینا بہت مشکل ہے، مکافات عمل پر لوٹ پڑتا ہے بات کا بتنگڑ، خدا بچائے ایسی عورتوں سے جو بات کا بتنگڑ بنا کر فساد ڈلواتی ہیں، صاحبی انجمن اچھی کہانی تھی انجام اچھا دکھایا گیا ہے، شام شہر ہجر انجام کو پہنچنے والی ہے ارحم کے سوا اور سب اپنی جگہ ٹھیک ہو گئے۔ ارحم جیسے لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ ارحم کی ذرا لتریشن کروائیں منصب سے، پولیس والا تو وہ ہے ہی، عذرا مر گئی۔ مغرور سر پھری لڑکیوں کا ایسا ہی انجام ہوتا ہے وہ سمجھتی ہیں کہ حسن و جوانی ہمیشہ رہے گا یہ تو ڈھلتی کا سایہ ہے۔

منور رانا کی غزل بیٹیوں کی کیفیت بیان کرتی خوب صورت نظم نما غزل تھی دل اداس ہو گیا۔ باتوں سے خوشبو نے جسم و جاں کو خوشبو دار کر دیا۔ مسکراہٹیں ہوں اور مسکراہٹیں نہ بکھیریں یہ ہو ہی نہیں سکتا خوش خبری پر بہت ہنسی آئی۔ اشعار سب کے زبردست تھے جوزفین بونا پارٹ دل چسپ روداد تھی، موسم کے پکوان میں مونگ کی دال کا حلوہ پسند آیا۔ ہم دیسی لوگ ہیں دیسی چیزیں پسند آتی ہیں۔

پیاری بہن زرینہ! ہمیں افسوس ہے کہ آپ کا سروے شامل نہ ہو سکا۔ اب آپ خواتین کے سالگرہ نمبر کے سروے میں ضرور شامل ہوں اور کوشش کریں کہ جلد بھجوا دیں۔ تفصیلی تبصرے کے لیے شکریہ۔

عدینہ لغاری نے جھمڑو سے لکھا ہے

"پیاری باتیں" پڑھ کر ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔ حمد اور نعت بھی اچھی تھیں۔ شگفتہ بھٹی کو پڑھا۔ یہ انٹرویو میں نے روتے ہوئے پڑھا۔ میں سلام کرتی ہوں شگفتہ جی کو ان کے ہمت اور حوصلے پر اللہ ایسی مشکل کسی پر نہ لائے۔

سونیا جی کے خط کم آ رہے ہیں زینب اور رمشا روشن پھر غائب۔ فرح جی کا ناول آخر تک پہنچ گیا۔ "نگہت سیما" کا ناول اب شان دار جا رہا ہے۔ لبنیٰ آصف کا افسانہ کا ہمیں آئینہ دکھا گیا۔ میرے ساتھ بھی یہی مسئلہ ہے۔ حبس کے موسم" کیا شان دار ناول تھا جی چاہا رائٹر کے ہاتھ چوم لوں۔ فلسطینیوں کے صفحے پر میرے آنسو گرتے رہے۔ ناولٹ دونوں

ہی اچھے تھے۔ باتوں سے خوشبو بھی بہت پیارا سلسلہ ہے۔

پیاری عدینہ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے ممنون ہیں۔ زندگی میں اچھے برے ہر طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ اگر ایسے ظالم اور قاتل ہیں تو اچھے لوگ بھی ہوں گے۔ آپ دعا کریں کہ اللہ سب کو ہدایت دے خاص طور پر وہ لوگ جن کے ہاتھ میں اقتدار اور اختیار ہے۔ اگر قانون نافذ کرنے والے ادارے سختی کریں۔ کسی کو بھی ایسے ظلم کرنے کی ہمت نہ ہو۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

ام ہاشم واہ کینٹ سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

شعاع اور خواتین کی ایک طویل عرصے سے خاموش قاری ہوں۔

"2001 جب میرا کال شعاع کی زینت بنا سے اب تک پہلے اسٹوڈنٹس لائف اور اب شادی شدہ زندگی میں ایک بہن" "سہیلی اور کسی بڑے بزرگ کی طرح شعاع اور خواتین نے ہمیشہ رہنمائی کی۔

پتا نہیں لوگ (عمومی طبقہ) کیوں ان کہانیوں کے خلاف ہیں۔ میرے مطابق تو ہر پڑھنے والے کو شعور کی پختگی بہت زیادہ بہتر ہے۔

ام ہاشم! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ اتنی طویل مدت سے شعاع پڑھ رہی ہیں تو خط لکھنے میں اتنی تاخیر کیوں؟ اب رابطہ رکھیے گا۔ آپ جیسی قارئین کی رائے ہمارے لیے بہت قیمتی ہے۔

فہمیدہ جاوید نے ملتان سے لکھا ہے

شعاع کو دس سے پہلے ہی پڑھ لیا تھا مگر کچھ مصروفیت رہی۔ میرے بھائی بچے پہلی بار سکھر سے ملتان میرے گھر رہنے آئے اور بہت اچھا لگا خوشی ہوئی اور میرے شوہر بہت اچھے سے ان کے ساتھ رہے۔ اس بار مختصر تبصرہ حاضر ہے۔

سرورق مجھے پسند آیا، سادہ اور نفیس ساتھ ساتھ منفرد بھی تھا۔

اداریہ میں آپ نے درست کہا تھا کہ ہر چیز میں اعتدال بہت ضروری ہے اور سچ تو یہ ہے کہ یہ اعتدال ڈائجسٹ ہی سکھاتے ہیں۔ نبی کی باتیں تو سب سے پہلے پڑھتی ہوں کہ کتنے اہم موضوعات پر ہمیں اتنا کچھ سیکھنے کو ملتا ہے وہیں، دینی آگاہی بھی ہوتی ہے۔ نانا جوڑا اچھا لگتا ہے اگرچہ ایک ہی موضوع ہوتا ہے مگر دل کچھ ہلکا ہو جاتا ہے سن کر کسی کی داستانیں۔ مجھے یاد ہے یہ سلسلہ شعاع اگست 2015 کے سالگرہ نمبر سے شروع ہوا تھا۔ شگفتہ بھٹی سے ملاقات بہت پسند آئی۔ سال نو کے سروے کا باقی حصہ بھی خوب ہی تھا۔ خاص کر ریحانہ وقاص کے طویل جوابات دلچسپ تھے۔ واقعی قاری بہنیں بھی اچھی اور معیاری تحریریں لکھتی ہیں اور ادارہ بھی نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کر رہا ہے۔ امت العزیز کا ناول کچھ منفرد ہے۔ وہیں سسپنس بھی ہوتا ہے ہر قسط میں اس وجہ سے پسند آتا ہے خاص کر شروع میں جو ابن سلیمان کا ذکر ہوتا ہے اور اشعار یہ بہت پسند ہے مجھے۔ ورنی کا کردار اب مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا۔ عیسیٰ کا کردار اچھا ہے۔ عیسیٰ کی بھابھی بڑی چڑیل قسم کی ہے اور کہانی میں تجسس ہے، اس لیے پسند ہے۔ نگہت سیما کا تو نام ہی کافی ہے۔ شایان کا اس قسط میں کردار مثبت ہو گیا ہے۔ نیلم ناز سلطان کی کہانی تو پورے شمارے میں سب سے زیادہ پسند آئی کہ اتنی عرق ریزی سے موضوع کو لکھا گیا۔ موضوع کی مناسبت سے مصنفہ نے گھریلو موضوع یعنی گل، سارہ اور ان کی ساس پر خوب لکھا جو ہال پر ڈاکا ڈال کر خوب دیدہ دلیری سے بیٹھی تھی۔ "صاحب انجمن" تحریر جو بھائیوں کی نوک جھونک اور خونی رشتوں کے احساس پر تھی دلچسپ اصلاحی کہانی تھی۔ یہ بھی عام ڈگر سے کچھ الگ تھی، اس لیے پسند آئی۔ "رنگ باز" میں ماورا کے ساتھ جو ہوا بہت برا لگا۔ افسانے سارے ہی اچھے تھے دلچسپ مگر سبق آموز، قلمہ نے اچھا سبق دیا کہ مہمان کو اطلاع کر کے ہی جانا چاہیے۔ عارفہ فضل شاہ کا افسانہ بھی دلچسپ تھا جس میں ہمارے پیارے ڈائجسٹوں کا ذکر تھا۔ لبنیٰ آصف نے مختصر مگر بہت بہت اہم بات سکھائی کہ الفاظ اور جملے کتنا اثر رکھتے ہیں۔ افسانہ بات کا بتنگڑ بھی پسند آیا یہ بھی اکثر لوگوں کی عادت ہوتی ہے جو اتنی سی بات کا بتنگڑ بنا دیتے ہیں۔

بہت شکریہ فہمیدہ! خط واقعی کافی تاخیر سے ملا لیکن کوئی بات نہیں، کبھی کبھی ہو جاتا ہے۔ ایسا بھی، ویسے بھی، میکے سے کوئی آئے تو لڑکیوں کو کیسی خوشی ہوتی ہے ہمیں اندازہ ہے۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے ممنون ہیں۔

☆☆

pklibrary.com

آمتہ العزیز شہزاد

والعصر

وری اپنی نانی اور ماموؤں کے ساتھ رہتی ہے، اس کی ماں مر چکی ہے۔ گھر میں دو ماموں، ممانی اور ان کے بچے ہیں۔ ان میں آپس میں اچھے تعلقات ہیں مگر بڑی ممانی اسے پسند نہیں کرتی ہیں۔ عباد ان کا بیٹا ہے۔ جو وری کو چاہتا ہے۔

آتش جو سراپا اسرار ہے، وہ لوگوں کو اپنی گفتگو سے زیر کرتا ہے۔ اس کے بے شمار عقیدت مند ہیں۔

بی ذی ایک بے ہوش لڑکی کو لے کر آتش کے ہاں پہنچ جاتی ہے۔ آتش اپنے اسسٹنٹ خاقان کے ذریعے ڈاکٹر کو بلاتا ہے۔ نانی وری کو پڑھانے کی ذمہ داری عباد پر ڈال دیتی ہیں۔

لڑکی ہوش میں آتی ہے لیکن حواسوں میں نہیں۔ اپنا نام تک نہیں بتا سکتی۔ آتش کے گھر پولیس آ جاتی ہے۔

پولیس کا نام سن کر بی ذی گھبرا جاتی ہے۔ آتش اسے پرسکون رہنے کا کہتا ہے۔ پولیس انسپکٹر امیر علی اپنے جونیئر فاروق احمد کے ساتھ آتے ہیں۔ وہ آتش کو تربیتی ورکشاپ میں مدعو کرتا ہے۔ فاروق احمد تھوڑا اکھڑ ہے۔

عباد، وری کو پڑھاتے ہیں شریفہ کو یہ پسند نہیں عباد کے دوست سر عیسٰی وری کو پڑھانے آتے ہیں، وری بتاتی ہے کہ وہ کمبائن امتحان دے رہی ہے، اور اسے ہر سبجیکٹ انتہائی مشکل لگتا ہے۔

فیروزہ کی بیٹی شونا کی شادی ہوتی ہے، اس میں بالی کا بھی نکاح کر دیا جاتا ہے، بالی انتہائی کم عمر ہے۔

شاکر فیروزہ کا بڑا بیٹا اپنے باپ کے حکم پر گھر تعمیر کروا رہے ہیں۔ ان کے والد بنگلہ دیش میں کاروبار کے سلسلے میں رہتے ہیں۔

فیروزہ کا چھوٹا بیٹا عامر بہت خودسر ہے۔ وہ عیسٰی سے بہت چڑتا ہے۔ وہ ماں سے پیسے مانگتا ہے۔ انکار پر عیسٰی کو بالکونی سے الٹا لٹکا دیتا ہے۔

وری کو سہراب سے ملنے کی خوشی اور گھبراہٹ ہوتی ہے۔ عیسٰی سمجھتا ہے کہ وہ امتحانات کی وجہ سے پریشان ہے۔

بی ذی کو آتش فون کر کے اطلاع دیتا ہے کہ وہ ٹی وی آن کر کے دیکھے علائنہ سے متعلق خبر آ رہی ہے۔ پتا چلتا ہے کہ علائنہ کی لاش اس کے فلیٹ سے برآمد ہوئی ہے۔

وری پیپر دینے خوب تیار ہو کر جاتی ہے، اسے مفتاح چھوڑنے جاتا ہے، وائلہ کو یہ بات پسند نہیں آتی۔

ریتا عامر سے کہتی ہے کہ عیسٰی سے کہو کہ ایڈمیشن ٹیسٹ میں اس کے بھائی کو پاس کروا دے۔

سید صاحب کو جب سے عامر نے عیسٰی کے متعلق بتایا تھا کہ وہ سگریٹ نوشی کرنے لگا ہے سید صاحب بہت پریشان تھے۔ وہ فیروزہ بیگم کو واپس پاکستان بھیجنے کی بات کرتے ہیں۔

وریٰ جلدی سے پیپر ختم کر کے سہراب کے ساتھ اس کی گاڑی میں بیٹھ کر چلی جاتی ہے۔
آتش چند روز کے لیے اسلام آباد جاتا ہے۔ خاقان دوسرے کاموں میں مصروف ہوتا ہے خولہ کو موقع مل جاتا ہے کہ وہ فون کر لے وہ فون کرتی دوسری طرف فون اٹھا لیا جاتا ہے۔ وہ جواب نہیں دے پاتی۔ دوبارہ نمبر ملاتی ہے اس وقت کوئی اسے آواز دیتا ہے۔
شریفہ سہراب کی دعوت کرتی ہیں اور بظاہر اسے گھیر لیتی ہیں، وہ دل ہی دل میں ان کے بے وقوف بن جانے پر ہنستا ہے۔ فاروق احمد، امیر علی خان سے کہتا ہے کہ علائنہ خان کے قتل کے تانے بانے آتش کدہ سے ملتے ہیں۔
عامر، عیسیٰ سے پوچھتا ہے کہ اس نے اس کا کام کر دیا عیسیٰ کے منع کرنے پر وہ اسے ڈانٹتا ہے۔ فیروزہ عامر کو سخت سست کہتی ہیں اور عیسیٰ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہیں۔ عیسیٰ واپس آتا ہے تو وہاں سے اس کا جرنل غائب ہوتا ہے۔
بی ذی اپنا پروموشنل ٹریپ کر کے واپس آتی ہے تو اس کے دوست پارٹی رکھتے ہیں پارٹی میں اس کو ایک فون آتا ہے۔ وہ علائنہ خان قتل کیس کے سلسلے میں بی ذی سے بات کرنا چاہتا ہے۔ بی ذی خوف زدہ ہو کر لائن کاٹ دیتی ہے۔
شاکر کی بیوی فرح عیسیٰ اور عامر کی بحث کو بڑھا چڑھا کر جھگڑے کی شکل میں شوہر تک پہنچا کر کہتی ہے کہ ہمیں اپنے بچوں کو اس ماحول سے بچا کر الگ ہونا ہوگا۔ وہ اپنے بہنوئی سے کینیڈا یا امریکا جانے کے سلسلے میں بات کرتی ہے۔
وریٰ ریڈ سوٹ میں سہراب سے ملنے آئی تھی وہ اسے اپنے گھر لے جانے کی بات کرتا ہے۔ وریٰ حامی بھر لیتی ہے۔ سہراب بہت خوش ہوتا ہے اسی وقت گاڑی کے سامنے عیسیٰ آ جاتے ہیں۔ وریٰ ڈر جاتی ہے۔
عامر بالی سے مل کر ماں اور عیسیٰ کی شکایت کرتا ہے۔ بالی اپنی کم عمری کی شادی اور غصیل شوہر کی وجہ سے

pklibrary.com

پہلے ہی ناراض تھی۔ وری بھاگم بھاگ گھر پہنچتی ہے۔ گھر میں سب پریشان ہو جاتے ہیں۔ خاقان سر آتش سے اجنبی لڑکی کے فون استعمال کرنے کی شکایت کرتا ہے۔
نمبر نہ نوٹ کرنے پر آتش اسے سخت سست سناتا ہے۔
سہراب وری کے بچ نکلنے پر غصہ ہوتا ہے۔ اسے فکر ہوتی ہے کہ عیسی نے اپنے گھر والوں کو سب بتا نہ دیا ہو۔
وری رجا سے بات کرتی ہے۔

ستائیسویں قسط

اے رب۔
اے حباب فانی حضرت انسان کے رب!
جس نے اپنا ریزہ ریزہ وجود یک جا کر کے
ایک آواز بنائی
اور نکھارا اسے ایقان کے پاک جل سے
تا کہ کوئی تشکیک میرے دل میں باقی نہ رہے۔
اور سنوارا اسے ایسے زیور امید سے
کہ وہ جگ مگا اٹھے
اور پھر اسے ایک آخری بار پوری ہمت مجتمع کر کے
کیا تیری سمت روانہ

وہ محو سفر ہوئی محض آسمان تک
اور اسی سے ٹکرا کر واپس پلٹ آئی
اور آج سے اس راز میں شریک کیا ہے کہ
وہاں کوئی نہیں رہتا۔
کوئی بھی نہیں!!

☆☆☆

"بابو!"
آج کے منظر نے اس کے ذہن و دل پر دستک نہ دی تھی بلکہ وہ کتاب زیست کے صفحات پلٹ کر از خود ایک صفحے میں داخل ہو گیا تھا۔
اور یہ منظر اسی گھر کا منظر تھا کہ جہاں آج بہت لوگ اور بہت سی آوازیں تھیں، مگر اسے تو کچھ بھی سنائی نہ دے رہا تھا ماسوائے فیروزہ کی پکار کے۔
"بابو!" وہ شاید کبھی شاکر کے زیر استعمال رہنے والے کمرے سے اسے پکار رہی تھیں۔ سو وہ دیوانہ وار ادھر دوڑ گیا۔
"طبیعت تو ان کی آن اینڈ آف خراب ہی رہتی تھی، پرالیسی بھی نہیں کہ صرف دو ہی دن میں ختم ہو گئیں۔" وہاں فیروزہ تو نہیں البتہ رنج والم میں ڈوبے شاکر بیٹھے اپنے کسی سسرالی عزیز کو بتا رہے تھے۔

"بابو!" اس بار آواز ڈرائنگ روم سے آئی تھی۔ وہ اوہ کرتا پڑتا اسی جانب روانہ ہوا۔

"دیکھو تو گھر میں میت آنے کو ہے، اور بہو رانی کیسے گنگناتے ہوئے جھاڑ پونچھ میں لگی ہوئی ہیں۔" پڑوسن خاصی ناگواری سے رینا کو دیکھتے ہوئے ساتھ براجمان کسی محلے دار خاتون کے کان میں سرگوشی کر رہی تھیں۔

اس نے ایک بے قراری طائرانہ نگاہ سارے ڈرائنگ روم پر ڈالی۔ فیروزہ یہاں بھی نہیں تھیں۔ اس کی بے چینی حد سے سوا ہوگئی۔

"بابو!" اوہ ہاں۔ وہ تو اپنے کمرے میں موجود ہوں گی نا۔

وہیں سے تو آواز دے رہی تھیں اسے۔ وہ بھی ایک بے عقل تھا کہ انہیں ادھر ادھر ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔ اس خیال نے اسے قدرے مطمئن کر دیا تب ہی وہ اس بار خاصی معتدل چال چلتا، فیروزہ کے کمرے میں داخل ہوا تھا۔

"بڑی نیک اور ہمدرد خاتون تھیں، ہمیشہ ہر کسی کے کام آئیں۔ کبھی کسی کو انکار نہیں کیں۔" فیروزہ کی چھوٹی بھابھی ساڑھی کے پلو سے آنکھیں رگڑتے ہوئے گویا تھیں۔ اسے تعجب ہوا کہ اگر وہ یہاں بھی نہیں تھیں تو آخر وہ تھیں کہاں؟

"امی۔ امی۔" وہ دیوانگی سے ادھر ادھر دیکھا کیا۔ "آپ کہاں ہیں؟"

اور اس کی تلاش لاؤنج کے وسط میں آ کر اختتام پذیر ہوگئی کہ وہ وہاں سفید چادر میں لپٹی ہر غم و تکلیف سے ماورا، بہت سکون اور بڑی راحت سے محو استراحت تھیں۔

"پر یہ کیا۔ وہ آج یہاں کیوں لیٹی ہوئی تھیں؟" اس نے حیرت سے سوچا اور ٹھیک اسی لمحے فیروزہ اسے مخاطب کر کے بہت دلار سے بولی تھیں۔

"میرا چہرہ دیکھ، دیکھ لے بابو۔ کہ آج کے بعد تو ہم تمہیں صرف خوابوں اور خیالوں میں دکھائی دیں گے نے۔"

"امی؟" وہ کیا کہہ رہی تھیں جسے سن کر عیسیٰ کی آنکھیں مارے بے یقینی کے اپنی جگہ ساکت سی ہوگئیں۔ ایسے ہی نہ جانے کتنے ہی پل گزر گئے۔ تب ہی کسی نے بہت بھاری دل سے صدا لگائی تھی۔

"کلمۂ شہادت۔"

اور اس آواز نے گویا اسے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ تب وہ بے اختیار زمین پر گرا۔ اور فیروزہ کے بے دھڑکن سینے پر سر رکھ کر بلک بلک کر رو دیا تھا۔

آج دنیا کی سب سے عظیم نعمت اس سے واپس لے لی گئی تھی۔

آج اس کا ہر مصلحت سے بالائے طاق ہو کر یوں تڑپ تڑپ کر رونا برحق تھا۔

☆☆☆

"خالہ صدقے، بڑے دن بعد صورت دکھائی، یہ بتا کہاں رہا اتنے دن؟"

ظاہر ہے یہ "راز" تو وہ ظاہر کر نہیں سکتا تھا کہ "کہاں" رہا۔ البتہ اس امر سے وہ بخوبی واقف ہی تھی کہ "کیوں" رہا؟ سو وہ ذرا مین آنکھ خباثت سے دبا کر معنی خیز سے لہجے میں بولا۔

"سمجھا کرو نا آنٹی۔ ذرا "ماحول سازگار" ہو جانے کا انتظار کر رہا تھا۔"

"ماحول تو سازگار ہی سازگار ہے میرے چندا۔" وہ جو ڈرائنگ روم کے صوفے پر اس کے برابر میں براجمان تھی، اس کی جانب ذرا سا جھک کر آنکھوں میں سفاک کی لطف لینے والی کیفیت اور لبوں پر زہر خند

pklibrary.com

مسکراہٹ لیے سرگوشیانہ لہجے میں بولی۔
"بڑا" غیرت۔ غیرت" کا راگ الاپا کرتا تھا نا۔ اس بار اس غیرت مند کے منہ پر ایسا کرارا چانٹا پڑا ہے کہ ہر وقت اپنے کمرے میں منہ چھپائے مصلے پر بیٹھا بس اللہ اللہ کرتا رہتا ہے۔"
"چڑیا جو اس کے ہاتھ سے نکل کر میرے "پنجرے" میں آ گئی۔" وہ یہ سن کر چہرے پر فتح مندی کی تمتماہٹ لیے بولا۔ "اب اگر وہ اللہ اللہ بھی نہ کرے تو اور پھر کرے کیا بے چارا؟"
"اب ایسا بے چارا بھی نہیں ہے وہ۔" رینا منہ کے زاویے بگاڑ کر بولی۔
"یہ تو میں تھی کہ جس نے کہانی کو گھما کر تجھے سب کی نظروں میں مشکوک ہونے سے پہلے صاف بچالیا، ورنہ یہ بے چارا تو تجھے تھانے لے جانے کے چکروں میں تھا۔"
"ہوں۔ تو ٹھیک ہے نا۔" وہ ذرا سیدھا ہو کر بیٹھتا ہوا کچھ غیر مطمئن سے لہجے میں بولا۔ "اتنے دن میں اسی لیے تو روپوش رہا کہ ان سب باتوں کا اندازہ تھا مجھے۔ خیر۔ اب کیا حالات ہیں؟ کیا کہتا ہے وہ؟" وہ قدرے گمبھیرتا سے بولا تو رینا ٹھٹھا لگا کر بولی۔
"اب کیا کہے گا؟ ابھی تو بتایا ہے نا تجھے کہ بد بخت سنیاسی بن گیا ہے۔ تو یہ بتا "وہ" کہاں ہے؟" اس نے آنکھیں نچا کر بڑی معنی خیزی سے پوچھا تو سہراب پریشان کن سوچ جھٹک کر بڑے غرور سے بولا۔
"میرے قابو میں۔"
"آہا۔" رینا نے شوخی سے بھرپور انداز میں کہتے ہوئے بھانجے کے بازو پر چٹکی بھری۔ "حسینہ کو قابو کیے بیٹھا ہے۔ اور ہمیں ولیمہ بھی نہیں کھلا رہا۔"
"کھلا دوں گا۔" وہ تفاخر آمیز سے لہجے میں یوں بولا، گویا حسینہ کو قابو کرنے والی بات نے اسے بہت شاداں کر دیا ہو۔ "تمہیں ولیمہ بھی کھلا دوں گا پر اس وقت اگر تم مجھے زبردست سا قہوہ پلا دو تو مزہ آ جائے۔"
"ہاں۔ ہاں کیوں نہیں۔" وہ نثار ہونے والے لہجے میں بولی۔ "ابھی شابا کے لیے پتیلی بھر قہوہ چڑھایا ہے۔ دراصل کچھ دنوں سے میرے بچے بے چارے کے سر میں مستقل درد رہنے لگا ہے۔" وہ اپنے اکلوتے لخت جگر کی تکلیف کا ذکر کرتے ہوئے کچھ رنجیدہ سی ہو گئی۔
"تو ڈاکٹر کو دکھاؤ نا اسے جا کر۔" وہ بے پروائی سے بولا۔ "گھر میں کیا قہوے بنا بنا کر پلا رہی ہو۔"
"ارے دکھایا تھا۔" اس نے بتایا۔ "سب ٹھیک ہے۔ میرا بچہ ننھیال پر گیا ہے نا تو بس اسی لیے اسے نظر ذرا جلدی لگ جاتی ہے، ددھیال پر چلا جاتا تو اوروں کو نظر لگاتا پھرتا۔"
"بڑی مزاحیہ باتیں کرتی ہو خالہ!" اسے واقعتاً ہنسی ہی آ گئی۔
"بس تو تو جانتا ہے۔" وہ آہ بھرنے والے لہجے میں بولی۔ "ہم سب بہنوں میں سب سے زیادہ جولی میں ہی تھی۔ یہ تو سسرال والوں نے ہنسنا بھلا دیا۔ خیر بیٹھ میں تیرے لیے قہوہ لے کر آتی ہوں۔"
"تم لے کر آؤ۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھتا ہوا بولا۔ "تب تک میں دو کش لگا کر آیا۔"
"ہاں چل ٹھیک ہے۔" اس نے سہراب کو یہیں بیٹھ کر شغل کرنے کا یوں نہیں بولا کہ ایک تو کسی بھی وقت عامر کی آمد متوقع تھی اور سب سے بڑی بات کہ ان کی من مانیوں میں حائل وہ سب سے بڑی "رکاوٹ" اس وقت اپنے ہی کمرے میں موجود تھی۔
پر اوپر جاتی سیڑھیوں پر قدم بڑھانے والا سہراب نہیں جانتا تھا کہ وہ اس وقت کمرے میں نہیں بلکہ۔

☆☆☆

"قابل داد ہے وہ عقل جو حضرت انسان کو ان دیکھی زنجیروں سے آزاد کر کے خود پر بھروسا کرنا سکھاتی

pklibrary.com

ہے۔"

آتش نے شرر کا لیکچر دیکھا تو کچھ دیر بعد ہی لیا تھا، پر اس وقت وہ ایک جگہ چائے پر مدعو تھا سو اسے فوراً ہی کال نہ کر سکا۔ بعد ازاں ہوٹل واپسی پر جب آتش کدہ فون ملایا تب تک وہ وہاں سے روانہ ہو چکا تھا۔

یوں اب شرر کی از خود آتش کدہ آمد تک اسے انتظار کرنا ہی تھا۔ مگر من میں اجاگر ہوتی بے پناہ و بے تحاشا مسرت کا اظہار وہ کیوں کر نہ کرتا؟

سو ایک بھاری بھرکم جیکٹ پہن کر وہ ہوٹل کے کمرے سے باہر نکل آیا۔ اور خراماں خراماں گویا بادلوں پر قدم دھرتا دریائے ٹیمز کے کنارے آ پہنچا۔ کہ اس وقت سارا جہاں بھی اسے "اڑنے" کے لیے کم محسوس ہو رہا تھا۔

دریا کنارے ساحوں کے ہجوم کے ساتھ ساتھ دیگر سرگرمیاں معمول کے مطابق جاری تھیں۔ یوں تو وہ تنہائی پسند واقع ہوا تھا مگر اس وقت اس خوش باش و بے فکر بھیڑ کا حصہ بنا اپنی دیو مالائی اساطیر میں ملنے والے پراسرار گرداروں کی سی نگاہوں میں فتح مندی کی چمک لیے سامنے کھڑے ایک گٹارسٹ کو نغمہ سرا دیکھ رہا تھا۔

یوں تو اب انگلستان کا جاڑا بھی قصہ پارینہ بنتا جا رہا ہے مگر آج کی اس سرد سہ پہر نے سب کے ہوش اڑا رکھے تھے تب ہی تو باوجود دستانوں میں مقید ہونے کے، گٹار کے تاروں کو چھیڑتی اس فن کار کی انگلیاں بار بار مرتعش ہو جاتی تھیں۔

"اور اپنی ذات پر بھروسا ہی سب کچھ ہے۔ یہ میرا یقین ہے۔ اور میرے اس یقین نے آج ایک اور زندگی سدھاری ہے۔ سو آتش۔ عظیم آتش کو یہ فتح مبارک ہو۔"

وہ شادمانی سے چلا چلا کر گویا دو عالم کو اپنی اس کامیابی سے آگاہ کر دینا چاہتا تھا مگر اس کی باوقار شخصیت پر ایسی بے خودی کچھ جچتی نہیں ہاں مگر اس کی انگلیاں۔ وہ تو اپنے بھولے بسرے "دوستوں" سے یہ خوشی بانٹ سکتی تھیں نا۔ سو وہ لمحے کے ہزارویں حصے میں بے اختیار آگے بڑھا اور اسی نغمہ سرا کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔

"may i ?" اس نے دایاں ہاتھ آگے کرتے ہوئے دفعتاً پوچھا تو وہ لہو چھلکاتی رنگت کا حامل نیلگوں آنکھوں والا مغنی پہلے تو چونک کر ایک دم چپ ہو گیا۔ پھر اس کا مدعا جان کر بمشکل تمام مسکرایا کہ اس کوشش میں چہرے کی جلد اکڑ گئی تھی۔ پھر گلے سے گٹار کا بیلٹ نکال کر بڑی خوش دلی سے اسے تھماتے ہوئے بولا۔

"شیور۔"

وہ آتش تھا۔ پر اس لمحے بہت مسرور تھا۔ سو برسوں بعد اس نے وہ کیا کہ کبھی جس شوق کے پیچھے وہ خوار پھرا کرتا تھا۔

"The sky is not any limit"

اس نے تاروں پر دھن چھیڑ دی تھی مگر لب ہنوز باہم پیوست تھے یہ اور بات کہ اس کا دل جھوم جھوم کر گا رہا تھا۔

☆☆☆

"اے میرے رب۔ تو نے کہا مانگ تو میں نے ہر بار ہی بڑی امید اور یقین کے ساتھ تجھ سے مانگا پر تو نے کیا کیا؟"

وہ کھلے آسمان تلے، بنا مصلے، ننگے فرش پر قبلہ رخ بیٹھا، دونوں ہاتھ سینے تک بلند کیے، گردن جھکائے، آج جذب سے آنکھیں بند کرنے کے بجائے ان میں ایک عجیب سی افسردگی آمیز شکستگی لیے فرش کو تکتا ہوا اپنے معبود مطلق سے مناجات کے بجائے شکوہ کناں تھا۔

''تو نے ہر بار اپنے سامنے پھیلے ہوئے میرے ہاتھوں کو بڑی بے نیازی سے جھٹک دیا اور کیا وہی جو تو نے چاہا۔ اور میں نے ہر بار تقاضائے عبدیت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے خود کو یہی تسلی دی کہ ہوگی اس میں تیری کوئی مصلحت پوشیدہ پر آج۔''

اس کے ہاتھ اٹھے اٹھے شل ہو چکے تھے سو سینے سے پیٹ تک جا پہنچے پر اسے احساس ہی نہ ہوا کہ کسی اور ہی جہاں میں پہنچا ہوا تھا وہ اس لمحے، سو ہاتھوں پر دھیان دیے بغیر بس۔ اپنی کہتا رہا۔

''آج میں تیرے سامنے یہ اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ اب اس سے آگے مجھ میں سکت نہیں۔ اگر یہ امتحان ہے تو اسے ختم کر دے اور اگر سزا ہے تو معاف کر اس بار ہر صورت میری حاجت روائی فرما کہ یہ سوچ مجھے پاگل کر دے گی کہ اس نے یہ کیوں کیا میرے ساتھ؟ مجھے اپنی ہی نظروں میں نامعتبر کر کے وہ جانے والی گئی تو آخر گئی کہاں؟ میں ایک بار۔ صرف ایک بار روبرو اس سے یہ سوال کرنا چاہتا ہوں کہ میری پہلے ہی سے تباہ حال زندگی کا تماشا بنا کر اسے کیا ملا؟ اے بہت سکون سے مجھے بے بسی کے اتھاہ سمندر میں ڈوبتا دیکھنے والے میری فریاد سن۔

وہ دعا نہیں۔ اب گویا اپنی بندگی کا ''صلہ'' مانگنے پر اتر آیا تھا۔ اور سہراب جو دبے قدموں چھت چھت پر آ پہنچا تھا اور بھری ہوئی سگریٹ کو لیوں میں داب کر شعلہ دکھانے ہی والا تھا کہ معاً اس کی نگاہ تاروں کی چھاؤں میں نمایاں ہوتے، دوزانو بیٹھے اس سیاہ ہیولے پر پڑی تو وہ چونک اٹھا۔ پھر یک بیک ہی ایک ظالم سی چمک اس کی آنکھوں میں رقصاں ہوئی تب اس نے سگریٹ دوبارہ جیب میں رکھی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس کے نزدیک جا پہنچا۔ اور لطف لینے والے لہجے میں بولا۔

''سچ کہوں تو تمہاری یہ حالت دیکھ کر مجھے سخت افسوس ہو رہا ہے۔''

ایک تو یہ آواز مستزاد الفاظ۔ عیسیٰ چونکا۔ اس کے ہاتھ بے اختیار گود میں آ گرے۔ اس سے اس نے بہت تکلیف۔ بے پناہ اذیت محسوس کی تھی۔ دشمن کے سامنے اپنی خستہ حالی عیاں ہو جانے کی تکلیف اور اس کے طعنہ زن ہونے کی اذیت۔ جب کہ اس نے اسی پر بس نہیں کیا تھا۔ بلکہ وہ کہہ رہا تھا

''تمہارے ساتھ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔''

''کیا ہوا ہے میرے ساتھ؟'' اس نے ہنوز اسی انداز سے بیٹھے بیٹھے سرسراتی آواز میں سوال کیا۔

''یہی؟'' وہ چٹخارہ سا لے کر بولا۔ ''اتنی جلدی بھول گئے؟ وہ تمہاری ہونے والی۔ نہیں نہیں۔ بلکہ نہ ہونے والی دلہن شادی سے پہلے تمہیں چھوڑ کر کہیں چلی۔''

''وہ ملے گی۔'' وہ اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی کسی لاوے کی مانند زمین سے اٹھا۔ اور اس کا گریبان دبوچ کر بولا۔ ''وہ ضرور ملے گی۔ میں نے ابھی ہار نہیں مانی۔ میں ڈھونڈ رہا ہوں اسے۔''

سہراب، جو رینا کی زبانی اس کا ''پانی اترنے'' کی داستان سن کر اس حد تک شاد و مطمئن ہو گیا تھا کہ اسے چھیڑنے کی غلطی کر بیٹھا، اب اس کا ردعمل دیکھ کر اس کے توتے اڑ گئے تھے، تب ہی اپنا گریبان چھڑاتے ہوئے پینترا بدل کر بولا۔

''میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ وہ مل جائے، تاکہ میرے بارے میں تمہیں جو غلط فہمی ہے، وہ دور ہو جائے۔''

''غلط فہمی ہے یا درست فہمی'' وہ غرایا۔ ''یہ تو اس کے مل جانے پر معلوم ہو ہی جائے گا۔''

''اور اگر وہ نہ ملی تب۔؟'' حالانکہ وہ اب اس بارے میں مزید کوئی بات نہیں کرنا چاہ رہا تھا مگر اس کے اندر کے چور نے بے اختیار اس سے سوال کروا دیا اور عیسیٰ جسے اس سوال پر چونک کر دیکھنا تو سہراب کی سمت چاہیے تھا۔ پر وہ مضطرب ہو کر آسمان کی جانب نگاہ کرتے ہوئے بولا۔

''تب۔ تب مجھے یقین ہو جائے گا کہ وہاں کوئی ہے ہی نہیں۔ کوئی بھی نہیں۔''

اور اس کے لبوں سے برآمد ہوئے ان الفاظ نے فضا میں منتشر ہو کر کائنات کی ہر شے کو متاسف کر دیا۔
ماسوائے اس کے کہ جس نے روز اول سے ابن آدم کو مایوس کرنے کی قسم اٹھا رکھی ہے۔

☆☆☆

''جانتا تھا، میں جانتا تھا کہ تم میں ''حق'' کو پہچاننے کی صلاحیت ہے اور دیکھ لو۔''
وہ مے نوش نہیں تھا۔ مگر یہ تین چار دن اس نے عالم مدہوشی میں گزارے تھے۔ ایسی مدہوشی کہ جس نے اسے خود سے بھی بے گانہ رکھا۔ او یہ کیفیت گویا اس نے دیدہ دانستہ طور پر طاری کر رکھی تھی۔ یہ نہ کرتا تو اس بار یقیناً خود کو مار دیتا کہ ''اندر'' شور بہت تھا۔ اتنا کہ گھبرا کر بلا ارادہ وہ آتش کدے چلا آیا تھا۔ کہ اب وہ ''کہیں اور'' جانے کے قابل ہی کہاں رہا تھا۔
آج بوجوہ تمام نیٹ ورکس بند تھے سو بی ذی نے خاقان سے کہہ کر بذریعہ لینڈ لائن اس کا رابطہ آتش سے کروا دیا تھا کہ یہ اس کا حکم تھا کہ جوں ہی شرر دستیاب ہو فی الفور اس کی بات کروا دی جائے۔ یوں اب وہ لاؤنج میں موجود فون کا چونگا کان سے لگائے آتش کی احساس مندی سے معمور آواز سن رہا تھا۔
''میرا یہ یقین غلط نہیں تھا سو ''آزادی'' کی جانب پہلا قدم تمہیں مبارک ہو اے رفیق دانا۔''
''رفیق دانا؟'' وہ اپنے لیے یہ لقب سن کر بے تاثر سی ہنسی ہنس دیا۔
''کیوں؟'' آتش چونکا۔ ''تمہیں اپنی دانائی پر شک ہے یا پھر ہماری رفاقت پر شبہ؟''
''میری دانائی کیا اور آپ کی رفاقت۔'' اس نے بے دلی سے سر جھٹکا۔ ''رہنے دیجیے سر۔ کوئی اور بات کیجیے۔''
''کہیں تم ''اقرار'' کر کے پچھتا تو نہیں رہے؟'' آتش نے اس کی بد دلی محسوس کر کے پر سوچ سے لہجے میں سوال کیا۔
''اقرار؟'' وہ ایک بار پھر ہنسا۔ مغموم سی ہنسی! ''اقرار کہاں سر۔ میں نے تو ''انکار'' کیا ہے۔'' وہ بولا تھا۔
اور اسی وقت زبردستی رضیہ کی تھمائی چائے کی پیالی اس کے لبوں سے لگا کر آتی خولہ جہاں کی تہاں تھم گئی۔
''منکر ہو گیا ہوں میں'' وہ ہنوز بولے جا رہا تھا۔ ''اپنی راہ'' اس'' سے جدا کر لی ہے میں نے۔ عقل کی صدا پر لبیک کہا ہے میں نے۔ پھر میں کیوں پچھتانے لگا۔''
''خوب۔ بہت خوب۔'' آتش کو شرر کی زبانی یہ وضاحت سن کر یک گونہ طمانیت حاصل ہوئی تھی تب ہی اس بار تحسین آمیز لہجے میں بولا۔ ''تمہارا تذبذب سے پاک لہجہ غماز ہے کہ تم اب واقعی آگے بڑھ چکے ہو۔ سو اے دوست۔ ''گروہ دانش وراں'' میں آتش تمہیں خوش آمدید کہتا ہے، اس امید کے ہمارا یہ ساتھ اب دائمی ہے؟''
''یقیناً سر آتش۔'' وہ بجھے بجھے سے لہجے کو زبردستی بشاشت کے لبادے میں لپیٹ کر بولا۔ ''میرا اور آپ کا یہ ساتھ اب دائمی ہے کہ میں اب اور کہاں جا سکتا ہوں؟''
خولہ نے اس کا یہ حلف نما اقرار سنا۔ اور چائے اسے دیے بنا ہی خاموشی سے واپس مڑ گئی۔
ایسی خاموشی سے جو ایک بہت بڑے طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہونے والی تھی۔

☆☆☆

''یہ گھر ابو نے بہت ارمانوں سے بنوایا تھا، تاکہ ہم سارے بھائی اس میں رہ سکیں۔''
وہ فیروزہ کے پنگ پر، ان کے تکیے پر سر رکھے چت لیٹا پتھرائی آنکھوں سے چھت کو تکے چلا جاتا تھا۔ کہتے ہیں کہ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ ہر زخم مندمل ہوتا چلا جاتا ہے۔ ہر یاد دھندلی پڑ جاتی ہے اور ہر غم کی شدت

مدغم ہو جاتی ہے پر اچھی یادداشت کی یہی تو بڑی خامی ہے کہ یہ تو ہر زخم اتنی آسانی سے مندمل ہونے دیتی ہے نہ ہی کسی یاد کو دھندلا۔ اور جہاں تک غموں کی شدت کم ہونے کا تعلق ہے۔ تو والدین کے بچھڑ جانے کا غم تو وہ صدمہ ہے کہ جسے اچھی یا بری یادداشت سے کوئی سروکار نہیں۔ یہ غم تو روز طلوع ہونے والے سورج کی طرح ہے کہ جس کی تمازت کے درجے کم یا زیادہ تو ہو سکتے ہیں پر اس کا کسی روز طلوع نہ ہونا۔ قطعی ناممکن!

سو وہ بھی اس لمحے اسی حزن کے تپتے صحرا میں جھلس رہا تھا اور ذہن میں ابھر رہا تھا وہ منظر کہ جب فیروزہ کو اپنی ابدی منزل روانہ ہوئے دس روز گزر چکے تھے۔ اور ان کی تجہیز و تکفین کے سلسلے میں ۔۔۔ آنے والے ان کے پردیسی سپوت اب واپسی کے لیے پر تول رہے تھے، متعلقہ کمبیر موضوعات کا احاطہ کرتی یہ الوداعی بیٹھک اسی سلسلے میں منعقد ہوئی تھی۔ اور ابھی شاکر گفتگو کی ابتدا کرتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

''میں، ظاہر اور طاہر تو اپنے اپنے روزگار کے سلسلے میں اس گھر سے دور ہیں۔ اب تم دونوں کا فرض ہے کہ یہاں مل جل کر رہو۔''

''میں تو مل جل کر رہنا چاہتا ہوں مگر اس کا رویہ ناقابل قبول ہے۔'' عامر، سر جھکائے بیٹھے عیسیٰ کی جانب اشارہ کرتا ہوا اہانت آمیز ۔ لہجے میں بولا تھا۔ ''ایک تو یہ کوئی نصیحت سنتا نہیں۔ اپنی من مانی کرتا ہے۔ امی بھی انتقال سے پہلے اس کے رویے سے بہت پریشان تھیں۔ اور پھر یہ کچھ کماتا دماتا بھی نہیں۔ میرا ہاتھ ان دنوں خود بھی تنگ ہے میں اس کا بوجھ کیسے اٹھا سکتا ہوں۔''

''تم پریشان کاہے ہوتے ہو۔'' ظاہر کھنکھار کر احسان کرنے والے لہجے میں بولے۔ ''ہم امی کو جو روپیہ بھیجتے تھے جب تک ہم سے بن پڑا، تمہیں بھیجتے رہیں گے۔''

''روپیہ بھیج کر آپ نے کوئی احسان نہیں کیا۔'' عامر تیوری چڑھا کر بولا۔ ''فیکٹری آدھی ہماری بھی ہے، لگے ہاتھوں اس کا حصے کی بھی بات ہو جائے تو اچھا ہے۔''

''تم بھی تو نارتھ ناظم آباد والا دکان اپنے نام کیے بیٹھے ہو۔'' وہ دور رہ کر بھی باخبر تھے سو شرمندہ کرنے والے لہجے میں بولے۔ ''اس کا بھی بات کرو۔''

''اس کا نام بھی مت لیں۔'' وہ یوں اچھلا گویا بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

''وہ ابو نے مجھے دے دی تھی، لہٰذا اب وہ صرف میری ہے۔''

''کوئی ثبوت، کوئی کاغذ دکھاؤ۔'' ان کی تکرار شروع ہوئی تھی موقع اب تھا سو بالی بھی بول اٹھی۔

''اور امی کا زیور، کپڑا، لتا؟''

''زیور تو ایسا کوئی خاص نہیں تھا ان کے پاس۔'' رینا جلدی سے بولی تو نعمی نے تعجب سے اسے دیکھا۔

''اتنا زیور تو تھا ان کے پاس''۔ وہ بولی۔ ''وہ سب کہاں گیا؟''

''کہاں گیا، مجھے کیا پتا؟'' وہ برا مان کر بولی۔ ''میں ان کی چیزوں میں ہاتھ واتھ نہیں لگاتی تھی۔ ہاں البتہ وہ جو بھاری سی بالیاں، چین اور چوڑیاں ہاتھوں میں پہنے رہتی تھیں، وہ طاہر نے اپنے پاس رکھ لی ہیں۔'' ظاہر ہے اس کی نگاہ چوکی نہیں تھی۔ اور اسے طاہر کی یہ حرکت ہضم بھی نہیں ہوئی تھی تب ہی سب کے سامنے بطور خاص یہ بات اگل دی۔

''وہ تو اپنی زندگی میں امی نے یہ کہہ دیا تھا کہ میرے بعد تم لے لینا۔'' طاہر جیسے اپنے اس عمل کی صفائی دیتے ہوئے بولا۔ ''یہ زیور تمہاری دلہن کے لیے ہیں۔''

''اچھا۔'' بالی مسکرا کر اچھا کو لمبا کھینچتی ہوئی بولی۔ ''تم سے یہ سب کہہ دیں وہ۔ ہمیں تو کبھی نہیں بتائیں۔''

''آپ کو بھی تو چوری چھپے وہ بہت کچھ دیتی رہتی تھیں۔'' طاہر طنزیہ بولا۔ ''وہ سب انہوں نے ہمیں بھی نہیں

بتایا۔"
اب ان کے مابین گرما گرمی شروع ہو چکی تھی۔ شاکر نے انہیں ڈانٹ کر خاموش کروایا۔ پھر پوچھا۔
"اس گھر کے کاغذات کہاں ہیں؟"
"مجھے کیا پتا۔" وہ کھردرے پن سے بولا۔ "اس سے پوچھیں۔ یہ ان کے قریب تھا۔ اسے پتا ہوگا۔"
"میں نہیں جانتا۔" اس نے رنج والم میں ڈوبے لہجے میں سر جھکائے جھکائے ہی کہا کہ اس کے نزدیک ان ساری اشیاء کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔
پر وہ غلطی پر تھا۔ نہیں جانتا کہ مادی اشیاء کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہوتی ہے۔
اور جب تک اس نے جانا۔ تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔
☆☆☆
"تمہارا جو بھی سامان ہے اسے سمیٹ لو ہمیں صبح یہاں سے نکلنا ہے۔"
وہ تو یہی سمجھ رہا تھا کہ آہستہ آہستہ گرد بیٹھ رہی ہے مگر عیسیٰ کے ارادے کسی اور سمت ہی اشارہ کر رہے تھے سو وہ سخت پریشانی میں مبتلا ہو گیا تھا۔
اگرچہ اس نے "پکا کام" کیا ہی اس غرض سے تھا کہ اگر کل کلاں کوئی ان تک پہنچ بھی جائے تب بھی اسے کسی قانونی چارہ جوئی کا سامنا نہ کرنا پڑے کہ اس سے قبل بھی "دو تین بار" اسے قانونی مسائل سے دوچار ہونا پڑا تھا۔
اب دل کے معاملات میں اسے قانون کا ٹپک پڑنا کچھ بھاتا نہیں تھا سو احتیاط لازم تھی۔ اور پھر کچھ یہ بات بھی تھی کہ وہ اس نغمہ دسرور سے بھی کسی طور دست بردار پر آمادہ نہ تھا کہ جس کی بات ہی کچھ اور تھی حالانکہ پہلے بھی کئی آئیں اور اس نے جانے دی تھیں مگر وری نہیں! کہ یہ اس کی ضد تھی اور وہ "ٹرافی" جو اس نے اس خبیث کے ہاتھ سے باقاعدہ چھینی تھی۔۔ بہرکیف۔
سرور شاہ سے مشورہ کر کے وہ اسی نتیجے پر پہنچا تھا کہ فی الحال فوراً سے پیشتر ان کی کہیں اور منتقلی ناگزیر تھی۔ سو سر دست وری کو دی جانے والی ہدایت اسی ضمن میں تھی۔
"کیا ہم اپنے گھر جا رہے ہیں؟" وہ جو کسل مندی سے بیڈ پر دراز تھی، یہ سن کر جوش وخروش سے ایک دم اٹھ بیٹھی۔
"اپنے گھر سے کیا مطلب ہے تمہارا؟"
"مطلب میرا اور تمہارا۔" اس نے آنکھوں میں ایک سپنا سا سجا کر کہا۔
"یعنی ہمارا گھر۔"
"نہیں۔" وہ اس کے نزدیک آبیٹھا اور بہت تفکر آمیز سنجیدگی سے بولا۔
"فی الحال تو ہم حیدرآباد جائیں گے۔ وہاں بھی سرور شاہ کا ایک گھر ہے۔ ہم کچھ دن وہاں رہیں گے۔"
"مگر کیوں سہراب؟" اس نے بے زار سے لہجے میں پوچھا۔ "اب تو اتنے دن ہو گئے۔ ہم اب بھی اپنے گھر کیوں نہیں جا سکتے؟"
"کیونکہ اور سب تو تمہیں تلاش کر کر کے تھک چکے۔" وہ دانت پیستا ہوا بولا۔ "مگر تمہارا وہ عاشق نامراد اب بھی تمہیں ڈھونڈنے کو پر عزم ہے۔"
"کک..... کون۔" وہ سہراب کے تیور بگڑتے دیکھ کر ہکلاتے ہوئے ہوئے بولی۔ "کون سا عاشق؟"
"کون سا عاشق؟" اس نے زہرخند سا مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔ "کتنوں کو آسرے دے رکھے تھے جان

تمنا؟"

"کیا بول رہے ہو؟" وہ ناگواری سے بولی۔ "میں کیوں دینے لگی کسی کو آسرے؟"

"سچ بتا دو۔" اس نے جیسے پچکارتے ہوئے کہا۔ "کیسے پڑھتی تھیں تم اس کے ساتھ بیٹھ کر۔ وہ لاکھ زاہد خشک سہی پر تمہارا یہ توبہ شکن حسن دیکھ کر کبھی تو پگھلا ہوگا؟"

"تمہیں شرم نہیں آ رہی یہ سب کہتے ہوئے؟" وہ خوب جان گئی تھی کہ کس کا ذکر کر رہا ہے تب ہی ملامتی سے لہجے میں بولی تو دفعتاً وہ بھڑک اٹھا۔

"تمہیں آئی تھی اس کے نام کا وہ ارمانوں بھرا سرخ جوڑا پہن کر۔"

"جوڑا، جوڑا، جوڑا۔" وہ دونوں کنپٹیوں پر ہاتھ رکھ کر ہذیانی انداز سے چلا اٹھی۔ "کتنی بار میں تمہیں وضاحت دے چکی ہوں۔ اب کیا میری جان لے کر میری بات پر یقین کرو گے؟"

"تب بھی نہیں۔" وہ سرد انداز سے مسکرایا تھا۔ وری نے بہت عجیب نظروں سے اسے دیکھا۔ جب کہ وہ اس کی نظروں سے مترشح تعجب سے بے پروا کہہ رہا تھا کہ۔

"میں جو کچھ اس کی آنکھوں میں تمہارے لیے دیکھ آیا ہوں، اس کے بعد تو بالکل بھی نہیں۔"

☆☆☆

"سر! کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟"

یہ دوپہر کے کھانے کا وقت تھا کہ جب فاروق احمد نے امیر علی خان کے کمرے کے دروازے کے چوکھٹے میں کھڑے ہو کر اندر آنے کی اجازت طلب کی۔

"ارے فاروق احمد....." امیر علی خان جو کھڑکی سے آئی ہوئی سبزیاں بمشکل زہر مار کر رہے تھے، نقن سے سر اٹھا کر اس کی جانب دیکھتے ہوئے خوش دلی سے بولے۔

"آؤ.....آؤ۔"

"طبیعت کیسی ہے سر؟" وہ اندر داخل ہو کر ان کے مقابل نشست سنبھالنے کے بعد مخاطب ہوا۔

"تمہیں کیسی لگ رہی ہے؟" انہوں نے ابلی ہوئی لوکی بدقت نگلنے کے بعد عینک کی اوٹ سے اسے دیکھتے ہوئے ذرا چڑے ہوئے لہجے میں جواب دینے کے بجائے الٹا پوچھا فاروق احمد اپنے لبوں پر بے ساختہ آنے والی مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے — مؤدب لہجے میں ترنت بولا۔

"مجھے تو خاصے بہتر دکھائی دے رہے ہیں آپ سر۔"

"ظاہر ہے۔" وہ ایک سرد سی سانس لے کر بولے۔ "جب یہ گھاس پھوس مجھے صبح شام کھانے کے نام پر ملے گا تو طبیعت تو ٹھیک ہی رہے گی۔"

"یہ آپ کی بہتری کے لیے ہے۔" اس نے گویا دلاسا دیا کہ واقف تھا وہ مرغن غذاؤں کے کس قدر شوقین ہوا کرتے تھے اور اب۔

"آئی نو.....آئی نو۔" امیر علی خان ماتھے پر بل ڈال کر گردن اثبات میں ہلاتے ہوئے اس کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے بولے۔ "ویل تم سناؤ، کوئی نئی کوئی تازی؟"

"سر! آتش کی نئی کتاب ان دنوں کافی زیر بحث ہے۔" ان کے استفسار کی دیر تھی۔ وہ یک دم سیدھا بیٹھتے ہوئے بولا۔

"ہاں۔" امیر علی خان کا نٹا واپس نقن میں رکھتے ہوئے سنجیدگی سے بولے۔ "جانتا ہوں۔"

"تب تو آپ اس کتاب کے متن سے بھی واقف ہوں گے؟" اس نے بے چینی سے پوچھا۔

''ہاں۔'' وہ ٹفن کا ڈھکن لگا کر ٹفن ایک طرف رکھتے ہوئے بولے۔ ''میں نے سرسری نظر ڈالی ہے اس کتاب پر۔''

''لوگ سخت خفا ہیں سرآتش کی اس کتاب پر، ان فیکٹ سرآتش پر۔'' اس نے سنسنی خیز سے لہجے میں بتایا۔

''ظاہر ہے۔''

''میرا اندازہ ہے کہ آتش کدہ کو سیکیورٹی خدشات ہو سکتے ہیں۔'' وہ گمبھیرتا سے بولا تو اس گفتگو کے دوران پہلی بار امیر علی خان چونکے۔

''کسی خبری نے آگاہ کیا ہے؟''

''نہیں سر۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں نے کہا نا کہ میرا اندازہ ہے۔ چوں کہ آتش کدہ ہمارے تھانے کی حدود میں آتا ہے تو اس لحاظ سے آتش کدہ کو سیکیورٹی ہمیں ہی فراہم کرنا ہوگی۔''

''درخواست آئی تو دیکھیں گے۔'' وہ غیر دل چسپی سے بولے۔ پھر دراز سے ایک نیلی جلد والی فائل نکال کر فاروق احمد کے سامنے دھرتے ہوئے ناصحانہ لہجے میں کہنے لگے۔

''اور میری مانو تو تم اب اس کیس کا پیچھا چھوڑ کر کوئی اور کام کرو۔''

''آپ واقعی یہ سمجھتے ہیں کہ مجھے اس کیس کی فائل بند کر دینی چاہیے؟'' اس نے بغور انہیں دیکھتے ہوئے پوچھا گویا اندر ہی اندر شدید الجھن کا شکار ہے۔

''اس کیس کی فائل عملاً بند ہی ہے برخوردار!'' وہ کرسی کی پشت سے کمر ٹکا کر تجربہ کار لہجے میں کہے گئے۔

''یہ تو تمہاری ذاتی دل چسپی ہے جواب تک اس کیس سے منسلک ہو گرنہ یہاں تو ایسے لاکھوں کیسز ہیں جنہیں بنا حل کیے ان کی فائلز کبھی کی بند کر دی گئی ہیں۔ اور پھر یہ بھی تو دیکھو کہ اب تک اس کیس کے حوالے سے تمہارے ہاتھ آیا ہی کیا ہے؟ سو میری مانو اور اپنے آپ کو ضائع مت کرو۔ یہ داؤ دائنڈ کورابری کا کیس ہے۔ تم اس کی فائل اسٹڈی کر کے اب اس پر کام شروع کر دو۔''

''یس سر!'' حقیقت حال کی منظر کشی پر اس کا چہرہ اُتر گیا تھا۔ وہ غلط نہیں کہہ رہے تھے سو اس بار وہ نیم رضامندی سے بولا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ مجھے واقعی اب کسی اور کیس پر کام شروع کر دینا چاہیے۔''

☆☆☆

''امی، آپ بات کیجیے نا مجھ سے میرے سوال کا جواب دیں کہ آپ وہاں کس مقام پر ہیں؟ کیسی ہیں؟ بتائیں نا، کچھ تو کہیں؟''

سینے میں کچھ اٹک رہا تھا سوا سے سلسلہ تنفس برقرار رکھنے میں دشواری سی محسوس ہونے لگی۔ تب ہی وہ سُرعت سے اٹھ بیٹھا اور زور زور سے سانس لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر غالباً کمرے میں آکسیجن ناکافی تھی سو وہ بڑی پھرتی سے چلتا لان میں نکل آیا۔ مگر سانس تھی کہ بحال ہونے کا نام ہی نہ لے رہی تھی۔ تب ہی اس کے ذہن میں ایک جھماکہ سا ہوا اور اگلے ہی لمحے وہ قبرستان کی سمت جانے کے لیے گھر سے نکل رہا تھا۔

چند برس قبل، فیروزہ کے انتقال کے بعد جب پہلی بار اسے اس کیفیت کا سامنا کرنا پڑا تب شاکر گھبرا کر اسے اسپتال لے گئے تھے۔

ڈاکٹرز کے مطابق اس کی یہ کیفیت کوئی صدمہ نہ جھیل پانے کے سبب ہو گئی تھی، سو شاکر نے اسے گھر آکر خوب سمجھایا بجھایا، مقدور بھر ہمت و حوصلہ بھی دینے کی کوشش کی اب اس سے زیادہ وہ اور کوئی بھی کیا کر سکتا تھا۔ وہ کوئی بچہ تو نہیں تھا کہ اسے گود میں لے کر بہلایا جاتا۔ ہاں وہ ان سب کے لیے بے شک بچہ نہیں تھا مگر فیروزہ

کے لیے وہ مرتے دم تک بچہ ہی رہا۔ اور بچہ بھی وہ جسے انہوں نے اپنے پلو کے سائے تلے رکھا ہوا تھا۔ وہ ان کا سامع تھا، غم گسار، تنہائی کا ساتھی شاید گھر کی سب سے چھوٹی اولاد بوڑھے والدین کو ایک الگ انداز سے محسوس کرتی ہے۔ اور اپنی آخری عمر کی جانب بڑھتے والدین بھی غالباً اسی لیے اپنی چھوٹی اولاد کو "اولاد" سے کہیں بڑھ کر بھی "بہت کچھ" سمجھ لیتے ہیں۔ اور یہ ان کا بے جالاڈ اور محبت ہی نہیں ہوتی بلکہ ایک طرح سے "تنہا" ہوتے انسان کا ایک نامحسوس سا خوف بھی ہوتا ہے جو انہیں اپنی اس اولاد کے حد سے زیادہ قریب لے آتا ہے۔ اس کے علاوہ سب ہی بال بچے دار تھے سوانہوں نے ماں کے چلے جانے کو اس شدت سے محسوس نہیں کیا جیسا کہ وہ کر رہا تھا۔ وہ فیروزہ کی تنہائی کا ساتھی تھا، اور اب خود تنہا رہ گیا۔

لہٰذا اس کا ذہن یہ حقیقت قبول کرنے میں متامل تھا۔

آنے والے پردیسی اپنے اپنے ٹھکانوں کو لوٹ چکے تھے اور اسی کے ساتھ ایک چھت تلے رہنے والوں کو وہ خار کی مانند کھٹکتا تھا، سو ایسے میں اسے کیا دوسرا بہت حاصل ہوتی چنانچہ وہ گھنٹوں چپ چاپ یا تو فیروزہ کے یا پھر اپنے کمرے میں ہی پڑا رہتا۔ اور پھر جیسے ہی سانس لینے میں دشواری کا سامنا ہوتا تو وہ دن دیکھتا تھا نہ آدھی رات، بس گھر سے پندرہ منٹ کی پیدل مسافت پر واقع قبرستان کی سمت چل پڑتا اور فیروزہ کی لحد پر آ بیٹھتا..... اور اس کی سمت یوں یک ٹک دیکھتا رہتا گویا وہ ابھی دکھائی ہی تو دے جائیں گی۔

اور آج جب وہ ان کی سات برس پرانی قبر پر سرہانے لگے نیم کے درخت سے گرنے والے خشک پتے بہت آہستگی سے ہٹا رہا تھا، تب ان دنوں کی کیفیت یاد کر کے اس کا دل افسردگی سے بھر گیا۔ اس نے نا صرف فیروزہ بی کے ساتھ والی قبر کی بھی اچھی طرح صفائی کر کے کوڑا ایک جانب اکٹھا کیا۔ اسی اثناء میں قبروں کی دیکھ بھال پر مامور، گورکن کا بیٹا آ گیا تو اسے کوڑا اٹھانے سے متعلق ہدایت دے کر پانی منگوایا۔ قبر پر چھڑکاؤ کر کے مٹی اچھی طرح بٹھائی۔ تکیے پر جمی گرد ہاتھ سے جھاڑی اور کونے پر لگے برے سے وضو کر کے قبر کے سرہانے آ بیٹھا اور فاتحہ خوانی میں مصروف ہو گیا۔ مگر ذہن میں رہ رہ کر وہ تمام اذیت ناک اضطراب بھرے پل ابھر ابھر کر آ رہے تھے کہ جب وہ گھنٹوں تن تنہا، چپ چاپ سا یہاں بیٹھا رہا کرتا تھا۔ اسے نہ تو فاتحہ خوانی کا ہوش ہوتا تھا نہ ہی کسی اور بات کا۔ بس اس کے سر میں ایک ہی سودا سما گیا تھا کہ وہ کسی طور فیروزہ سے گفتگو کرے۔ انہیں دیکھ لے کہ آخر وہ ہے کہاں۔

قبرستان کے سرے پر رہائش پذیر گورکن اور اس کا خاندان اب اسے اچھی طرح پہچان گیا تھا۔ گورکن کی بیوی حیرت سے اسے دیکھا کرتی اور سوچتی کہ کیا اسے قبرستان میں رات کو دیر تک بیٹھنے سے ڈر نہیں لگتا؟ نادان نہیں جانتی تھی کہ ڈرنا تو دراصل چلتے پھرتے انسانوں سے چاہیے۔ اپنی اپنی قبر میں ابدی نیند سونے والوں سے نہیں۔

اس شام کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی اور وہ کسی بھی قسم کے گرم کپڑے سے بے نیاز وہیں فیروزہ کی قبر کے پاس گویا، دنیا و مافیہا سے بے خبر بیٹھا ہوا تھا کہ معاً اس کے کان کے نزدیک کسی نے پراسرار سے لہجے میں سرگوشی کی۔

"عیسیٰ، اب گھر جاؤ۔" وہ چونکا نہیں کہ اسے یوں لگا گویا اس کا وہم ہے مگر۔

"عیسیٰ، جاؤ اپنی دنیا میں لوٹ جاؤ۔" اس بار وہ سرسراتی آواز اس کے انتہائی قریب سے ابھری تھی۔

اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

اور وہ لمحہ آیا تھا کہ جس کے یاد آنے پر اب بھی اسے جھرجھری سی آ جاتی تھی۔ سورہ سورۃ کی تلاوت مکمل کر کے اٹھا اور یک لخت وہیں ٹھہر کر ایک عجیب ناقابل بیان سے درد میں گھر کر ماں کی قبر کی جانب دیکھا۔

اور اپنی ماں کی قبر کی جانب دیکھنا کسی حوصلے کا کام ہے؟ جس نے دیکھا، وہی جانتا ہے۔

جی چاہتا ہے کہ بس، کسی طور دونوں ہاتھوں سے مٹی ہٹا کر وہ چہرہ دیکھ لو کہ جس پر نظر ڈالتے ہی دنیا کا ہر غم اپنا وجود کھو دیتا ہے۔ ان آنکھوں کو چومنے کی خواہش سینے میں سر پٹخنے لگتی ہے کہ جن میں آپ کو دیکھ کر وہ چمک ابھرتی ہے کہ جو ہزار ہا کہکشاؤں کو مات دے دے۔ ان ہاتھوں کو چوم لو کہ جو بہت شفقت سے آپ کا سر ہلایا کرتے تھے اور خیر جی کا کیا ہے یہ تو ہے ہی دیوانہ، سو وہ کچھ دیر یونہی کھڑا حیرت ناک، گہری اداسی سے فیروزہ کی قبر کی جانب دیکھا کیا۔ پھر گورکن کے بیٹے کو کچھ روپے تھما کر وہاں سے واپسی کے لیے قدم بڑھا دیے کہ تب ہی۔

''جا رہے ہو بابو؟'' اسے یوں محسوس ہوا جیسے عقب سے فیروزہ نے پکارا ہو۔ سو وہ ایک پل کو رکا۔ پھر رنجیدگی سے سر جھٹک کر تیزی سے آگے بڑھتا چلا گیا کہ ظاہر ہے وہ جان گیا تھا کہ یہ اس کا وہم ہے مگر۔

دور..... نہیں دور، بہت دور اس دنیا کی حد سے پرے کسی انجانے سے مقام پر خاکی وجود سے ماورا، کسی اور قالب میں ڈھلی فیروزہ نے واقعی اسے پکارا تھا وہ یہ بات نہیں جانتا تھا۔

اور اچھا ہی ہوا کہ نہیں جانتا تھا۔

☆☆☆

''میں تو تمہارے لیے اتنی فکر مند تھی کہ پتا نہیں کہاں ہے میرا بچہ۔''

اس نے وقتی طور پر وری کو حیدر آباد منتقل کر دیا تھا کہ حیدر آباد میں واقع سرور شاہ کا وہ گھر ہر لحاظ سے محفوظ تھا۔ جب کہ خود وہ فی الحال اپنے کراچی والے گھر ہی میں رہائش پذیر تھا اور اب اسے فروخت کرنے کی تگ و دو شروع کر دی تھی کہ اس کا دل اب اس مکان سے بھر گیا تھا، اب وہ اپنی نئی دلہن کے ساتھ نئے مکان میں رہنا چاہتا تھا۔

شریفہ کئی دن سے اسے متواتر کال کر رہی تھیں۔ پہلے تو اس کا ارادہ انہیں ٹال دینے کا تھا مگر پھر اچانک ہی ایک خیال کے تحت اس کی آنکھیں روشن ہوئیں اور اس کا ارادہ بدل گیا۔ یوں آج وہ ان کی دعوت پر گوشۂ عافیت آ بیٹھا تھا۔ جہاں نہ پہلے کی سی رونق تھی نہ برکت البتہ کچھ کردار، اب بھی جوں کے توں تھے جیسا کہ اس وقت مہمان خانے میں اس کے بالمقابل براجمان بلا تکان بولتیں شریفہ۔

''مفتاح سے پوچھا تو اسے بھی تمہاری کوئی خیر خبر نہیں تھی، تب تو بچی میرا دل اتنا گھبرایا کہ ڈرتے ڈرتے ہمت پکڑ کر میں نے تمہاری خالہ کو کال ملا لی۔''

''جی.....'' شریفہ خاموش ہوئیں تو وہ جو ان کے سامنے خاصا مودب بنا بیٹھا تھا، بہت شریفانہ لہجے میں گویا ہوا۔ ''مجھے بتایا تھا آنٹی نے کہ آپ میری خیریت کے بارے میں کافی فکر مند تھیں۔''

''تو کیوں نہ ہوتی؟'' وہ جذباتی سی ہو کر بولیں۔ ''تم اتنے نیک، اتنے اچھے، کہ مانو تم سے تو جیسے دل کا رشتہ جڑ گیا ہے۔ مجھے تو تمہاری خالہ بھی بڑی بھلی عورت لگیں ورنہ میں تو گھبرا رہی تھی ان سے رابطہ کرتے ہوئے کہ نا جانے سامنے سے وہ کیا ردعمل دیں۔''

''کیوں؟'' اس نے انجان سا بن کر پوچھا۔ ''آپ میری خالہ سے اتنا کیوں گھبرا رہی تھیں؟''

''اب کیا کہوں؟'' وہ انداز نشست بدل کر ایسے بن کر بولیں گویا اس موضوع پر بات کرنے سے اجتناب کرنا چاہ رہی ہوں۔ ''کوئی بات تم سے چھپی ہوئی تھوڑی ہے بچے۔ اس کم بخت نے تو تمہاری خالہ کے دیور کو پھنسا کر اسے دولہا بنا، یہاں بلا لیا اور خود نا جانے کس کے ساتھ نکل گئی۔ سچی بات ہے کہ بھلی تو خوب ہی ہوئی تمہاری خالہ کے سسرال والوں کی، بس اسی لیے میں ذرا گھبرا رہی تھی کہ قصور وار نہ ہوتے ہوئے بھی ہم اپنی جگہ چور سے بن گئے ہیں۔''

''ارے نہیں آنٹی۔'' وہ بہت شیریں لہجے میں بولا۔ ''آپ کو شرمندہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ جو کچھ بھی ہوا اس میں آپ لوگوں کا تو کوئی قصور نہیں۔''

''صحیح کہہ رہے ہو۔'' انہیں قلبی طور پر بہت طمانیت محسوس ہوئی تھی اس کی وضع داری دیکھ کر سو وہ مطمئن سے لہجے میں تائید آبولیں۔ ''سارا کیا دھرا تو اسی بدبخت ہی کا ہے۔ ہم تو بس یہ سوچتے ہیں کہ دفع ہونا ہی تھا پہلے ہو جاتی آخر بارات گھر کے دروازے تک بلوانے کی کیا ضرورت تھی اور وہ اس کا سر تمہاری خالہ کا دیور۔''

وہ بولتے بولتے ایک بظاہر سرسری مگر درحقیقت پرسوچ سی نگاہ، سہراب کے اجلے چہرے پر ڈال کر یک لحظہ توقف کے بعد دوبارہ گویا ہوئیں۔

''وہ تو اپنی دلہن کے بھاگ جانے پر اتنا دیوانہ ہو گیا کہ تمہارے ساتھ ہی لڑ پڑا۔''

''ہاں وہ.....'' سہراب ایک دم چوکنا سا ہو کر بیٹھتا ہوا، دایاں ہاتھ چہرے پر پھیر کر جیسے کوئی ''پکڑائی'' دینے والا تاثر زائل کرتا ہوا بولا۔

''دراصل وہ ایک نفسیاتی انسان ہے۔ میری آنٹی کو بھی بہت پریشان کر کے رکھا ہوا ہے اس نے۔ وہ ہم لوگوں کا اپنے گھر آنا جانا بھی پسند نہیں کرتا۔ نانا اور ماموں کے گزر جانے کے بعد وہ خود کو شیر سمجھنے لگا تھا مگر میں آنٹی کی خبر گیری کو جاتا رہا۔ بس انہی باتوں کی وجہ سے وہ خار کھاتا ہے مجھ سے۔''

''دفع کرو۔'' شریفہ کے لیے یہ وضاحت کافی تھی سو اطمینان بھرے لہجے میں ہاتھ نچا کر بولیں۔ ''مجھے تو یوں بھی پاگل ہی لگا تھا جو اس حرافہ کے پیچھے خوار ہو کر یہاں تک آ گیا۔ خیر چھوڑو اسے اور تم بتاؤ۔ تمہاری مدر لندن سے کب آ رہی ہیں؟''

''میری مدر؟'' وہ چونکا۔

''ہاں..... ہاں۔'' شریفہ اس کے بھول پن پر نثار ہونے والے انداز سے مسکرا کر بولیں۔ ''تمہاری ہی مدر کی بات کر رہی ہوں۔ وہ آئیں تو گھر لے کر آؤ انہیں۔''

''گھر؟'' اس نے ماتھے پر دو مل ڈال کر پوچھا۔ ''وہ کیوں؟''

''آئے ہائے بچے.....'' وہ تو اس کی اس درجہ معصومیت پر نہال ہی ہو گئیں تب ہی بے ساختہ اٹھ کر اس کی بلائیں لے کر بولیں۔ ''اس زمانے میں بھی ایسے سادہ ہو کہ دیکھ کر یقین آ جاتا ہے کہ ضرور کسی نیکوکار کی اولاد ہے۔''

''جی!'' سہراب کے جبڑے بھنچ گئے۔

''تم ایسا کیوں نہیں کرتے کہ اپنی مدر کا نمبر مجھے دے دو۔'' شریفہ کے ذہن میں اچانک ہی آیا تھا۔

''نمبر تو دے دوں۔'' وہ ان کے لپٹر ہو جانے پر اب اندر ہی اندر سخت تاؤ کھا رہا تھا تب ہی ذرا سنجیدگی سے بولا۔ ''پر آپ کو ان سے بات کیا کرنی ہے؟''

''اب بھی نہیں سمجھ سکے۔'' وہ مسکرائیں پھر کچھ سوچ کر بہت مزے سے بولیں۔

''دراصل تم مجھے اتنے بھا گئے ہو کہ میں نے تمہیں اپنا بیٹا بنانے کا ارادہ کر لیا ہے۔ اور بس یہی بات میں تمہاری مدر سے کرنی ہے۔''

☆☆☆

''ایک سوال پوچھوں شرر؟''

آج کا لیکچر اختتام پذیر ہو چکا تھا۔ جانے والے جا چکے تھے پر آج نا جانے کیوں وہ اب تک یہیں ٹھہرا ہوا تھا۔ موسم خاصا دل فریب تھا سو بی زی نے چائے لان ہی میں لگانے کا حکم دے دیا تھا۔ کہ وہ اب اندر کمرے

میں پڑے پڑے گھبرانے لگی تھی۔
یوں اب وہ دونوں آبنوسی کرسیوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے اور درمیان میں دھری چھوٹی سی گول میز پر خولہ چائے لگا رہی تھی کہ تب ہی اسے بغور دیکھتی بی زی اچانک ہی بولی تھی۔
''آں..... ہاں؟'' وہ جو افق پر نظریں جمائے کھویا کھویا سا بیٹھا ہوا تھا، بی زی کی آواز پر چونکا پھر بے تاثر سے لہجے میں بولا۔
''ہاں پوچھو؟''
''کیا تمہیں کبھی کسی سے محبت ہوئی ہے؟'' اس نے شرر سے یہ سوال کیوں کیا؟ اس وقت خود بھی نہیں جانتی تھی۔
''محبت؟'' اسے یقیناً بی زی سے کسی ایسے سوال کی توقع نہیں تھی تب ہی چونک کر تعجب سے بولا۔
''ہاں محبت.....'' وہ بولی۔ ''جواب دو نا.....''
''محبت کا تو پتا نہیں۔'' وہ چاہتا تو اسے ٹوک سکتا تھا کہ ایسے نجی سوال کرنے سے باز رہے مگر ان دونوں کے مابین نامحسوس انداز سے استوار ہو جانے والے دوستانہ تعلق نے اسے ایسا کرنے نہ دیا اور وہ تھکے تھکے سے لہجے میں کہہ گیا۔ ''پر کسی پر اعتبار کیا تھا۔''
''سی.....'' کپ میں چائے انڈیلتی خولہ اپنے ہی ہاتھ پر کھولتی ہوئی چائے گرا بیٹھی تھی۔ سولیوں سے بے اختیار سسکاری سی برآمد ہوئی۔ تاہم وہ فوراً ہی خود پر قابو پا کر اس بار پورے دھیان سے چائے کیتلی سے کپ میں انڈیلنے لگی۔ جب کہ بی زی شرر سے کہہ رہی تھی کہ۔
''اعتبار بھی تو محبت ہی کی ایک شکل ہوتی ہے۔''
''یہ تمہاری کسی فلم کا ڈائیلاگ ہے؟''
''میرا مذاق اڑا رہے ہو؟'' بی زی متاسف ہوگئی۔
''تمہارا نہیں اپنا۔'' وہ خود پر ہنستے ہوئے بولا۔ ''دیکھو تو میں یہ بات سمجھ ہی نہیں پایا اور بس بن گیا بے وقوف۔''
''تم جیسے زیرک کو بھلا کون بے وقوف بنا سکتا ہے؟'' اسے واقعتاً حیرت ہوئی۔
''تم یہ سن کر تحیر میں پڑ گئی ہو نا؟'' وہ خود اذیتی سے لبریز لہجے میں بولا۔ ''میں بھی حیران رہ گیا تھا۔ بہت دن تک تو یقین ہی نہ آیا کہ یہ واردات میرے ساتھ ہو چکی ہے۔ اور جب آیا تو..... تو۔''
یہاں تک کہہ کر اس کی زبان لڑکھڑا سی گئی۔
''تو؟'' بی زی کو سب جان لینے کی جلدی تھی سو بے صبری سے بولی۔
''تو؟'' وہ آزردگی سے ہنسا۔ ''تو پھر وہ یقین کسی منہ زور کالی آندھی کی مانند اپنے ساتھ میری ذات کا سارا غرور۔ میرا چین۔ میرا قرار۔ بھروسا اور اعتبار ہر شے سے اڑا لے گیا۔''
اور وہ؟ وہ یہ سب سن لینے سے قبل مر جانا چاہتی تھی مگر۔
''ہر شے سے؟'' بی زی نے پوچھا۔
''ہاں، ہر شے سے۔'' وہ سپاٹ لہجے میں اقراری ہوا۔
''اور..... اور کیا اس سے بھی؟'' یہ سوال نہیں، دو منہی خنجر تھا جو بی زی نے سیدھا اس کے دل میں پیوست کر ڈالا اور یوں دل میں وہ درد اٹھا، وہ درد اٹھا کہ وہ دیوانوں کی طرح قہقہہ بار ہو گیا۔ اور پھر فرزانگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس سوال سے کنی کترا کر ایک دم ہی اپنی جگہ سے اٹھا اور بنا کچھ کہے سنے وہاں سے نکلتا چلا گیا۔
اور خولہ کہ جس کے جسم پر ہولے ہولے پہلے ہی لرزا طاری تھا۔ وہ پورے قد سے معاً زمین پر آ گری تھی۔

☆☆☆

''یہ دنیا کا عیش و آرام، رونق میلے سب عارضی، سب فانی ہیں، ہمارا اصل ٹھکانہ تو وہ ہے، جہاں ہم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے لوٹ کر جانے والے ہیں۔''

وہ آہستہ سے چلتا قبرستان کے مرکزی دروازے سے باہر نکل آیا تھا۔ اور اس کا ہر بڑھتا قدم اسے گزشتہ منظر سے پرے اور اگلے منظر کے قریب تر کرتا چلا جا رہا تھا۔

ماضی کا وہ منظر کہ جس میں وہ خود کو اپنے محلے کی مسجد کے اندرونی حصے میں براجمان دیکھ رہا تھا۔ آج سے قبل وہ نماز پڑھ کر یہاں سے فوراً ہی روانہ ہو جاتا تھا پھر آج یہاں کیوں بیٹھ گیا تھا؟

شاید اس لیے کہ اس کے الاؤ میں پڑے دل کو قرار اب بھی نہ تھا اور اس کا سکون جہاں ''دفن'' تھا وہاں کا راستہ تو اس وقت اس سرگوشی نے روک دیا تھا کہ جسے یاد کر کے آج بھی اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔

بہر کیف وہ ان دنوں اپنی ماں کو کھو دینے کے ''ٹراما'' میں تھا۔ اس کا ذہن کسی طور یہ قبول کرنے پر آمادہ ہی نہ ہو پا رہا تھا کہ وہ اب کبھی بھی اس مہربان ہستی کو نہ دیکھ پائے گا کہ جس کا معزول ہوتے ہوئے بھی محض ''ہونا'' ہی اس کے لیے بہت تھا اور اب جب کہ وہ نہیں تھیں تو۔

بس ایک بار ایک بار وہ انہیں دیکھنا چاہتا تھا کہ آخر وہ ہیں تو ہیں کہاں؟ بظاہر یہ ایک ماورائے عقل، بالکل ہٹ تھی۔ ہاں تھی مگر وہ اپنے دل کا کیا کرتا جو اس ہٹ کو پورا کرنے کے لیے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر روئے چلا جاتا تھا۔ سو وہ بڑی بے چینی سے صوفی صاحب کا درس سننے گیا یہاں تک کہ مجلس اپنے اختتام کو پہنچی اور رفتہ رفتہ سارا ہال خالی ہو گیا مگر وہ اپنی جگہ جوں کا توں بیٹھا رہا۔ تب صوفی صاحب جو اٹھ کر اپنے کمرے کی جانب جانا چاہ رہے تھے، اس کی جانب متوجہ ہوئے اور بہت محبت سے اسے مخاطب کیا۔

''کیا بات ہے بیٹے؟ گھر جانے کا ارادہ نہیں ہے؟''

''آپ نے ابھی کہا کہ ہمارا اصل ٹھکانہ تو وہ ہے جہاں ہم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے لوٹ کر جانے والے ہیں؟'' اس نے صوفی صاحب کے استفسار کا جواب دینے کے بجائے بہت اضطراب سے پوچھا تو اس بار صوفی صاحب نے بہت غور سے اس کی آنکھوں سے مترشح وحشت اور چہرے پر پھیلی بے سکونی کو دیکھا۔ پھر بہت شانت سے گویا ہوئے۔

''یہ میں نے نہیں کہا بیٹے۔ اس حقیقت سے تو اللہ نے اپنی کتاب میں بار بار ہمیں متنبہ کر رکھا ہے۔''

''اصل ٹھکانہ۔'' وہ بڑبڑاہٹ نما لہجے میں بولا۔ ''یعنی جنت یا پھر دوزخ؟''

''ہاں۔'' صوفی صاحب خوف خدا سے لرزتے ہوئے بولے۔ ''جنت یا پھر وہ جہنم۔ جو ہم یہاں سے کما کر اپنے ساتھ لے جائیں گے۔''

''میری امی کا انتقال ہو گیا ہے۔'' دفعتاً وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر دیوانگی سے صوفی صاحب کے نزدیک آ بیٹھا۔ ''اور میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ وہاں پر کس جگہ ہیں؟''

''اول تو اللہ نے اس راز سے پردہ اٹھانے کا کوئی راستہ ہمیں نہیں بتا رکھا۔'' وہ صدمے میں تھا۔ گہرے صدمے میں۔ اتنا تو وہ اچھی طرح جان گئے تھے سو اسے سمجھانے کی غرض سے متانت سے بولے۔

''اور فرض کرو تم کسی طور پر جان گئے، تو کیا کرو گے؟''

''بس مجھے سکون حاصل ہو جائے گا کہ وہ اچھے ٹھکانے پر پہنچ چکی ہیں۔''

اس کے لہجے سے عیاں بے بسی آمیز بے قراری پر صوفی صاحب افسردہ خاطر سے ہو گئے۔ بولے۔

''اور خدانخواستہ اگر معاملہ اس کے برعکس ہوا تو... تو کیا کرو گے بیٹے؟''

"ہاں تو کیا کروں گا؟" یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا تب ہی ہراساں سا ہو کر ان سے پوچھا۔ "تو آپ ہی بتا دیجیے۔ مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

"سب سے پہلے تو خود کو اللہ کی رضا میں راضی کرنے کی کوشش کہ راضی برضا ہونے سے بڑی نعمت ابن آدم کو عطا نہیں کی گئی۔" وہ شفیق سے لہجے میں بولے۔ "اور اس کے بعد وہ اعمال اختیار کرو جو اس جہاں میں تمہارے والدین کے درجات کی بلندی کا سبب بن سکیں۔ اس یقین کے ساتھ کہ جلد یا بدیر..... بالآخر تم نے بھی ایک روز ان سے جا ملنا ہے کہ ہم سب اس کے ہیں اور ہمیں اس کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔"

☆☆☆

"کہنے لگیں بس یہی بات مجھے تمہاری مدر سے کرنی ہے ہاہاہا۔"

شریفہ سے ملاقات کے اگلے دن وہ وردی کے پاس چلا آیا تھا۔ اور اب اس کے ساتھ بیٹھا وہاں کی روداد سناتے ہوئے شریفہ کا مسخرا اڑا رہا تھا۔

"تم..... تم کو شہ عافیت گئے تھے؟" ظاہر ہے کہ وہ یہ جان کر سراپا بے چین ہو گئی۔

"گیا تھا تو تمہاری اس لیڈی شریفہ سے بات ہوئی نا۔" وہ بدتہذیبی سے بولا تو نجانے کیوں اسے کچھ اچھا نہیں لگا۔ چنانچہ کچھ کم صم سی ہو کر پوچھنے لگی۔

"سب..... سب کیسے ہیں وہاں؟"

"سب بڑے ہی ڈھیٹ ہیں۔" وہ مضحکہ اڑانے والے لہجے میں بولا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو؟" وردی کو سخت ناگوار گزرے تھے اس کے الفاظ، تب ہی ٹوکتے ہوئے بولی۔

"ٹھیک کہہ رہا ہوں۔" سہراب کے چہرے کے عضلات تن گئے۔ "اسی لیے تو کسی کو تمہارے بھاگ جانے سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ بس ایک تمہاری نانی ہی غیرت مند تھی اسی لیے مر گئی۔"

"نانی بیگم۔" وردی کو لگا اس کی سماعت نے جیسے اسے دھوکا دیا ہے۔ تب ہی بے یقینی سے پوچھنے لگی۔ "مر گئیں؟"

"ہاں۔" وہ یوں بولا گویا کوئی معمولی اطلاع دے رہا ہو۔ "جس دن تم وہاں سے بھاگی تھیں نا۔ وہ اسی دن مر گئی۔"

اور وردی کو لگا۔ جیسے اس سناؤنی نے اس کے اندر بھی کچھ مار ڈالا ہو۔ وہ روئی، تڑپی نہ چیخی بس ساکت و صامت سی سہراب کی سمت دیکھے گئی۔

"کیوں؟" وہ اس کے غیر معمولی تاثرات دیکھ کر چونکا۔ "تمہیں کیا ہوا؟" اس نے کوئی جواب نہ دیا تھا۔ تب وہ سخت جھلاہٹ زدہ سے لہجے میں اسے باقاعدہ حکم دیتا ہوا بولا۔

"دیکھو، اب رونا دھونا مت شروع کر دینا۔ میرے پاس آج وقت بہت کم ہے۔ میں دو پیار بھرے پل تمہارے ساتھ گزارنے آیا ہوں اسے یوں منہ بنا کر برباد مت کرو۔ سنا نہیں تم نے؟" اسے ٹس سے مس نہ ہوتے دیکھ کر وہ چیخا۔ "اٹھو اور جا کر وہ سفید لباس پہن کر آؤ جو میں تمہارے لیے لے کر آیا ہوں۔"

ہاں آج ہی تو صحیح موقع تھا یہ رنگ پہننے کا۔ سو وہ کسی مشین کی طرح چپ چاپ اپنی جگہ سے اٹھی اور اس کے حکم کی تعمیل کو اندر کی سمت بڑھ گئی۔

☆☆☆

"میرے اللہ..... میرے اللہ۔"

اسے لان سے کس نے اٹھا کر کمرے میں پہنچایا وہ نہیں جانتی۔

اور وہ کب تلک دنیا و مافیہا سے بے گانی رہی۔ وہ یہ بھی نہیں جانتی۔ ہاں مگر ذہن کے بیدار ہوتے ہی وہ اتنا

ضرور جان گئی کہ کسی احساس نے ایسے ماہی بے آب بنا رکھا تھا۔
تڑپی تو وہ پہلے بھی کئی مرتبہ تھی مگر اس طرح نہیں جیسا کہ آج۔ یوں لگتا تھا گویا کسی نے پورے وجود پر کچوکے لگا کر نمک پاشی کر دی ہو۔
اور یہ مثال بھی شاید نا کافی تھی اس اذیت کو بیان کرنے کے لیے۔
اس سے جو کچھ وہ محسوس کر رہی تھی وہ جانتی تھی یا پھر اس کا رب۔ سو وہ کرلا کرلا کر اسے ہی پکارے چلی جاتی تھی۔
رات کا غالباً آخری پہر تھا۔ کمرے میں پھیلی سبز رنگ کی مدھم سی روشنی میں اپنے بستر پر دراز بی ذی گہری نیند میں معلوم ہوتی تھی وگرنہ عام طور پر تو وہ ذرا سی آہٹ پر بھی چونک کر اس کی جانب دیکھا کرتی تھی۔
اور یہ ایک طرح سے بہتر ہی تھا کہ اس کا سارا وجود اس وقت ہچکیوں کی زد میں تھا اور ایسے میں اگر بی ذی جو اس کی گریہ وزاری کا سبب پوچھ لیتی تو وہ بھلا اسے کیا جواب دے پاتی؟
''یہ میں نے کیا ظلم کر دیا میرے رب۔ یہ مجھ سے کیا ہو گیا؟''
ضمیر کا بوجھ کائنات کا سب سے بھاری بوجھ ہے۔ جسے ڈھونے والے بخوبی واقف ہیں کہ اس بار کو اٹھانے میں جان، چاہ کر بھی نہیں نکلتی سو وہ بھی اس سے جان کنی کی کیفیت میں تھی۔
''کیا کروں میں کیا کروں؟'' وہ رب کے حضور سجدہ ریز ہونا چاہتی تھی کہ شاید یوں ہی قرار مل جائے مگر عرق ندامت میں یوں ڈوبی تھی کہ اس کے سامنے جانے کی ہمت ہی نہیں ہو پا رہی تھی کہ۔
وہ لم یلد صرف اسی کا خالق تو نہیں تھا۔
''کیا کروں میرے رب..... میں کیا کروں؟''
وہ ہر شے سے ماورا بے اختیاری میں تادیر ایک ہی جملے کی گردان کیے گئی اور پھر ایک دم تھم گئی کہ اسے من بھیتر سے جواب مل چکا تھا۔

☆☆☆

''آخر ایسی کون سی جگہ رکھ کر گئی ہیں وہ کاغذات کہ مل ہی کر نہیں دے رہے۔'' قبرستان سے واپسی پر اس کا دل گھر لوٹنے کو نہیں چاہ رہا تھا سو وہ ایک چائے کے ڈھابے پر آ بیٹھا اور اپنے لیے ایک کٹ کا آرڈر دے کر بہت خاموش نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا کیا۔
کوئی کھانا کھا رہا تھا تو کوئی چائے پی رہا تھا۔ کوئی اونچائی پر دھرے ایکس ایچ کے رنگین ٹی وی پر چلتی پاکستانی فلم بڑے ذوق وشوق سے دیکھنے میں منہمک تھا تو کچھ لوگ آپس میں بحث کرنے میں مصروف۔
ایک منظر کہ جس میں وہ ابھی موجود تھا اس کے پس منظر میں طلوع ہو رہا تھا ایک ایسا منظر کہ جس میں وہ نہیں تھا۔ ہاں مگر عامر اور رینا۔
جس وقت وہ صوفی صاحب کے پاس بیٹھا تھا وہ دونوں اس کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا کر فیروزہ کے کمرے کی تلاشی لینے چلے آئے تھے۔
اور پچھلے آدھے گھنٹے سے گھر کے کاغذات کو ڈھونڈنے میں بے طرح سرگرداں تھے۔ دونوں الماریاں، سنگھار میز، ڈیوائیڈر، سب ہی کچھ تو چھان مارا تھا اور کاغذات تھے کہ پھر بھی مل کر نہ دے رہے تھے۔ اور اب عامر جھنجھلاہٹ کا شکار ہو گیا تھا کہ تب ہی رینا کسی خیال کے تحت گویا ہوئی۔
''تمہاری امی ڈھاکہ سے آئے نوٹ گدے کے نیچے چھپا چھپا کر رکھتی تھیں۔ ایک بار وہاں بھی نظر ڈال لو.....''
''ارے چھوڑو۔'' عامر اکتاہٹ زدہ، پریشان لہجے میں بولا تو پھر ساتھ ہی پلنگ پر پڑا بہت موٹا اور بھاری سا گدا چہار اطراف سے اٹھا اٹھا کر اس کے نیچے نظریں ڈالے گیا۔ ''گدے کے نیچے اسے کہاں ارے.....''

دفعتاً اس کی آنکھیں چمک اٹھیں کہ سرہانے واقعی ایک مٹیالے سے سفید رنگ کی فائل پڑی ہوئی تھی۔
''اٹھاؤ۔'' رینا شادی مرگ کے سے لہجے میں بولی۔ ''اسے جلدی سے اٹھا کر دیکھو کیا ہے؟''
''ہاں..... ہاں۔'' عامر نے لپک کر وہ فائل اٹھالی اور وہیں کھڑے کھڑے اسے کھول کر دیکھا۔ وہ واقعی اس گھر کے کاغذات تھے۔
''اب دیکھتا ہوں اس گھر پر کوئی کیسے دعوا کرتا ہے۔'' اس نے رعونت سے مسکرا کر فائل بند کی اور ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑ کر باہر کی راہ لینے ہی لگا تھا کہ تب ہی رینا نے ٹوکا۔
''ارے..... رے رے۔ یہ پوری فائل کہاں لے جارہے ہو؟''
''اپنے پاس سنبھالنے اور کہاں؟''
''تم بھی پورے کھامڑ ہی ہو۔'' رینا اس کے نزدیک آکر شاطرانہ لہجے میں بولی۔
''اس پوری فائل کو اپنے پاس رکھنے کی کیا ضرورت ہے؟ خوامخواہ اسے سنبھالنے میں ہلکان رہو گے۔ بس درمیان سے دو چار نہایت اہم کاغذ نکال لو۔ جب کاغذات ہی مکمل نہیں ہوں گے تو کوئی اس فائل کا اچار ڈالے گا؟''
مشورہ اس کا لاجواب تھا سو عامر نے اسے داد دیتی نگاہوں سے دیکھا اور پھر فوراً ہی اس کے نادر مشورے کو عملی جامہ پہنانے کا ارادہ کرلیا تھا۔

☆☆☆

''پڑھتے آئے تھے کہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں، جب کہ آج وہ وقت آچکا کہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ وہ جہاں کیسے کیسے اور درحقیقت ان کی موجودگی کا سبب کیا ہے؟''
آتش چاہتا تھا کہ اس ہفتے کا لیکچر شرر خود تیار کرے کہ یوں بھی اس کے مہیا کردہ لیکچرز کا تو پچھلے ہفتے ہی اختتام ہوگیا تھا لہٰذا اب لیکچر کے مواد کی تیاری بھی اس نے شرر کو تفویض کردی تھی۔ اس ضمن میں آتش نے اسے اپنے کتب خانے سے استفادے کی خصوصی اجازت بھی مرحمت فرمادی تھی، سو یوں وہ اس وقت لکھنے کی میز پر سر آتش کی مخصوص کرسی کے مقابل براجمان کاغذ قلم لیے بیٹھا کچھ لکھنے کی کوشش کررہا تھا۔ آتش نے اسے چند کتب کا حوالہ دیا تھا کہ اگر وہ چاہے تو ان کے متن سے مدد لے سکتا ہے۔
سو وہ ساری خدا بے زار کتابیں میز پر اس کے سامنے دھری ہوئی اسے اپنے ایقان کا، امید کا اور خصوصاً اس تعلق کا مضحکہ اڑاتی محسوس ہورہی تھیں کہ جس پر اسے کبھی سب سے زیادہ بھروسہ ہوا کرتا تھا۔
''تو کیا وہ تعلق محض وہم تھا؟'' اس نے تشنگی سے قلم یوں ہی کھلے صفحات پر دھرتے ہوئے ازحد دل گرفتی سے سوچا۔
''وہم نہ ہوتا تو تمہاری کسی پکار پر تو لبیک کی صدا آتی۔'' کوئی بہت تمسخر سے ہنس کر بولا تھا۔ اس نے کرب سے آنکھیں بند کرلیں۔
اور عین اسی لمحے وہ جو بہت آہستہ سے اس کے عقب میں آکھڑی ہوئی تھی، اس نے کپکپاتی آواز میں اسے پکارا تھا۔
''سس..... سر!''
اور یہ پکار نہیں گویا صورہ اسرافیل تھا جو اس کی سماعتوں میں پھونکا گیا۔
تب ہی اس نے ایک جھٹکے سے آنکھیں کھولیں اور برق رفتاری سے پیچھے مڑ کر دیکھا۔
واقعی قیامت آچکی تھی!

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

ہاجرہ ریحان

مالِ غنیمت

ایسا لگ رہا تھا کہ وہاں ٹولیوں میں یا اکیلے کھڑے ہر ایک شخص کو معلوم تھا کہ میں ان سب میں کیوں شامل ہوں شاید اسی لیے جیسے ہی مجھ سے نظر ملتی ایسے مسکرایا جاتا جیسے کسی ننھے پیارے سے بچے کو چوری کرتے ہوئے پکڑ لیا جائے اور غصہ یا غیض وغضب دکھانے کے بجائے ہونٹوں پر مسکراہٹ خود بخود چلی آئے۔

میں کئی بار جھنجلا کر دل ہی دل میں خالہ جان پر غصہ کر چکی تھی جس قدر میں ایسے ہجوم و جمع سے بچتی ہوں۔ اسی قدر خالہ جان کو شوق ہے کہ مجھے ایسی ہی صورت حال میں پھنسایا جائے۔

جب یہ تمام اجنبی میرے سامنے ہی مجھ پر اس قدر ہنس رہے ہیں تو جس کے انتظار میں یہاں ایک گھنٹے سے کھڑی ہوں وہ مجھے دیکھتے کہ ساتھ ہی کیا کیا نہ سوچے گا؟

یہی سوچے گا کہ ایسی بھی کیا بے صبری، تمہارے پاس ہی تو آ رہا تھا ناں کہیں اور جانے کی غلطی کرنے کی تو کوئی گنجائش ہی نہیں پھر تمہارے اور میرے مشترکہ رشتہ داروں میں کون ایسا جی دار ہے جو تمہاری خالہ جان کے خاندان سے ٹکر لے کر مجھے ان کے گھر پہنچنے سے پہلے ہی بالا بالا اپنے گھر اڑا لے جائے؟

سوچ سوچ کر میں تو شرمندگی کے مارے زمین میں گڑی جا رہی تھی اور خالہ جان کس قدر مزے سے دس اسٹول پر بیٹھی ارد گرد بکھرے لوگوں کو دلچسپی سے دیکھتی پیپر کپ میں گرم چائے کی چسکیاں لے رہی ہیں۔

ایسا لگ رہا تھا جیسے ہم آج زندگی میں پہلی بار ایئر پورٹ پہ کسی کو لینے آئے ہیں۔ ایسے پہلے پہلے پھیروں میں مسافر کو لینے سے زیادہ ایئر پورٹ میں گھومنا پھرنا زیادہ اہم کام لگتا ہے مگر کوئی اس قدر انجان بھی نہیں ہم لوگ۔ کتنی ہی بار خود بھی بیرون ملک آنا جانا کر چکے ہیں اندازہ تو خوب ہے کہ جہاز کے اتر جانے کے بعد بھی مسافروں کو باہر آنے میں اچھا خاصا وقت لگتا ہے اور پھر میں نے تو صبح ہی صبح جہاز کے اترنے کا وقت بھی ایئر لائن سے پوچھ کر ان کو بتا دیا تھا مگر وہ وقت مقررہ سے ایک ڈیڑھ گھنٹہ پہلے سے تیار ہو کر زبردستی مجھے بھی لے کر ایئر پورٹ پہنچ گئیں اور جب میں گاڑی میں سوار ہوئی تو ڈرائیور رحمان بابا کی برابر والی سیٹ پر رکھے اس پلاسٹک کے اسٹول کو دیکھ کر جل ہی تو گئی تھی۔ یعنی خالہ جان کو اچھی طرح معلوم تھا کہ یوں ایک گھنٹہ جلدی پہنچے اور پھر مطلوبہ شخص کی لاؤنج سے برآمد ہونے کے انتظار میں اتنی دیر کھڑے رہنا ان کے لیے ممکن نہ ہو سکے گا تو اپنا انتظام کر کے نکلیں۔

اور میں۔ میں تو ٹھہری بے دام غلام، غریب رعایا، ہاتھ آیا ہوا مال غنیمت۔ مال غنیمت۔ ہاں یاد آیا یہی کہتا تھا وہ مجھے ہمیشہ سے مال غنیمت کہہ کر چڑاتا تھا۔ میں خود بھی اس وقت اردو اتنی اچھی نہ سمجھ پاتی تھی، میں نے ایک دن تنہائی میں بڑے شوق اور تجسس سے خالہ جان سے مال غنیمت کے معنی پوچھے۔ خالہ جان نے کچھ دیر تو مجھے غور سے دیکھا پھر بتایا کہ یہ وہ مال ہوتا ہے جو کسی جنگ کے دوران شکست کھائے لوگ اپنی جان بچا کر بھاگتے ہوئے

اپنے پیچھے چھوڑ جاتے ہیں اور جسے فاتح آپس میں بانٹ لیتے ہیں۔

مال غنیمت کی یہ تعریف سن کر میں کئی روز تک الگ طرح کی احساس کمتری کا شکار ہو گئی تھی، بہت بعد میں اپنے معاشرے پر غور کرنے سے مجھے اندازہ ہوا کہ دراصل ہمارے معاشرے میں ہر عورت عمر کے کسی حصے میں مال غنیمت بن کر ہی رہتی ہے۔

اس کی اردو تو اتنی اچھی نہ تھی کہ ایسا مشکل لفظ بولتا بس نجانے اس نے کہاں سے اور کس سے یہ لفظ سیکھا اور سیکھتے کے ساتھ ہی مجھ پر ہی جڑ دیا اور ابھی تو میں واقعی خود کو مال غنیمت ہی سمجھ رہی تھی جو خالہ جان نے فتح کے بعد بانٹ لینے کا فیصلہ کرلیا تھا، میری مرضی اور خوشی کی پرواہ کیے بغیر۔

مجھے اچھی طرح اندازہ ہو رہا تھا کہ خالہ جان۔ مجھے سزا دے رہی ہیں اور کیا، میرا دماغ ٹھکانے لگا رہی ہیں، مجھے ہوش میں لا رہی ہیں کیونکہ خالہ جان کی مجھ سے اس طرح کی لاپروائی ممکن ہی نہیں۔ جانے نہیں ان کو بیٹھے بیٹھے کیا سوجھی، اچھی بھلی میری زندگی گزر رہی تھی۔ ماسٹرز کے بعد پی ایچ ڈی کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی اور ساتھ میں ایک اعلا فرم میں اچھی پوسٹ پر فائز بھی ہو چکی تھی کہ اچانک خالہ جان کو لگنے لگا کہ اب میری شادی ہو جانی چاہیے۔ صحیح کہتے ہیں خالو جان، خالہ جان کو کبھی بھی نہیں کبھی کچھ بھی سوجھ سکتا ہے اور وہ اس قدر مکمل جامع اور کامل طریقے سے اپنی سوچ دوسروں کے سامنے رکھتی ہیں کہ مجال ہے کہ کوئی کہہ سکے کہ آپ غلط سوچ رہی ہیں۔

لہٰذا جیسے ہی انہوں نے اعلان کیا کہ اب میری شادی ہو گی تو سمجھو سارے خاندان کو لگنے لگا کہ اگر ابھی میری شادی نہ ہوئی تو شاید کبھی نہ ہو سکے

pklibrary.com

گی۔ایک عجیب طرح کا ریلا بہنے لگا۔

رشتہ دار ملنے ملانے تو پہلے بھی آتے تھے مگر اب ان کے ساتھ خاص طور سے بنے سنورے میرے ہم عمر ان کے لڑکے بھی ہوتے۔اور جو لڑکے نہ رکھتے تھے وہ اپنے جان پہچان کے لڑکوں اور ان کے خاندان سمیت چلے آتے اور پھر خالہ جان کا انٹرویو شروع ہوتا۔کیا کرتے ہو؟ کماتے ہو؟ کہاں رہتے ہو؟ باپ دادا کیا کرتے تھے؟ فارغ وقت کہاں بتاتے ہو؟ توبہ استغفار!!! آخر ان سب کو اپنی درگت بنا کر کیا فائدہ ہوتا ہے۔

کبھی جو یہ سب مجھ پر گزرے، مجھ سے ایسے سوالات کیے جائیں تو میں تو شرم سے ہی مر جاؤں۔سنتی آئی تھی کہ لڑکی کو دیکھنے آنے والی خواتین، لڑکی اور اس کے خاندان کو خوب زچ کرتی ہیں جان بوجھ کر ایسے چبھتے سوالات کرتی ہیں کہ لڑکی غصے میں آ کر کچھ بک بک کرے اور یوں ان کو کہنے کو مل جائے کہ لڑکی تو بڑی تیز مزاج کی ہے مگر خالہ جان نے ہمیشہ سے ہوتے آئے معاملات الٹ دیے۔اس میں خالہ جان کے ساتھ ہماری اس ننھیالی جائیداد کا زیادہ ہاتھ تھا جو میرے نانا مرحوم اپنی دونوں بیٹیوں یعنی میری امی مرحوم اور خالہ جان کے نام چھوڑ گئے تھے۔اور پھر میرے بابا مرحوم کی بھی ترکے کی کافی ساری جائیداد ان کی وصیت کے مطابق میرے بالغ ہونے تک خالہ جان کی دسترس میں ہی رہی تھی۔

لڑکی غریب ہو تو رشتے والے گھر آ کر لڑکی پسند کریں نہ کریں ایک عدد احسان ضرور جتاتے ہیں اور یہاں ایسا لگتا تھا کہ جیسے خالہ جان کے دربار میں حاضری مل جانا لڑکے یا اس کے خاندان پر احسان ہو۔امی اور پھر چند سالوں بعد بابا جان کے انتقال کے بعد میں خالہ جان کے ساتھ رہنے لگی تھی۔

جب سے میرے دونوں کزنز یعنی خالہ جان کے لڑکے جو مجھ سے عمر میں کافی چھوٹے تھے برطانیہ پڑھنے گئے، وہ مجھے زیادہ ہی توجہ دینے لگی تھیں، اس سے پہلے بھی مجھے ان کے مزاج میں اپنے لیے ہمیشہ محبت، انسیت اور شفقت ہی ملتی آئی تھی، رکھ رکھاؤ میں بھی خالہ جان کافی سلجھا ہوا اور سہل انداز ہی رکھتی تھیں، ان سے بات کرنا مجھے ہی کیا ہر کسی کو آسان لگا کرتا تھا، لہٰذا جب رشتے تواتر آ کر مایوس جانے لگے تو ان کو اس بے مزہ کر دینے والے مشغلے سے بچانے کے لیے بہت آسانی سے ایک شام ساتھ چائے پیتے ہوئے میں نے ان کو شہریار کے بارے میں بتا دیا تھا۔ ویسے تو خالہ جان کو پتا ہی تھا کہ شہریار میرا کولیگ ہی نہیں یونیورسٹی میں ہم جماعت بھی رہا ہے۔یہ شروع پڑھائی کے دنوں کی بات ہے جب میں بے دھیانی میں دوسری منزل پر واقع فزکس ڈیپارٹمنٹ کی سیڑھیاں اتر رہی تھی اور اس وقت سیڑھیوں پر کئی دوسرے طالب علم بھی اتر چڑھ رہے تھے اور اچانک میرے ہاتھ میں پکڑی مس رشیدہ سے بڑی منت سے مانگی ہوئی نوٹس کی فائل گری تھی اور اس میں موجود سارے صفحے زمین پر گرنے سے پہلے ہی ہوا میں اڑ اڑ کر اوپر سے لے کر نیچے تک سیڑھیوں پر ہر طرف بکھر گئے تھے۔

نئی نئی یونیورسٹی میں آئی تھی مجھے تو آتے جاتے تمام انجان لڑکے لڑکیوں کے درمیان سے جگہ بناتے بکھرے ہوئے صفحات اٹھاتے ہوئے بے حد شرم آ رہی تھی اور مجبوراً بڑی ہی سست روی سے میں صفحات جمع کر رہی تھی کہ میری نظر سیڑھیوں کے نچلے حصے پر اٹک گئی پہلے تو اس نے اشارے سے مجھے صبر کرنے اور رک جانے کا کہا اور پھر بڑی تندہی سے ایک ایک کر کے سارے صفحات جمع کر کے لا کر میرے ہاتھ میں تھما دیے، میرے شکریہ ادا کرنے پر وہ سنجیدگی سے بغیر کچھ کہے مڑا اور پھر کچھ سوچ کر اسی طرح مجھ سے پیٹھ کیے ہلکے سے بولا۔

”گھر کے بے تکلف ماحول میں تو ہر طرح کا پیراہن چل جاتا ہے مگر یونیورسٹی یا درس گاہ کے پرتکلف ماحول میں جہاں ہر دم بھاگنا دوڑنا اور جگہ جگہ جھکنا بیٹھنا پڑتا ہے اتنی اونچی کرتی اور ایسا تنگ پاجامہ لڑکیوں کو زیب نہیں دیتا۔“

pklibrary.com

اس کے بعد وہ مجھے ادھر ادھر جب بھی نظر آیا تھا۔ ہر بار میں اسے دیکھ کر شوخی سے اپنے موٹے کپڑے کے لمبے ڈھیلے کرتے کو کالر یا گلے سے پکڑ کر ٹھیک کرنے کی ایکٹنگ ضرور کرتی تھی اور وہ بھی زیر لب مسکرا کر آگے بڑھ جاتا۔

پھر میں ایک بار شدید بیمار پڑ گئی تھی اور کئی دن تک یونیورسٹی نہیں جا سکی تھی تو شہریار تقریباً روز ہی میری مزاج پرسی کے لیے آیا کرتا تھا اور اسی دوران اس کی خالو جان کے ساتھ شطرنج کھیلتے کھیلتے کافی اچھی علیک سلیک ہو گئی تھی، خالہ جان بھی اس کو چائے ناشتہ کرائے بغیر جانے نہ دیتی تھیں۔ پھر بھی میرے لیے رشتے دیکھے جانے کی مہم کے دوران میرا شہریار کی طرف اشارہ خالہ جان کو اچھا نہ لگا۔

عادت کے مطابق انہوں نے مجھ سے کوئی سخت بات تو نہ کی مگر ایک طرح کی سرد مہری ان کے انداز میں در آئی تھی۔ مجھے تھوڑا افسوس ہوا تھا میں خالہ جان کو زمانے کی طرح کا نہ سمجھتی تھی، ہمیشہ لگتا تھا کہ خالہ جان مختلف انسان ہیں مگر وہ تو بالکل ویسا ہی سوچتی ہیں جیسا ساری دنیا سوچتی ہے۔

امیر و غریب، اشراف و اسافل، حسب و نسب، آخر یہ سارے پیمانے کیوں کر بنائے گئے ہیں صرف کچھ کو اونچا تو کچھ کو نیچا دکھانے کے لیے یا پھر یوں ہے کہ ہم مذہب، ہم وطن، ہم خیال ہو کر بھی آپس میں فرق رکھنا ہمیں بچپن سے ہی سکھا دیا جاتا ہے یہاں تک کہ ہم اکثر انجانے میں ہی ان لوگوں کی طرف زیادہ کھنچتے ہیں جن کو اپنا ہم پلہ سمجھتے ہیں۔

کتنی عجیب بات ہے کہ غریب خاندان کی لڑکی ایک امیر لڑکے کے رشتے کے آنے پر بنا کسی تذبذب خوش ہو سکتی ہے بلکہ کہیں کہیں تو اسے اپنا حق ہی سمجھتی ہے مگر ایک غریب لڑکا جیسے ہی کسی امیر لڑکی کا خواہاں ہوتا ہے زمانہ جھٹ لڑکے کی نیت پر شبہ کرنے لگتا ہے۔ ایک لڑکا جس نے بچپن سے پڑھائی پر توجہ دی اور بڑی محنت و مشقت کے بعد پڑھ لکھ کر ایک اچھی نوکری پر فائز ہوتا ہی ہے کہ اچانک اس کی زندگی میں ایک اجنبی لڑکی شامل ہوتی ہے اور آتے کے ساتھ ہی یہ مطالبہ کرنے لگتی ہے کہ شوہر کی آمدنی پر صرف اس کا حق ہے مگر ایک امیر لڑکی اگر اپنے غریب شوہر پر خرچا کرنے لگے تو شوہر پر بے غیرت کے طعنے پڑنے لگتے ہیں۔

مجھے اپنی سوچ کے مختلف ہونے کا احساس شہریار کے بارے میں سوچنے اور پھر خالہ جان کی توجہ اس پر کرانے پر ہوا۔

خالہ جان کی سرد مہری نے میرے اندر کے حساس انسان کو مکمل بیدار کر دیا تھا۔ میں عام لوگوں کی طرح نہیں سوچتی، مجھے شہریار کے کم نسب والد، کرائے کے مکان یا اس کی نئی نوکری کی محدود آمدنی سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا آخر امی مرحوم کی دولت میرے ہی کام آنے کے لیے ہے۔ ناں پھر میں خود بھی تو کماتی ہی ہوں۔

مگر خالہ جان کو میرا یہ سب سوچنا کچھ بھایا نہیں تھا اور فیصلہ مجھ اکیلی کو نہیں کرنا تھا۔

گو خالہ جان، میری سگی ماں نہیں تھیں مگر جس محبت اور جانفشانی سے انہوں نے مجھے میرے والدین کے انتقال کے بعد پالا تھا میں ان کی پسند کے خلاف جانے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ میرے دل میں میرے الگ سی ایک کسک بیٹھ گئی تھی جیسے انگلی میں ہلکا سا کانٹا چبھ جائے برداشت کے قابل مگر بہرحال درد مسلسل تھا مگر اس درد کی مدت کا بھی تو کچھ اندازہ نہ ہو پا رہا تھا ایسے میں مجھے جب یہ بتایا گیا کہ ہمیں خالو جان کے بھتیجے کو لینے ایئر پورٹ جانا ہے تو مجھے یقین آنے لگا کہ اب یہ درد تو میری زندگی کا حاصل بننے والا ہے اور مرتے دم تک ساتھ رہنے والا ہے۔

اللہ اللہ کر کے وطن لوٹنے یا خاندان والوں سے ملنے کی خوشی سے لبریز چہروں کے درمیان اس کا ہشاش بشاش اور جاذب چہرہ بھی نظر آ ہی گیا۔ خالو جان کا سگا بھتیجا، خالو جان کی شادی کے چند سالوں بعد ہی خالوں جان کے بڑے بھائی اپنے خاندان سمیت کینیڈا ہجرت کر گئے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ بچپن میں یہ لوگ سال دو سال میں پاکستان آتے ہی تھے

شاید اس لیے بھی کہ اس وقت خالو جان کے والدین حیات تھے اور بیماری کے باعث سفر کرنے سے قاصر تھے۔

والدین نہ رہیں تو شاید وطن سے بھی انسیت جاتی رہتی ہے پھر خالو جان کاروبار کے سلسلے میں کینیڈا جاتے تو اپنے بڑے بھائی کے ہاں ایک دو دن کا قیام ضرور کرتے تھے۔

کافی سالوں بعد یہ پاکستان آیا تھا۔ قد تو اچھا نکال لیا تھا اور آج کل کے فیشن کے مطابق کسرت و ورزش کر کر کے جسم بھی سڈول اور متناسب لگ رہا تھا۔ جیسے امیر ماں باپ کے لڑکوں میں ایک الگ طرح کی بے فکری، مسخرہ پن اور لاپروائی پائی جاتی ہے ان سب صفات سے وہ بھی ہمیشہ سے مالا مال تھا۔ مگر نا جانے کیوں آج اس کی چند حرکتوں یا منہ سے نکلنے والے پہلے چند ہی جملوں سے ایک مغرور، متکبر اور خود پسند انسان کا احساس ہونے لگا۔

اس کے سامان کی ٹرالی گھسیٹنے کے لیے کچھ پورٹر یا قلی آگے بڑھے تو ان کو بڑی نخوت بھرے اشاروں سے دور ہٹا دیا۔ میری کال پر رحمان بابا پہلے ہی گاڑی قریب لا چکے تھے انہوں نے بھی آگے بڑھ کر جب اس سے ہاتھ ملانا چاہا تو اسے بھی جھٹک دیا۔ جیسے ناپاکی کا ڈر ہو پھر سامان گاڑی کی ڈگی میں رکھواتے وقت رحمان بابا کو بار بار ایسے ہدایات دے رہا تھا جیسے کوئی جانور سے بات کرے، بات بھی کرتا جائے اور بات کے سمجھ میں آجانے کی بے یقینی بھی ہو۔

میں اور خالہ جان ایک طرف کھڑے خاموشی سے رحمان بابا کو خندہ پیشانی سے اس کی ہدایات سنتے اور اس کے بیان کردہ طریقے سے سامان ڈگی میں رکھنے کا سارا منظر دیکھتے رہے۔

خالہ جان کا یہ مزہ ہونا بنتا تھا کیونکہ ادھیڑ عمر رحمان بابا کسی اور کے نہیں خالہ جان کے بہت پرانے ملازم تھے اور ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ خالہ جان کی ملازمت میں ان کو ذرا سا سامان سنبھالنا تک نہ آتا ہو پھر یہ بھی اچھوتی بات تھی کہ وہ جو بچپن میں ہر بار اسی ڈرائیور یعنی رحمان بابا کے ساتھ ایئر پورٹ سے آتا یا جاتا رہا تھا اور قیام کے دوران کئی بار میری ہمراہی میں اسی ڈرائیور کے برابر بیٹھ کر آئسکریم کھاتے جاتا رہا تھا۔ اب چند ہی سالوں میں رحمان بابا کو یکسر بھول چکا تھا اور ایسا ظاہر کر رہا تھا جیسے کسی اچھوت سے برہمن پیش آئے۔

"ان کینیڈین کی شاید یادداشت کمزور ہوتی ہے، سردی زیادہ پڑتی ہے ناں وہاں، دماغ جم جاتا ہوگا؟"۔

میرے بڑبڑانے پر خالہ جان نے تاسف سے سر ہلایا اور گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئیں مجھے تو اس کا لگایا یہ تماشا مزے کا لگ رہا تھا اب تک اس کے انتظار میں جو کوفت اٹھائی تھی وہ کافی حد تک رفو ہو چکی تھی۔ سامان رکھوانے کے بعد اس کے فارغ ہونے پر میں نے بیٹھنے کے لیے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا ہی تھا کہ وہ بڑی بے نیازی اور لاپروائی سے میری طرف دیکھے بغیر میرے کھولے ہوئے دروازے سے خالہ جان کے برابر جا بیٹھا، کچھ اس طرح کہ جیسے میں اس کے بیٹھنے کے لیے ہی تو دروازہ کھولے کھڑی تھی۔ فٹ پاتھ سے لگی اپنی گاڑی کے پاس میں ہکا بکا کھڑی رہ گئی اور یقیناً پہلے سے اندر بیٹھی خالہ جان بھی حیران سے زیادہ پریشان ہوگئی ہوں گی۔ وہ تو ویسے بھی تمیز تہذیب کے معاملے میں کافی سنجیدہ طبیعت تھیں۔

ہم نے نکلتے وقت یہ تو سوچا تھا کہ واپسی پر ایک فرد کا اضافہ ہو جائے گا مگر انجانے میں خالہ جان سمیت مجھے اور کہیں کہیں رحمان بابا کو بھی یقین تھا کہ واپسی پر اسٹول سامان کے ساتھ ہی ڈگی میں رکھ کر آگے والی سیٹ اسے دے دی جائے گی۔

ویسے تو ہماری گاڑی بڑی اور کشادہ تھی اور میں چاہتی تو بے تکلفی سے خالہ جان کو تھوڑا سا کھسکا کر خود بھی پیچھے ہی ان کے برابر میں بیٹھ سکتی تھی کہ میرے لیے تو یہ معمول کی بات تھی اکثر آفس سے واپسی پر اسی گاڑی میں دوسری کولیگ لڑکیوں کو قریبی بس

اسٹاپ یا گھر تک چھوڑنے کے لیے میں نے گاڑی میں ٹھس ٹھسا کر ایسے ہی گزارا کیا تھا مگر یہاں بات خالہ جان کی تھی اور ان کا ٹھہرا ہوا، رعب دار اور معتبر وجود میری اس طرح کی بچکانہ حرکت کا متحمل نہ تھا۔

میرا اشارہ پا کر رحمان بابا نے جُو بُو ہو کر سامنے کی سیٹ کا دروازہ کھولا اور میں اس میں جا بیٹھی۔ اور اسی دوران میں نے سنا کہ وہ خالہ جان سے دھڑلے سے انگریزی میں کہہ رہا تھا۔

''تو وے چچی! کہ میں ملازم کے ساتھ بیٹھوں ان لوگوں کا دماغ فوراً خراب ہو جاتا ہے۔ آپ کو چاہیے تھا کہ دوسری گاڑی بھی ساتھ لاتیں یا پھر۔ یا پھر صرف اسے ہی مجھے لینے بھیج دیتیں۔''

کوئی اور وقت ہوتا اور میں آگے بیٹھی ہوتی تو پیچھے ہوتی باتیں تو سن سکتی مگر باتوں کے دوران ان کے چہروں کے تاثرات پڑھنے سے قاصر رہتی۔ میں نے اتفاق سے ہی گردن گھما کر دیکھ لیا تھا ورنہ مجھے کبھی پتا نہ چلتا کہ اس وقت جب وہ اسے کہہ رہا تھا تو اسے کہتے ہوئے اس کی انگلی کا اشارہ رحمان بابا کی طرف نہیں بلکہ میری طرف تھا۔

میری نظر خالہ جان سے ملی اور بلا ارادہ ہی دھندلا گئی اور میں نے جھٹ سے چہرہ گھما کر کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔ یہ سب کیا تھا؟ یہ کس قسم کا تجربہ تھا؟ یہ کیسا جھٹکا تھا؟ جو کچھ بھی تھا مجھے اپنے اندر بہت گہرائی میں جا کر محسوس ہوا تھا اور زندگی میں پہلی بار مجھے اپنے مرحوم والدین کی بڑی شدت سے یاد آئی تھی۔

''ویسے کچھ تو ماما نے مجھے بتایا ہی ہے مگر میں آپ سے بھی پوچھنا چاہ رہا ہوں۔ آخر آپ سب نے مجھے اس قدر ایمرجنسی میں کیوں بلایا ہے؟''

تھوڑی دیر گاڑی میں خاموشی سے سفر کرنے کے بعد اس کی بھاری آواز پھر گونجی۔ وہ مسلسل انگریزی میں ہی بات کر رہا تھا۔

خالہ جان نے کچھ توقف کے بعد اپنے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہنا شروع کیا۔

''دراصل ہم چاہتے تھے کہ منگنی کے اس قدر اہم موقع پر ہمارے خاندان کا کوئی سگا رشتہ دار بھی موجود ہو تو اچھا رہے گا۔ ہم نے تو بھائی، بھابھی سے بھی کہا تھا مگر انہوں نے صرف تم کو ہی بھیج دیا کہ وہ لوگ شادی میں آجائیں گے۔''

سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس نے اترانا نہ چھوڑا اور بے حد شوخی سے پھر چہکا۔

''اوہو واہ بھئی۔ تو مالِ غنیمت کی بھی قسمت جاگ رہی ہے کون ہے وہ بے چارہ انسان جس سے مالِ غنیمت کی منگنی کی جا رہی ہے بھئی۔ ذرا کچھ نام وغیرہ تو بتائیں چچی!''

میں نے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے پہلو بدلا اور گاڑی میں اے سی چلنے کے باوجود ہینڈل پر موجود بٹن دبا کر کھڑکی کا شیشہ اتار لیا۔

پیچھے سے خالہ جان کے گلا کھنکھارنے کی آواز آئی وہ پھر اپنے مخصوص انداز میں گویا ہوئیں۔

''نا صرف مجھے بلکہ تمہارے چچا اور تمہارے دونوں کزنز کو بھی بہت اچھا لگتا ہے۔ بے چارہ کا ہے کو ہوگا، یہ تو وہ فاتح ہے جو اپنی لیاقت، جواں مردی اور بہادری سے مالِ غنیمت کے حق دار بنتے ہیں۔ اس کا ہم جماعت رہ چکا ہے اور اب کولیگ بھی ہے، نام اس کا شہریار ہے، کافی سمجھدار نیک اور تمیز دار بچہ ہے۔ دو چار روز پہلے وہ اپنے والدین کو لا چکا ہے۔ آج شام تمہارے ساتھ میں اور تمہارے چچا شہریار کے گھر جا کر رشتہ قبول کرنے کا پیغام دیں گے اور پھر باقاعدہ دن اور تاریخ بھی طے کر لیں گے۔''

مجھے اچھی طرح اندازہ تھا کہ خالہ جان اس وقت فاتحانہ مسکرا رہی ہوں گی اور وہ حیرت کے مارے کسی پتھر کے بت کی مانند اپنی جگہ جم چکا ہوگا۔

اسی وقت خالہ جان کے گلے لگ کر رونے کی تمام تر خواہش کے باوجود میں نے دوبارہ پیچھے مڑ کر دیکھنے کی غلطی بالکل نہیں کی بلکہ مسکرا کر ہینڈل پر موجود بٹن دبا کر کھڑکی کا اترا ہوا شیشہ واپس چڑھا لیا۔

☆☆

راشدہ رفعت

چوتھی بہو

ناولٹ

بعض شخصیات اسم با مسمّیٰ ہوتی ہیں۔ فہمیدہ بیگم بھی ایسی ہی شخصیت تھیں، نام فہمیدہ بانو تھا تو ایک زمانہ ان کی فہم و فراست کا معترف بھی تھا۔ شوہر کی لگی بندھی آمدنی میں انہوں نے جس سلیقے سے اپنی گھر گرہستی چلائی۔ ایسا ہر عورت کے بس کی بات نہیں۔

چمکتا دمکتا، قرینے سے سجا سجایا گھر، تہذیب یافتہ، سلجھے ہوئے بچے جن کو انہوں نے ہمیشہ اچھا کھلایا اور اچھا پہنایا۔ مہمانوں کے لیے بھی اس گھر کے دروازے ہمیشہ کھلے ہوتے۔

انہوں نے خود سے وابستہ ہر رشتہ مثالی انداز میں نبھایا۔ قدرت نے اس کا صلہ تابع دار اور فرماں بردار اولاد کی صورت میں دیا۔ خیر اولاد تو عموماً والدین کی مطیع و فرماں بردار ہوتی ہی ہے۔

دنیا والوں کو فہمیدہ بانو پر اصل رشک تب آتا جب وہ ان کی بہوؤں کو دیکھتے، فہمیدہ بانو چار بیٹیوں کی ماں تھیں۔ جن میں سے تین بیٹے وہ بیاہ چکی تھیں اور تینوں بہوئیں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔

سب سے بڑے ذیشان کے لیے وہ اپنی چھوٹی نند کے دیور کی بیٹی بیاہ لائی تھیں۔ بوٹے سے قد اور من موہنی صورت والی نگین ساس، سسر کی چہیتی بہو تھی۔ طریقے سلیقے میں اپنی ساس کا پرتو تھی اور یہ سلیقہ ہی اس کے انتخاب کی وجہ بنا تھا۔ اس کے ہاتھ کے ذائقے کی دور دور تک دھوم تھی۔ اس نے کوئی کورس کیے بنا محض یوٹیوب پر، کھانا پکانے کی ویڈیوز دیکھ کر کوکنگ اور بیکنگ میں اتنی مہارت حاصل کر لی تھی کہ اب کوئی بھی دیسی، بدیسی کھانا بنانا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

ذیشان اور نگین کی دو بیٹیاں تھیں نگین۔ اپنی بیٹیوں کے ساتھ ساتھ اپنے دونوں دیوروں کے بچوں کی بھی ہر فرمائش پوری کرنے پر ہر گھڑی کمر بستہ رہتی۔ ایسے ہی تو وہ بچوں کی فیورٹ بڑی مامی نہ تھی ویسے تو تینوں بہوئیں گھر کے کام مل بانٹ کر کرتی تھیں لیکن نگین کا اصل ٹھکانا کچن ہی تھا۔ وہ بہت محبت اور لگن سے گھر والوں کے لیے مختلف پکوان بناتی اور تعریفیں سمیٹتی فہمیدہ بانو اور شکیل احمد بھی ہر گھڑی بہو کو دعاؤں سے نوازتے۔

دوسری بہو کے رتبے پر عروبہ فائز تھی۔ وہ نعمان کی نصف بہتر تھی۔ نعمان فہمیدہ بانو کا دوسرا بیٹا تھا ان کے سب بچوں میں سب سے زیادہ خوب صورت اور وجیہہ اس کے لیے لڑکی کا انتخاب کرتے ہوئے فہمیدہ بیگم کے من میں کہیں یہ خواہش بھی دبی تھی کہ بہو بیٹے کے جوڑ کی ہو۔ خدا نے یہ خواہش عروبہ کی صورت پوری کر دی۔

وہ ان کی بھانجی کے سسرالی رشتہ داروں میں سے تھی۔ بھانجی کی شادی میں ہی عروبہ کی خوب صورتی نے انہیں اپنی جانب متوجہ کیا۔ دراز قد، متناسب دلکش سراپا، تیکھے نین نقش اور سب سے بڑھ کر اس کا پہناوہ، وہ جو بھی پہنتی اس کے تن پر یوں سجتا گویا یہ لباس بنا ہی اس کے لیے ہو، یہ تو فہمیدہ بانو کو بعد میں پتا چلا کہ عروبہ نے یہ شان دار، ملبوسات خود ڈیزائن کر کے خود ہی سیئے ہیں اور نہ صرف اپنے بلکہ اپنی ہم عمر کزنز کے جوڑے اسی نے تیار کیے ہیں۔ ایک تو خوب صورتی پھر یہ ہنر گویا سونے پہ سہاگہ والی بات تھی۔

بھانجی کی شادی کے ایک ماہ بعد ہی فہمیدہ بانو

pklibrary.com

نعمان کا رشتہ لیے عروبہ کے ہاں پہنچ گئیں۔ نعمان میں کس چیز کی کمی تھی، جس کو بنیاد بنا کر وہ انکار کر پاتے۔ فرحین (بھابھی) کی وجہ سے دونوں خاندان پہلے ہی ایک دوسرے کے خاصے قریب آ چکے تھے، سو اس رشتے پر نہایت خوش دلی سے ہاں کر دی گئی یوں عروبہ بھی ان کے آنگن کی رونق بڑھانے ان کے ہاں آ گئی۔

تیسرے نمبر والے ارسلان کے لیے شکیل احمد نے اپنے مرحوم دوست کی بیٹی کا انتخاب کیا تھا۔ فہمیدہ بانو شوہر کے اس انتخاب پر جی جان سے متفق تھیں۔ کشف بچپن سے ہی ان کی دیکھی بھالی تھی۔ اس کے والد کے انتقال کو اب ایک عرصہ بیت چکا تھا اور جس ہمت، حوصلے اور وقار کے ساتھ ان ماں بیٹیوں نے زندگی کی گاڑی کھینچی تھی، وہ اپنی مثال آپ تھا۔

کشف اور اس کی دونوں بہنیں بلا کی ذہین تھیں۔ باپ کا سایہ سر سے اٹھنے کے باوجود انتہائی نامساعد حالات میں انہوں نے اپنا تعلیمی سلسلہ ذہانت کے بل پر اسکالرشپ لے کر کامیابی سے جاری رکھا۔ اس کی دونوں بہنیں اب کامیاب کیریئر وومن تھیں، جنہوں نے شادی کے بعد بھی جاب جاری رکھی تھی۔

کشف بھی ایم ایس سی گولڈ میڈلسٹ تھی لیکن جاب کی نوبت، اس لیے درپیش نہ آئی کہ رزلٹ کے فوراً بعد شکیل احمد اور فہمیدہ بانو نے ارسلان کے لیے اس کا رشتہ مانگ لیا۔ یہ رشتہ بھی تشکر بھرے انداز میں فوراً قبول کر لیا گیا اور نعمان اور عروبہ کی شادی کے فقط ایک سال بعد ارسلان اور کشف بھی رشتہ ازدواج میں بندھ گئے۔

بڑی دونوں بہوؤں کی طرح کشف نے بھی اپنے انتخاب کو غلط ثابت نہ کیا۔ تینوں بہوئیں ایک ہی گھر میں مثالی حسن اتفاق سے رہ رہی تھیں۔

ذیشان اور نگین کی دو بیٹیاں تھیں تو نعمان اور عروبہ کو اللہ نے دو بیٹوں سے نوازا تھا۔ ارسلان اور کشف کے ہاں جڑواں بچے ہوئے تھے، جن میں ایک بیٹی اور ایک بیٹا تھے۔

فہمیدہ بانو اور شکیل صاحب اپنی دوسری نسل کو اپنی آنکھوں کے سامنے، پروان چڑھتا دیکھ کر پھولے نہ سماتے۔ دونوں بڑی پوتیاں، اب بالترتیب ساتویں اور آٹھویں جماعت کی طالبہ تھیں۔ عروبہ کے بیٹے چوتھی اور پانچویں جماعت میں پڑھتے تھے اور بلا کے شرارتی تھے، کشف کی بیٹی بیٹا تیسری جماعت میں تھے۔ سب بچے ایک ہی اسکول پڑھنے جاتے گھر پر پڑھانے کی ذمہ داری کشف کی تھی، وہ بچوں کو قابو کرنے کا ہنر جانتی تھی اور بچوں کو بھی چھوٹی مما کے سوا کسی کا پڑھایا سبق میں نہ آتا۔

گھر کے کام تینوں بہوئیں مل کر کرتی تھیں لیکن تینوں کی مخصوص مہارتیں ان کی مصروفیت کا سامان تھیں۔

نگین جو بچوں کی بڑی کے رتبے پر فائز تھی، اس کا زیادہ تر وقت بچوں کی فرمائشیں پوری کرنے میں کچن میں گزرتا۔

عروبہ سب کی ماما جان تھی، وہ نہ صرف اپنی اور دیورانی جیٹھانی کے کپڑوں کی نت نئی ڈیزائننگ سے سلائی کرتی بلکہ بچوں کے، گھر میں پہننے والے عام کپڑے بھی بہت خاص بنا کر سیتی اور کسی موقع تہوار اور فنکشن پر پہننے والے ملبوسات کی تیاری کے تو کیا ہے کہنے۔ جب ہی بچیاں اس کے پہنے ملبوسات پہن کر خوشی سے اٹھلاتی پھرتیں اور دوسرے لوگ بھی کھلے دل سے اس کے ہنر کو سراہتے تو گویا اس کی ساری محنت وصول ہو جاتی۔

کشف ساری بچہ پارٹی کو پڑھانے کا فریضہ انجام دیتی۔ بچوں کے اچھے گریڈز اس کی محنت کا صلہ ہوتے یوں ایک چھت تلے، سب امداد باہمی کے اصولوں کے تحت بہت ہنسی خوشی زندگی گزار رہے تھے۔

اب فہمیدہ بانو کی فقط ایک آرزو تھی کہ وہ حمدان کے لیے بھی کوئی ایسی ہی اچھی لڑکی ڈھونڈ کر اس کا فرض بھی نمٹا دیں۔ حمدان چاروں بھائیوں میں چھوٹا

تھا بلکہ وہ فہمیدہ بانو کی غیر متوقع اولاد تھا۔ وہ تو اپنی دانست میں تین بیٹے جنم دے کر خاندان مکمل کر چکی تھیں، ارسلان کے سات سال بعد اللہ نے ایک بار پھر ان کی گود ہری کر دی وہ تو لیڈی ڈاکٹر کے منہ سے یہ خوش خبری سن کر ٹھیک ٹھاک متوحش ہو گئی تھیں۔ ذیشان اور نعمان نے اچھا خاصا قد نکال لیا تھا اب اس عمر میں ایک اور بچے کی ماں بننا انہیں معیوب کر رہا تھا پھر شکیل احمد نے انہیں سمجھایا "رب کی رحمت پر پریشان ہونا بھی کفران نعمت کے زمرے میں آتا ہے۔ اور ہو سکتا ہے نیک بخت اس بار اللہ بیٹی سے ہی نواز دے۔"

شوہر کو بیٹی کی شدید خواہش تھی اور وہ اس بار بیٹی کی امید باندھ کر خوب خوش ہوئے جا رہے تھے۔ خیر مقدر میں اس بار بھی بیٹا ہی لکھا تھا۔ صابر شاکر میاں بیوی رب کی رضا میں راضی ہو گئے۔

وقت گزرنے کا کب پتا چلتا ہے، اب خیر سے حمدان بھی پڑھ لکھ کر اپنے پاؤں پر کھڑا ہو چکا تھا فہمیدہ بانو اس کی جلد از جلد شادی کی متمنی تھیں لیکن جو مرحلہ بڑے تینوں بیٹوں کی دفعہ پلک جھپکتے میں سر ہو گیا اس بار اتنا ہی دشوار معلوم ہو رہا تھا۔ لڑکی دیکھنے کے بہانے گھر گھر جھانکنے کی انہیں عادت نہ تھی۔ اور قرب و جوار میں کوئی ایسی لڑکی نظر نہ آتی جس پر ان کا دل ٹک جاتا۔

بہر حال انہیں رب کی رحمت سے امید تھی کہ جلد ہی انہیں، وہ اچھی سی لڑکی مل جائے گی جس کو وہ بیٹی بہو کے درجے پر فائز کر سکیں۔ فی الحال وہ اپنے شوہر، بیٹوں، بہوؤں اور پوتے، پوتیوں کے ساتھ ایک مثالی زندگی جی رہی تھیں اور رب کا ڈھیروں شکر ادا کرتی تھیں۔

☆☆☆

آج بھی عصر کی نماز پڑھ کر، وہ رب کے حضور اپنے گھر کی خیر و برکت اور اپنے بچوں کی عافیت اور سلامتی کی دعا مانگ کر فارغ ہوئیں تو معمول کے مطابق کمرے سے باہر کا رخ کیا۔

شکیل احمد عصر کی نماز کے بعد، مسجد سے ہی اپنے دوستوں کی طرف کا رخ کرتے اور وہ اپنی بہوؤں اور پوتے، پوتیوں کے ساتھ شام کی چائے پیتیں۔ آج چائے میں قدرے دیر ہو گئی تھی وہ کچن میں گئیں تو نگین چولہے کے پاس کھڑی تھی۔

"سوری امی! آج چائے کو تھوڑی دیر ہو گئی۔ بس بچوں کا دل کچھ چٹ پٹا کھانے کو کر رہا تھا، میں چکن پوٹیٹو بالز بنانے لگ گئی۔"

نگین کے معذرت خواہانہ انداز پر وہ شفقت بھرے انداز میں مسکرائیں۔

"بچوں کا تو کیا کہیں، تمہارے ہاتھ کے کھانے کھا کر ہم سب ہی خوب چٹورے ہو چکے ہیں۔"

ساس کی بات سن کر نگین مسکرا دی تھی۔

"آپ چل کر بیٹھیں امی! میں بس چائے لا رہی ہوں اور عروبہ، کشف کو بھی آواز دے لیجیے گا۔ عروبہ دوپہر سے مرحا کا جوڑا سینے بیٹھی ہے۔ پرسوں اس کی بیسٹ فرینڈ کی سالگرہ ہے، جس میں اس نے پارٹی تھیم کے مطابق ڈریس پہن کر جانا ہے۔ میں تو ان فضول کے چونچلوں سے تنگ ہوں مگر اس کی ماما جان ہیں ناں اس کی بے تکی فرمائشیں پوری کرنے کو۔ اور دیکھ لیجیے گا مرحا کا جوڑا تیار ہوتے کے ساتھ ہی ارحا کا فرمائشی پروگرام شروع ہو جائے گا۔" نگین اپنی بیٹیوں پر محبت بھری خفگی جتا رہی تھی۔

"چلو، تمہارا سر کب کھاتی ہیں۔ اپنی چچی سے ہی فرمائش کرتی ہیں ناں۔ تم بھی تو سب کے فرمائشی پروگرام پورے کرنے میں لگی رہتی ہو۔ تم اپنا کام کرو عروبہ کو اس کا کرنے دو۔"

فہمیدہ بانو مسکرا کر کچن سے نکلیں۔ دونوں بہوؤں کو بھی آواز دے کر بلایا۔

عروبہ کا کام ختم ہو چکا تھا وہ لاؤنج میں آ گئی۔ پیچھے پیچھے ہنستی مسکراتی مرحا تھی، اس کی پسند کے عین مطابق شرٹ سل چکی تھی۔ ٹراؤزر کا کیا تھا وہ تو ماما جان دس منٹ میں سی دیتیں۔ اس کے اطمینان اور خوشی کا عجب ہی عالم تھا، اب وہ دادی کے پہلو میں

گھسی انہیں اپنی دوسری تیاریوں سے آگاہ کر رہی تھی۔

"مرحا! اپنی چھوٹی مما کو تو بلالاؤ اور باقی بچوں کو بھی آواز دو۔" نگین چائے کی ٹرالی لیے آ گئی تھی اور کشف کی غیر موجودگی محسوس کرتے ہوئے مرحا کو مخاطب کیا تھا۔

"بس آ رہی ہیں چھوٹی مما۔ کل عرصم کا میتھس کا ٹیسٹ ہے ناں اسی کی تیاری کروا رہی ہیں۔ ہم سب نے تو ہوم ورک کب کا کر لیا، وہ نکما ہی اب تک بیٹھا ہے۔" جاسم نے چھوٹے بھائی کا تذکرہ کیا۔

"بری بات جاسم! ایسے نہیں کہتے۔" اس سے پہلے عروبہ بیٹے کو ٹوکتی نگین نے فہمائشی انداز میں ٹوک دیا۔

"سوری بڑی ممی!" جاسم کو اس وقت پوٹیٹو بائٹر کھانے کی جلدی تھی، سو جھٹ غلطی مان کر سوری بھی کر لی جب ہی منہ لٹکائے عرصم کی آمد ہوئی تھی۔ اس کے پیچھے پیچھے کشف تھی۔

"صرف دس منٹ کی بریک دی ہے چھوٹی مما نے۔ اس کے بعد دوبارہ سے پڑھنا ہے۔"

اس نے منہ بسور کر جملہ حاضرین کو مخاطب کیا مطلب سب کی ہمدردی سمیٹنا تھا۔ سب ہی مسکرا دیے۔ دنیا بھر کی شرارتوں کے موجد اور چیمپئن عرصم کی پڑھائی سے کس قدر جان جاتی تھی، اس سے کون واقف نہ تھا یہ تو کشف ہی اس کے کان کھینچ کر اسے زبردستی پڑھنے کے لیے بٹھا کر رکھتی تھی اور کام یاد ہونے سے پہلے چھٹی ملنے کا تو سوال ہی پیدا ہی نہ ہوتا تھا۔

"ٹھیک ہے ناں۔ پہلے اچھے طریقے سے اپنا ٹیسٹ یاد کرو۔ پھر رات تک تمہارے پاس ٹائم ہوگا ناں شرارتوں کے لیے۔"

نگین نے پیار سے اس کے گال کھینچے۔ سب ہنس پڑے تھے اور فہمیدہ بانو اپنے آشیانے کی رونق دیکھ کر جی ہی جی میں خدا کا شکر بجالائی تھیں۔

☆☆☆

چھٹی کا دن تھا۔ آج فہمیدہ بانو کے چاروں بیٹے بھی گھر پر موجود تھے۔ نگین نے سسر کی فرمائش پر بڑے کے پائے بنائے تھے۔ ناک بھوں چڑھانے والے بچوں کے لیے چکن فرائیڈ رائس کا بھی اہتمام تھا۔ خوش گوار ماحول میں کھانا کھایا جا رہا تھا جب ماہ نور کی آمد ہوئی۔ وہ فہمیدہ بانو کے دیور کی بیٹی تھی جن کا قریب ہی گھر تھا۔

فہمیدہ بانو کی دیورانی ان کے بالکل برعکس تھی۔ نہ طریقہ، نہ سلیقہ اور نہ ہی رشتے نبھانے کا فن نورین جب تک مشترکہ خاندانی نظام میں، بھرے پرے گھر کا حصہ تھیں گھر میں کسی سے بھی ان کی بن نہ پائی تھی۔ اگر جیٹھانی سے تعلقات ٹھیک تھے تو اس کا سو فی صد کریڈٹ فہمیدہ بانو کو ہی جاتا تھا، جنہوں نے فہم و فراست سے کام لے کر کبھی بھی تعلقات میں بگاڑ پیدا نہ ہونے دیا تھا۔ اگر گھر کے چند اضافی کام کرنے سے گھر کی پرسکون فضا برقرار رہ سکتی تھی تو انہوں نے وہ کام کرنے میں کبھی عار نہ سمجھا۔ ہاں ان کی دوسری دیورانیاں اور بن بیاہی نندیں ضرور نورین سے خار کھاتی تھیں۔

نورین کی کام چوری اور بے ڈھنگے پن پر اکثر ہی کوئی نہ کوئی نورین سے الجھ پڑتا، خیر یہ بیتے وقتوں کی باتیں تھیں جب فہمیدہ بانو کے اپنے بچے بھی اتنے بڑے نہ تھے۔ ساس، سسر کے انتقال اور نندوں کی شادی کے بعد آبائی گھر فروخت کر کے سب بہن بھائیوں میں ترکہ تقسیم ہو گیا۔

اس کے بعد ہی فہمیدہ بانو نے اپنے آشیانے کی بنیاد رکھی تھی۔

شوہر کا بھتیجی کے ساتھ پیار بھرا مشفقانہ رویہ دیکھ کر انہیں، کبھی کبھار خدشہ ستانے لگتا کہ وہ جہان کے لیے ماہ نور کا نام نہ لے دیں۔ ماہ نور سے انہیں ذاتی طور پر کوئی پرخاش نہ تھی لیکن وہ جس ماں کی بیٹی تھی، یہ حوالہ ہی اسے بہو کے طور پر زیر غور نہ لانے کے لیے کافی تھا۔ پھر اس میں کوئی ایسی خوبی نہ پائی جاتی تھی جو اسے سب میں ممتاز کرتی ہو۔

گھر داری کرنے والی عام سے لڑکی جو فارغ وقت کسی ہنر سیکھنے میں، لگانے کے بجائے ڈائجسٹ پڑھنے میں لگا دیتی تھی اور ان ڈائجسٹوں کی رومانوی کہانیاں پڑھ کر، کسی لڑکی نے کیا سیکھنا تھا یہ فہمیدہ بانو کی رائے تھی، اگرچہ آج کل ماہ نور نگین سے کوکنگ سیکھنے میں کچھ دلچسپی لے رہی تھی پھر بھی اس کا کھڑا پا، فہمیدہ بانو کے طے کیے ہوئے معیار سے بہت کم تھا۔

''بیٹا جی! آج کیا بنا لائی ہو۔ ویسے بہت اچھے وقت پر آئی ہو۔ پہلے کھانا کھاؤ، پھر ہم تمہارا لایا ہوا چکھیں گے۔''

شکیل احمد، بھتیجی کے ہاتھوں میں ڈھکی ہوئی پلیٹیں دیکھ کر پیار بھرے انداز میں مخاطب ہوئے۔

''نگین بھابھی سے ریسپی پوچھ کر گلاب جامن بنائے تھے میں نے سوچا، بھابھی کو چکھا کر ان کی رائے لوں۔'' وہ جھینپے جھینپے انداز میں مخاطب ہوئی تھی۔

''ارے واہ سوئٹ ڈش کا اہتمام اپنے آپ ہو گیا۔'' میٹھے کا شوقین حمدان چہکا تھا۔ فہمیدہ بانو نے اپنے چہکتے بیٹے پر ایک نگاہ ڈالی، جانے کیوں انہیں وہم ستانے لگا تھا کہ ماہ نور کو دیکھ کر حمدان کی آنکھیں بھی چمکنے لگتی ہیں۔

''آؤ ماہ نور! تم کھانا تو شروع کرو پھر تمہارا میٹھا بھی چکھیں گے۔''

نگین نے اسے زبردستی کھانے کے لیے بٹھایا بہت خوش گوار ماحول میں، ہنستے مسکراتے کھانا کھایا گیا لیکن آج فہمیدہ بانو کے مزاج کی بشاشت مفقود تھی۔ انہیں ہمیشہ سے ہی اپنی چھٹی حس پر بڑا بھروسا تھا اور آج یہ چھٹی حس کچھ اچھے اشارے نہ دے رہی تھی۔

''بس اب اور دیر مناسب نہیں حمدان کے لیے جلد از جلد لڑکی منتخب کرنی ہی ہوگی۔'' فہمیدہ بانو نے دل میں مصمم ارادہ کر لیا تھا۔

☆☆☆

ان کی چھوٹی نند بھرے پرے سسرال میں بیاہی تھی۔ اس کے جیٹھ دیوروں کی بیٹیاں بلا کی حسین تھیں لیکن اس حسن کے علاوہ بھی ان میں کوئی گن تھا یا نہیں، یہ ہی سن گن لینے وہ فریحہ کے سسرال جا پہنچی تھیں بظاہر مقصد، اس کے بیمار سسر کی عیادت کرنا تھا اصل مقصد ان لڑکیوں کے بارے میں معلومات کا حصول تھا۔ سسر صاحب کی عیادت کے فریضے سے فارغ ہو کر، فریحہ بھاوج کو اپنے بیڈ روم میں ہی لے گئی تھی۔

''آپ یہاں سکون سے پاؤں پھیلا کر بیٹھیں بھابھی! ذرا کچن کا چکر لگا لوں۔ میں آپ کو بتا رہی ہوں کہ آپ نے کھانا کھا کر جانا ہے۔ نعمان کو بھی فون کر کے بتا دیں۔ کبھی دس منٹ بعد آ کر ہارن دے رہا ہو۔'' فریحہ نے کہا۔

وہ نعمان کے ساتھ یہاں آئی تھیں وہ انہیں چھوڑ کر قریب ہی کسی دوست کی طرف چلا گیا تھا اور آج اتنے عرصے بعد، بھاوج کے اپنے گھر آنے پر فریحہ اتنی خوش تھی کہ انہیں کھانا کھائے بغیر جانے دینے والی نہ تھی۔

''کھانے کا تکلف رہنے دو فریحہ! میں جس مقصد کے لیے آئی ہوں میری وہ بات غور سے سنو۔ ٹیلی فون پر کب تسلی سے بات ہو پاتی ہے۔'' وہ اصل مدعے پر آئی تھیں۔

''جی بھابھی! کہیے'' فریحہ قدرے حیران ہوتی ان کے پاس ان آن بیٹھی، تب انہوں نے ان کے دیور کی دونوں اور جیٹھ کی چھوٹی بیٹی کے بارے میں استفسار کیا۔

''حمدان کے لیے آئمہ اور امیمہ..... توبہ کریں بھابھی، سوچا بھی کیسے۔ ایک دم پٹاخہ لڑکیاں ہیں اور جہاں تک سہیل بھائی کی ریکا کا تعلق ہے، ہاں وہ لڑکی واقعی اچھی تھی لیکن آپ نے دیر کر دی اس کا رشتہ اپنے ننھیال میں ہی طے ہو چکا ہے۔'' فریحہ نے ایک ہی باری میں ان کی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

''لو بھلا بتاؤ میں کیا سوچ کر آئی تھی۔ دیکھنے میں تو لڑکیاں بڑی پیاری لگتی ہیں۔'' فریحہ کے پاس

لڑکیوں کی تیزی طراری کے بہت سے قصے تھے۔ فہمیدہ بانو نے تو سن کر کانوں کو ہاتھ ہی لگالیا۔

"ویسے بھابھی ایک بات کہوں ہوں برا تو نہیں مانیں گی۔" فریحہ کچھ جھجکتے جھجکتے مخاطب ہوئی۔

"تمہاری بات کا برا مانوں گی؟" وہ خفا ہوئیں۔

"آپ حمدان کے لیے ادھر ادھر لڑکی ڈھونڈ رہی ہیں۔ ایک بہت اچھی لڑکی آپ کے بالکل پڑوس میں بھی تو ہے۔ وہ کہتے ہیں ناں بچہ بغل میں ڈھنڈورا شہر میں۔ آپ کی نظر ادھر کیوں نہیں گئی۔" فریحہ کی بات سن کر فہمیدہ بانو نے تاجی سے اسے دیکھا بات سمجھ آئی تو حیران رہ گئیں۔

"ماہ نور کی بات کر رہی ہو۔" وہ نند کا اشارہ کیسے نہ سمجھ پاتیں لیکن فریحہ کے لبوں پر ماہ نور کا نام آنا حیران کن ہی تو تھا۔ ماضی میں نورین کے سب سے زیادہ جھگڑے فریحہ کے ساتھ ہی ہوتے تھے اب وہ اسی کی بیٹی کی تعریفوں میں رطب اللسان تھی۔

"حمدان کے لیے ماہ نور سے اچھی لڑکی آپ کو بھلا کہاں سے ملے گی، کتنی پیاری بچی ہے ہماری اپنی ہے۔ پھر اتنی سمجھ دار سچ پوچھیں تو حمدان کا صحیح جوڑ وہ ہی ہے۔"

"تم اس کی ماں کا ماضی بھول گئیں۔ بیٹی کی تربیت ماں ہی کرتی ہے۔ میں نورین جیسی عورت کی بیٹی کو بہو بنانے کا رسک کیسے لے سکتی ہوں فریحہ۔" وہ رسانیت بھرے انداز میں گویا ہوئیں۔

"بلاوجہ کے وہم مت پالیں بھابھی! ویسے تو اب نورین بھابھی کے کس بل بھی نکل گئے ہیں لیکن ماہ نور فطرتاً ماں سے بہت مختلف ہے۔ آپ خود دیکھیں نورین بھابھی کے زمانے میں گھر کا کیا حشر ہوتا تھا۔ اب ماہ نور نے گھر کتنے طریقے سلیقے سے سنوار رکھا ہے۔ چھوٹے بہن بھائیوں کو بھی تمیز، تہذیب، قرینہ سکھا دیا ہے۔"

میں تو اسے دیکھ دیکھ کر حیران ہوتی ہوں، وہ اپنی عمر کی بچیوں کے برعکس کتنی سمجھ دار اور سلجھی ہوئی ہے اور یقین کریں، وہ تو ایک دو بار گھر کی اونچ نیچ سے نمٹنے کے لیے مجھے بھی ایسے دانش مندانہ مشورے دے چکی ہے کہ میں اش اش کر اٹھی میں تو حیران ہوتی ہوں۔

"ایک کنواری بچی کا بیاہتا عورت کو مشورے دینے کا کیا کام بھلا۔ حد ہوتی ہے فریحہ، میں تمہارے پاس کس کام سے آئی تھی اور تم کیا قصہ لے بیٹھیں۔"

انہوں نے بدمزہ ہو کر فریحہ کی بات کاٹی۔ فریحہ بھی ایک لمحے کو چپ ہو گئی شاید احساس ہو گیا کہ بھاوج کے سامنے، بھتیجی کا مقدمہ لڑنے کا کوئی فائدہ نہیں۔

"اتنا بڑا سسرال ہے تمہارا قرب و جوار میں نظر دوڑاؤ اگر کوئی بچی جی کو لگتی ہے تو مجھے بتانا۔ ویسے تو میں نے ناصرہ کی بھی ڈیوٹی لگائی ہے۔ تم تو جانتی ہو گھر گھر تانک جھانک کی مجھے عادت نہیں۔ جس لڑکی پر دل ٹکا ڈائریکٹ رشتہ مانگنے ہی جاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے بھابھی! سرفراز کے بڑے ماموں کی دو، تین پوتیاں ہیں۔ اچھی قابل بچیاں ہیں ان کے بارے میں معلومات لیتی ہوں کہیں بات وات نہ پکی ہوئی ہو تو آپ کو بتاؤں گی۔" فریحہ نے کہا۔

"ہاں بس تمہیں فرصت میں معلومات لے دو۔ میری تینوں بہوویں تو تمہاری دیکھی بھالی ہیں ناں۔ کوئی ایسی ہی باصلاحیت ہنر مند، سلیقہ شعار چوتھی بہو بھی مل جائے تو ہی بات بنے گی۔" وہ تفاخر بھرے انداز میں گویا ہوئیں۔ فریحہ نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

☆☆☆

ماہ نور پھر نگین سے کچھ سیکھنے آئی ہوئی تھی۔ نگین کی اپنی تو کوئی نند تھی نہیں۔ وہ ماہ نور کو مذاق میں اپنی اکلوتی نند قرار دیتی تھی۔ ماہ نور بھی اس کا بڑی بھاوجوں والا احترام کرتی تھی۔

دونوں کے بیچ احترام اور اپنائیت کا بڑا خوب صورت رشتہ پروان چڑھ چکا تھا۔ آج سے پہلے فہمیدہ بانو کو ماہ نور کا بے ضرر وجود نہ کھٹکتا تھا لیکن اب

انہیں گھر میں، اس کی آمد ناگوار لگنے لگی تھی حالانکہ وہ عموماً حمدان کی غیر موجودگی میں ہی یہاں آتی تھی۔ دونوں کا سامنا شاذ و نادر ہی ہوتا تھا لیکن ماہ نور کے گھر آتے ہی، فہمیدہ بانو کی حسیات قدرے چوکس ہو جاتی تھیں۔ آج بھی وہ عین کے پاس دس، پندرہ منٹ کے لیے آئی تھی اس کے جانے کے کافی دیر بعد حمدان گھر آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں شاپر تھا جس میں اس ماہ کے دو ڈائجسٹ تھے۔

''یار جاسم! یہ اپنی نور آپی کو تو دے آؤ۔'' اس نے شاپر جاسم کو پکڑایا۔

''اب ماہ نور کے رسالے لانے کی ذمہ داری تم نے لے لی۔'' فہمیدہ بانو نے قدرے چبھتے ہوئے انداز میں دریافت کیا۔

''ہاں امی! بک شاپ بہت دور ہے ناں۔ پچھلی بار بھی عمر کو ساتھ لے جا رہی تھی میں نے کہہ دیا تھا کہ آفس سے واپسی پر میں لا دیا کروں گا۔ صرف دو ڈائجسٹ خریدنے کے لیے اتنی دور جانے کا تردد کرتی ہے۔'' حمدان نے ماں کے لہجے پر توجہ دیے بغیر عام سے انداز میں جواب دیا۔

''ہاں تو کیا رکھا ہے ان ڈائجسٹوں میں ..... لڑکیوں کو کرنے کو اور بہتیرے کام۔''

''بس اس کا شوق ہے امی! اور آج کے دور میں یہ پڑھنے لکھنے والے شوق قابل قدر ہیں، ورنہ مجھ سمیت جس کو دیکھو اس کی دنیا موبائل سے شروع ہو کر موبائل پر ختم ہو جاتی ہے۔''

حمدان نادانستگی میں ہی سہی، اس کے شوق کو سراہ کر ماں کو مزید چوکنا کر گیا تھا۔ حمدان کے کمرے میں جانے کے بعد بھی فہمیدہ بانو کا ذہن ان ہی سوچوں میں الجھا رہا تھا۔

☆☆☆

فہمیدہ بانو کا گھرانہ قرب و جوار کی ساسوں کے لیے ایک مثالی گھرانہ تھا، لیکن جب ساسیں اس خاندان کی بہوؤں کی ہنرمندی سلیقے اور اتفاق و اتحاد کی مثالیں، بار بار اپنی بہوؤں کے سامنے رکھتی تھیں تو بہوئیں اس تذکرے سے بیزار ہو جاتی تھیں۔

ایسا ہی ایک گھرانہ، قریشی صاحب کا بھی تھا جو برسوں سے پڑوس میں آباد تھا۔ مسز قریشی کی فہمیدہ بانو سے اچھی خاصی علیک سلیک تھی لیکن ان کی دونوں بہوؤں کا یہاں آنا نہ ہونے کے برابر تھا۔ اب انہوں نے اپنے تیسرے بیٹے کی شادی کی تو ان کی تیسری بہو، جوان کی بھتیجی اور من پسند بہو تھی وہ ان کے ساتھ اکثر آ جاتی۔ نغمہ فطرتاً من موجی اور ہنس مکھ سی لڑکی تھی بہت جلد اس کی، عروبہ سے اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی اب وہ ساس کے بغیر بھی اکثر عروبہ کے پاس بیٹھتی تھی۔

اس کی بڑی جیٹھانیاں تو فہمیدہ بانو کی سلیقہ مند بہوؤں سے ٹھیک ٹھاک چڑتی تھیں۔ اتنے برسوں سے ان کا تین، عروبہ وغیرہ سے موازنہ جو کیا جاتا رہا تھا لیکن نغمہ، کھلے دل سے ان کے سلیقے اور ہنر کو تسلیم کرنے کے ساتھ خوب سراہتی بھی تھی۔ عروبہ کی سلائی کی تو وہ خاص طور پر فین تھی۔ اب بھی عروبہ تین کا جوڑا سلائی کر رہی تھی اور پاس بیٹھی نغمہ اس کی ڈیزائننگ دیکھ کر حیرت سے آنکھیں پھاڑ رہی تھی۔

''اللہ عروبہ بھابھی! کس قدر نفاست اور صفائی ہے آپ کے ہاتھ میں۔ جانتی ہیں یہ ہی جوڑا اگر میرا ٹیلر سی کر دے تو کتنے پیسے لے گا؟''

''ہاں درزیوں کے تو آج کل ریٹ ہی بہت ہیں۔'' عروبہ مسکرا کر سادگی سے بولی۔

''ریٹ بھی بہت ہیں اور نخرے بھی بہت۔ منہ مانگی سلائی مانگ کر بھی مجال ہے جو وقت پر جوڑا سی دیں، میرا نیا جوڑا ان سلا پڑا ہے تین دن سے جواد کی منت کر رہی ہوں کہ ٹیلر کے پاس لے جائیں۔ ان کو فرصت ہی نہیں اور مجھے وہ سوٹ اپنے بھائی، بھابھی کی ویڈنگ اینورسری میں پہننا ہے۔ ایک دو دن مزید گزر گئے تو ٹیلر تو سوٹ لینے سے ہی انکار کر دے گا۔ ارجنٹ سینے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' وہ اپنے مخصوص باتونی انداز میں مخاطب تھی۔

''تم اپنا سوٹ مجھے لا دو۔ میں سی دوں گی۔''

عروبہ نے تکلفاً پیش کش کی۔

"ارے نہیں میرا یہ مطلب تھوڑی تھا۔ آپ کے پاس کہاں فرصت ہوتی ہے۔ جب دیکھو آپ سلائی مشین پر بیٹھی ہوتی ہیں کبھی ساس کا سوٹ سلائی کر رہی ہیں تو کبھی دیورانی، جیٹھانی کے پھر گھر بھر کے بچوں کو سی کو پہنانا بھی آپ کی ذمہ داری ایسے میں میں آپ کو اپنا کام بھی سونپ دوں۔" نغمہ نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

"کوئی بات نہیں ایک جوڑے ہی کی تو بات ہے میں سی دوں گی۔ تم شام کو کپڑا اور ناپ کا سوٹ دے جانا۔ جیسا سلوانا ہو وہ بھی بتا دینا۔"

عروبہ نے پرخلوص آفر کی، اس وقت تو نغمہ کچھ تذبذب میں پڑ گئی تھی لیکن آفر اتنی پرکشش تھی کہ وہ مزید انکار نہ کر پائی۔ شام کو وہ اپنا ان سلا جوڑا اور ناپ کا سوٹ دے گئی تھی۔ عروبہ نے دو دن میں ہی سوٹ سی کر اس کے حوالے کیا تو وہ سوٹ کی سلائی اور فٹنگ دیکھ کر نہال ہی ہوگئی۔

"آپ کو جیسا بتایا آپ نے بالکل ویسا سی دیا بلکہ میری توقع سے بھی زیادہ، شان دار کیا کمال کی سلائی ہے آپ کی، بلکہ میں تو کہوں گی کہ میرے ٹیلر سے بھی زیادہ اچھا سیا ہے آپ نے اور آپ منع تو کریں گے لیکن میں آپ کو آپ کی محنت کا معاوضہ ضرور دوں گی۔" نغمہ اپنائیت بھرے انداز میں مخاطب ہوئی۔

"یہ تم زیادتی کر رہی ہو نغمہ! میرے خلوص کا کتنا غلط مطلب نکالا تم نے۔" توقع کے عین مطابق عروبہ خفا ہوئی تھی۔

"آپ کے خلوص کی تو کوئی قیمت ہو ہی نہیں سکتی عروبہ بھابھی! یہ تو فقط آپ کی محنت کا صلہ ہے بلکہ پورا صلہ بھی کہاں جانتی ہیں میرا ٹیلر کتنے پیسے اینٹھتا ہے مجھ سے، میں تو اس کے مقابلے میں آپ کو آدھے پیسے دے رہی ہوں اور یہ میں آپ کو زبردستی دے کر رہوں گی۔ اپنے ہنر کو بے مول مت جانیے۔ اتنی محنت اور اتنا وقت لگا ہے آپ کا۔ یہ آپ کا حق ہے اور اپنا حق تو دھڑلے سے لینا چاہیے۔ اور نہیں تو کیا۔"

نغمہ نے اس کے نہ، نہ کرنے کے باوجود زبردستی پیسے اس کی مٹھی میں تھما دیے تھے۔

"اچھا اب یوں خفگی سے مت گھوریے۔ خود سوچیں، اگر مجھے آئندہ بھی آپ سے کچھ سلوانا پڑا تو میں بنا جھجک سلواتو پاؤں اگر آپ نے پیسے واپس لوٹائے تو آئندہ میں شرم اور جھجک کے مارے آپ سے دوبارہ کچھ سلوا ہی نہیں سکوں گی اور جتنا خوب صورت جوڑا آپ نے مجھے سی کر دیا ہے ناں تو سمجھیں میں تو آپ کی پکی گاہک بن گئی۔"

نغمہ نے مسکرا کر اسے مخاطب کیا اور آئندہ آنے والے دنوں میں اس کی بات کی صداقت ثابت بھی ہوگئی۔

☆☆☆

وہ اپنے کپڑے عروبہ سے ہی سلوانے لگی تھی اور ایک، دو بار کے بعد عروبہ بھی اس سے سلائی کے پیسے لیتے ہوئے نہ جھجکتی تھی۔ نعمان کو پتا چلا تو وہ ذرا دیر کو خفا ہوا تھا۔

"اب تم لوگوں کے کپڑے اجرت پر سیا کرو گی؟"

"کیا ہو گیا ہے نعمان! آپ جانتے ہیں یہ میرا شوق ہے اور اگر میرے ہنر اور میرے شوق کا معقول معاوضہ بھی مل جائے تو اس میں کیا مضائقہ۔ میں اپنے گھر کی چار دیواری کے اندر رہ کر ہی چار پیسے کما رہی ہوں اور سب کو علم ہے کہ یہ میں کسی ضرورت کے تحت نہیں بلکہ صرف شوق شوق میں کر رہی ہوں۔"

اس نے شوہر کو تو مطمئن کر دیا لیکن فہمیدہ بانو کو بھی بہو کا یہ شوق کھلنے لگا تھا۔ نغمہ کے کپڑوں کی سلائی تو نقطہ آغاز تھا اب نغمہ کی بھاوجوں، بہنوں اور بھانجیوں وغیرہ کے کپڑے بھی سلائی کے لیے آنے لگے تھے۔ سب کھاتے پیتے لوگ تھے سلائی دینے میں کوئی بھی کنجوسی سے کام نہ لیتا تھا اور ہاتھ آتا پیسا کس کو برا لگتا تھا۔

عروبہ نے آج تک جو سیا تھا، محض شوق شوق میں اور اپنے آس پاس بسنے والوں کی محبت و مروت میں سیا تھا۔ شادی سے پہلے بہنوں اور کزنز کے کپڑے سیتی تھی تو شادی کے بعد سسرال والوں کے کپڑے سینے لگی۔

پہلی بار احساس ہوا کہ اس کے ہنر کی تو دنیا میں بہت مانگ ہے۔ اپنے ہاتھ کی کمائی کا تو نشہ ہی کچھ اور ہوتا ہے اور عروبہ آج کل اسی نشے میں چور دھڑا دھڑ سلائی میں جتی ہوئی تھی۔ آج کل نغمہ کی بھانجی کے جہیز کے سوٹ سلائی کے لیے آئے ہوئے تھے اور وہ دن رات سلائی میں مصروف تھی۔

''عروبہ بیٹا! یہ تم کس چکر میں لگ گئی ہو۔ نہ کھانے کی پروا نہ آرام کا ہوش۔ یوں تو تم اپنی طبیعت خراب کرلو گی۔'' فہمیدہ بانو نے اسے محبت بھرے انداز میں ٹوکا تھا۔

''کوئی بات نہیں امی! پہلے بھی تو میرا زیادہ وقت سلائی میں ہی گزرتا تھا اب تو میرے ہنر کے صحیح قدر دان ملے ہیں۔ منہ مانگا معاوضہ دیتے ہیں مجھے۔''

وہ بنا سوچے سمجھے تفاخرانہ انداز میں گویا ہوئی فہمیدہ بانو، اس وقت تو خاموش ہوگئی تھیں لیکن انہیں خدشہ ستا رہا تھا کہ عروبہ کا یہ طرز عمل ان کے گھر کی پرسکون فضا میں ہلچل نہ مچادے۔

وہ مارے باندھے اپنے حصے کا کام نمٹا کر اپنی سلائی مشین سنبھال لیتی تھی، اب تو اسے گھر والوں کے کپڑے سینے کی بھی فرصت نہ تھی۔

کشف کی بھانجی کا عقیقہ تھا اس نے عروبہ کو سوٹ سلائی کے لیے دیا۔ پانچ دن تک ان سلا کپڑا شاپر میں ہی بند رہا۔ کشف آتے جاتے بند شاپر پر نظر ڈالتی مگر منہ سے کچھ کہنا، اس کی انا پسند طبیعت کو کبھی گوارا نہ ہوا۔

اتوار کو عقیقہ تھا۔ دو دن پہلے کشف نے خاموشی سے شاپر اٹھالیا شام کو میکے کا چکر لگا تو ماں کے پڑوس میں رہنے والی درزن کو منہ مانگے دام دے کر ارجنٹ نوٹس پر سوٹ سلنے ڈال آئی۔ ہفتے کی شام کو عروبہ کو اس کے جوڑے کا خیال آیا تھا۔

''کشف تمہارے کپڑوں والا شاپر نہیں مل رہا۔ میں فٹافٹ کٹنگ کرلوں۔ فنکشن تو کل شام کا ہے ناں میں کل صبح سی دوں گی۔'' اس نے کشف کو مخاطب کیا۔

''میں نے تو سوٹ سلنے دے دیا ہے بھابھی۔''

''میں نے سوٹ سینے سے انکار تھوڑی کیا تھا۔ تم ایک بار مجھے یاد ہی دلا دیتیں۔'' عروبہ کا منہ بن گیا۔

''بس آپ پہلے ہی اتنا بزی تھیں۔ میں خوامخواہ اپنے سوٹ کی سلائی بھی آپ پر ڈال دیتی۔ امی کی طرف درزن ہے ناں۔ اسی سے سلوالیا۔ آپ ٹینشن نہ لیں۔'' کشف رسانیت سے کہتی ہوئی کچن میں گھس گئی۔

''نہیں سلوایا تو نہ سہی۔ نخرے تو دیکھو۔''

عروبہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی تھی۔ جب سے اسے اپنے ہنر کے دام ملنے لگے تھے اسے یہ احساس ستاتا تھا کہ ماضی میں وہ مفت کی بیگار میں لگی رہتی تھی۔ وہ سر جھٹک کر پھر سے اپنے کام میں لگ گئی اسے کیا خبر تھی کہ گھر کا ایک اور فرد بھی اپنا ہنر آزمانے چلا ہے۔

☆☆☆

اگلے دن کشف ساس، سسر کو رات کے کھانے کے بعد چائے دینے ان کے کمرے میں گئی تو اس نے ان سے پڑوس کے چند بچوں کو ٹیوشن پڑھانے کی اجازت لی تھی۔

''یعقوب صاحب کی بہو آج بچوں کے اسکول میں ملی تھی۔ ہمارے بچوں کا رزلٹ دیکھ کر مجھ سے درخواست کرنے لگی کہ میں اس کے بچوں کو بھی شام میں پڑھا دیا کروں اگر آپ لوگوں کو کوئی اعتراض نہ ہو تو ان بچوں کو ٹیوشن کے لیے بلالوں۔''

اس نے ادب سے پوچھا۔ فہمیدہ بانو تو حیرت سے بہو کی شکل دیکھنے لگیں لیکن ان کے کچھ بولنے

سے پہلے ہی ان کے مجازی خدا بول اٹھے تھے۔

"تمہاری سعادت مندی، بیٹا کہ تم نے ہم سے اجازت لینا ضروری سمجھا ورنہ تمہاری جیٹھانی نے تو ساس، سسر سے پوچھے بغیر سلائی کڑھائی کا کام شروع کر دیا تھا اور ماشاء اللہ تمہارا ہنر تو اس سے کہیں زیادہ اعلا و ارفع ہے۔ علم بانٹنے میں کیسی اجازت۔ اگر اپنے بچوں کے ساتھ محلے کے دو چار بچے بھی پڑھ جائیں تو کیا مضائقہ۔

یعقوب صاحب نے خود آج مسجد میں مجھ سے یہ ہی بات کی تھی اور میں نے انہیں کہہ دیا کہ کل شام سے بچوں کو بھیج دیجیے گا۔" شکیل صاحب بول رہے تھے اور فہمیدہ بانو حیرت سے آنکھیں پھاڑے شوہر کو دیکھ رہی تھیں۔

"بس ٹیوشن فیس کا منہ سے تقاضا مت کرنا بیٹے۔ جو خود سے دیں چپ چاپ رکھ لینا۔" شکیل صاحب نے بہو کو نصیحت کی فرماں بردار بہو نے ادب سے اثبات میں سر ہلا دیا کشف کے جانے کے بعد فہمیدہ بانو شوہر پر خفا ہونے لگی تھیں۔

"مجھ سے مشورہ تو کر لیتے۔ اب گھر میں ٹیوشن سنٹر بھی کھل جائے گا۔" وہ کبیدہ خاطر ہو رہی تھیں۔

"جب گھر میں سلائی سینٹر کھل سکتا ہے تو ٹیوشن سینٹر کھلنے میں کیا مضائقہ ہے۔" شکیل احمد بیوی کی خفگی کو خاطر میں نہ لائے۔

"میں جانتی ہوں آپ کو عروبہ کا کام کرنا پسند نہیں لیکن کشف کو بھی کام کی اجازت دے کر آپ دونوں بہوؤں میں، مقابلہ بازی پروان چڑھائیں گے۔" فہمیدہ بانو کی فہم و فراست انہیں آنے والے وقت سے ڈرا رہی تھیں۔

"تو آپ کا کیا خیال ہے اگر آپ کشف کو اس کا ہنر آزمانے نہیں دیں گی تو اس کا دل میلا نہیں ہوگا۔ گھر کا سکون چاہتی ہیں تو دونوں بہوؤں کے ساتھ منصفانہ برتاؤ کرنا پڑے گا۔" شکیل احمد کی اپنی ہی منطق تھی۔

فہمیدہ بانو جانتی تھیں کہ کشف چونکہ ان کے مرحوم دوست کی بیٹی ہے، اس لیے وہ اپنے دل میں اس کے لیے نہایت نرم گوشہ رکھتے ہیں، اسی لیے اسے خوشی خوشی ٹیوشن پڑھانے کی اجازت دے دی تھی۔

☆☆☆

اگلے دن سے کشف کے پاس ٹیوشن پڑھنے بچے آنے لگے تھے، یعقوب صاحب کے تین پوتوں سے ٹیوشن سینٹر کا آغاز ہوا تھا اور پندرہ بیس دن میں ہی بچوں کی تعداد بڑھ کر نو، دس ہو گئی تھی۔

ٹیوشن سینٹر کے مروجہ اصول کے مطابق قرب وجوار کے سب ہی بچے بنا کہے ایڈوانس فیس لے آئے تھے۔

کشف خوش تھی لیکن فہمیدہ بانو کی توقع کے عین مطابق گھر کا ماحول پہلے جیسا نہ رہا تھا۔ عروبہ اور کشف دونوں ہی انا پسند طبیعت کی مالک تھیں اور ان کی طبیعت اور مزاج کا یہ پہلو تو فہمیدہ بانو پر اب ہی آشکار ہوا تھا۔

کشف نے عروبہ سے اپنے اور بچوں کے کپڑے سلوانا چھوڑے تو عروبہ نے بھی اب اپنے بچوں کو اس کے پاس پڑھانے بھیجنا چھوڑ دیا تھا۔ اسی کالونی میں ان کی اسکول بیچ کا گھر تھا جو اتنا قریب تو نہ تھا مگر عروبہ خود بچوں کو اس کے گھر چھوڑنے جاتی اور خود ہی واپس لاتی۔

گھر کی فضا میں عجیب سا تناؤ در آیا تھا۔ فہمیدہ بانو بہوؤں کے تیور دیکھ کر ششدر تھیں۔ یہ ان کے آشیانے کو کس کی نظر لگ گئی تھی۔

فقط تین ہی تھی جو اب بھی حسب سابق خوش مزاجی کے ساتھ گھر کے کاموں میں مگن رہتی۔

"میری مانو تو نین بیٹا! تم بھی کھانا پکا کر ہوم ڈیلیوری سروس شروع کر دو۔ تمہارے ہنر کی بھی آج کے دور میں کم مانگ نہیں۔" وہ سسر کی فرمائش پر مکھنڈی حلوہ بنا کر لائی تو شکیل احمد نے مسکراتے ہوئے پر شفقت انداز میں اسے مخاطب کیا۔

"کیسی باتیں کرتے ہیں ابو! جو خوشی گھر والوں

کے لیے محنت کرنے سے ملتی ہے، وہ کسی اور کو پکا کر کھلانے سے تھوڑی ملتی ہے۔ ہاں اگر واقعی بندہ ضرورت مند ہو تو اس کام کو پیشے کے طور پر اپنانے میں کوئی قباحت نہیں، مگر الحمدللہ مجھے ایسی کوئی ضرورت نہیں۔"

"جیتی رہو۔" اس کے جواب پر شکیل احمد نہال ہی تو ہو گئے۔

"مرحا، ارحا کشف کے پاس پڑھ رہی ہیں یا کشف کو انہیں بھی پڑھانے کی فرصت نہیں۔"

فہمیدہ بیگم نے بہو سے دریافت کیا۔ دو تین دن سے وہ نوٹ کر رہی تھیں کہ بچیاں کشف کے پاس پڑھنے نہیں جا رہیں۔

"پیپرز کی تیاری تو کشف نے کروادی تھی امی! مرحا، ارحا آج کل خود ہی دہرائی کر رہی ہیں۔ ثمین نے ان کی تسلی کروائی۔

"اور عروبہ نے بچیوں کے کپڑے سی دیے جو تم پچھلے ہفتے خرید کر لائی تھیں؟" شکیل احمد کی یادداشت نے بھی بروقت کام کیا۔

"وہ ریڈی میڈ شرٹس تھیں ابو! سلوانے کی نوبت ہی نہیں آئی۔" ثمین نے سسر کو بھی بڑے سبھاؤ سے جواب دیا۔

"شکر کریں فہمیدہ بیگم! کم از کم ہماری بڑی بہو نے تو ہمارا مان نہیں توڑا۔ یہ ہماری امیدوں پر پورا اتری ہے۔" شکیل احمد نے بہو پر محبت بھری نگاہ ڈالی۔

"وہ دونوں بھی دل کی بری نہیں اور امی اب بالکل ٹینشن نہ لیں۔ گھر کی روٹین چند دنوں میں بالکل پہلے والی ہو جائے گی۔" ثمین معنی خیزی سے مسکرائی تھی۔

"کیوں بیٹا! چند دنوں میں کون سی جادو کی چھڑی گھومے گی۔" فہمیدہ بانو نے ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے پوچھا۔

"ماہ نور نے کچھ دماغ لڑایا ہے، امید ہے کچھ اچھا ہی نتیجہ نکلے گا۔" ثمین مسکرا کر بولی تھی۔

"ہمارے گھر کے معاملوں سے ماہ نور کا کیا تعلق۔" فہمیدہ بانو نے قدرے ناگواری کا اظہار کیا۔

"امی وہ بہت سمجھ دار لڑکی ہے۔ اچھے مشورے دیتی ہے۔" ثمین کو گویا اس کی صلاحیتوں پر پورا بھروسا تھا۔

"بس مجھے آپ لوگوں کے تعاون کی ضرورت ہے۔" ثمین کے دماغ میں جانے کیا تھا۔

"تمہاری ساس امی کے بارے میں تو میں کچھ کہہ نہیں سکتا بیٹا! لیکن میں بھرپور تعاون کروں گا۔ بتاؤ کیا سوچا ہے تم نے اور ماہ نور نے مل کر۔" شکیل احمد نے دریافت کیا۔

ثمین ہولے ہولے بتانے لگی تھی اور فہمیدہ بانو بنا کچھ کہے محض لب بھینچے سسر، بہو کی گفتگو سن رہی تھیں۔

☆☆☆

اگلا دن اتوار کا تھا، ناشتے کی میز پر سب ہی موجود تھے اور ثمین کے بنائے ہوئے آلو بھرے پراٹھوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے جب شکیل احمد نے عروبہ کو مخاطب کیا۔

"عروبہ بیٹا! کیسا جا رہا ہے تمہارا سلائی کا کام؟"

"ایک دم زبردست ابو! یہ دیکھیں میں نے اپنا نیا موبائل اپنی آمدنی سے ہی خریدا ہے۔" اس نے تفاخرانہ انداز میں بتایا۔

"ماشاء اللہ ماشاء اللہ۔" شکیل احمد نے سر ہلایا تھا۔

"اور کشف بیٹا! خیر سے تمہارے شاگردوں کی تعداد میں بھی ہر گزرتے دن کے ساتھ اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔" ان کا روئے سخن اب چھوٹی بہو کی جانب تھا۔

"جی ابو! بچے بڑھ گئے ہیں اور فیس بھی ٹھیک ٹھاک دے رہے ہیں۔" کشف نے فخر بھری مسکراہٹ چہرے پر سجا کر جواب دیا۔

''اچھی بات ہے اب ماشاء اللہ تم دونوں ہی ورکنگ لیڈیز کی کٹیگری میں آ گئی ہو تو میرا خیال ہے تمہیں تمہارے گھریلو معاملات میں بھی خود مختاری سونپ دینی چاہیے۔'' وہ اپنے مخصوص شفقت بھرے انداز میں مخاطب کیا۔

''کیا مطلب ابو!'' کشف نے ناسمجھی سے انہیں دیکھا۔

''مطلب واضح ہے تمہاری گھریلو ذمہ داریاں تمہارے کام کے آڑے نہیں آنی چاہئیں، اس لیے تم تینوں اپنا چولہا چکی علیحدہ کرلو اپنی مرضی سے کھاؤ پکاؤ۔ رہ گئے ہم بڈھا، بڑھیا تو ایک دن نگین پکا کر کھلا دے گی اگلے دن عروبہ تو تیسرے دن کشف کی باری آئے گی۔ حمدان کو ناشتہ نگین کروا دے گی لنچ باکس عروبہ تیار کردے گی اور رات کا کھانا کشف کے یہاں کھائے گا اور عنقریب ہم حمدان کی شادی کر کے اس کی ذمہ داری سے بھی تمہیں آزاد کردیں گے کیوں ٹھیک ہے ناں بیگم، انہوں نے بیوی سے تائید چاہی۔

''جو آپ کو مناسب لگے۔'' وہ یہ ہی کہہ پائیں سسر کی بات سن کر عروبہ اور کشف قدرے پریشان نظر آئیں۔ کھانا پکانے میں ان کی حیثیت معاون و مددگار کی ہوتی تھی۔ کھانا نگین بناتی تھی اور سب بچوں، بڑوں کو اس کے ہی ہاتھ کا کھانا پسند تھا۔

''میرا مقصد تم لوگوں کو آسانی فراہم کرنا ہے، اپنے ٹائم ٹیبل اور شیڈول کے مطابق اپنا مینیو ترتیب دیا کرو ظاہر ہے اب تم لوگوں کی مصروفیت بڑھ گئی ہے تو تم اپنی گھریلو ذمہ داریوں کو اپنی مرضی سے انجام دینا چاہو گی ناں۔ میں نہیں چاہتا۔ کاموں کو لے کر تم لوگوں میں بھی کوئی اختلاف پیدا ہو اس لیے مناسب یہ ہی ہے کہ خوش اسلوبی سے اپنا اپنا کام خود سنبھالو۔''

وہ نرم لہجے میں بہوؤں سے مخاطب تھے۔ نگین دل ہی دل میں مسکرائی، سسر کی کارکردگی سے پوری طرح مطمئن، جب کہ عروبہ اور کشف حیران پریشان سی کبھی کبھی گھریلو معاملات میں مداخلت نہ کرنے والے شلیل احمد آج ان کی گھریلو ذمہ داریوں کے حوالے سے کیوں اتنے تردد میں مبتلا تھے لیکن بظاہر بات معقول اور جائز بھی سو انہیں ''جی ابو'' کہہ کر تسلیم کرنا پڑی تھی۔

کشف اور عروبہ دونوں کو ہی اس پل اندازہ نہ تھا کہ آئندہ آنے والے دن، ان کی زندگی کے کتنے کٹھن دن ثابت ہونے والے ہیں۔

☆☆☆

''مما! آپ نے پھر آج آلو گوشت بنا لیا اور بالکل مزے کا نہیں ہے میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔'' منہ پھلا کر کھانے کا بائیکاٹ کرنے والا عزم تھا۔

''دن گیارہ بجے سلائی مشین پر بیٹھی تھی اور شام کو کپڑے سی کر اٹھی ہوں کمر میں اتنا شدید درد تھا پھر بھی تم لوگوں کے لیے آلو گوشت بنایا، جی تو کر رہا تھا مونگ کی دال بنا کر جان چھڑاؤں لیکن تم لوگوں کے نخرے تو اب بھی ختم نہیں ہو رہے۔ صبر شکر کر کے کھانا کھاؤ۔'' اس نے بچوں کو جھڑکا تھا۔

''کیا ہو گیا ہے عروبہ! تم اول بدل کے یہ ہی تین چار چیزیں پکا رہی ہو آلو گوشت، مونگ کی دال، آلو انڈے یا پھر آلو مٹر۔ بچے بے چارے صحیح نخرہ کر رہے ہیں آج تو یہ آلو گوشت کھانے کا میرا بھی کوئی موڈ نہیں۔'' نعمان نے بچوں کی سائیڈ لی۔

''آپ کو میرا احساس ہی نہیں بجائے اس کے بچوں کو سمجھائیں کہ ماں بہت تھکی ہوئی ہے، اس کا خیال کریں آپ الٹا انہیں شہہ دے رہے ہیں۔'' عروبہ کو شوہر پر غصہ آیا۔

''تو تمہیں تھکنے کا کون کہتا ہے۔ کیوں اتنا کام بڑھا لیا۔ کیا میری تنخواہ تم لوگوں کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے کافی نہیں، آج کمر میں درد ہے، کل سر میں درد تھا۔ مزاج الگ چڑچڑا ہو گیا ہے اور رہے ہم تو سچی بات ہے کہ ہم اچھے کھانے کو ترس گئے ہیں یار جاسم! جاؤ اپنی بڑی مما سے ایک پلیٹ سالن مانگ کر لاؤ۔ نگین بھابھی نے یقیناً کچھ اچھا ہی بنایا ہو گا۔''

نعمان نے بیٹے کو مخاطب کیا اور اس سے پہلے عروبہ بیٹے کو روک پاتی وہ چھلاوے کی سی تیزی سے

بھاگ گیا تھا۔
کشف کے کمرے میں بھی کچھ مختلف صورت حال نہ تھی۔
''کل بڑا آرڈر کیا تھا۔ آج برگر آئے ہیں۔ یار کب تک ایسے چلے گا۔'' ارسلان خفگی بھرے انداز میں بیوی سے مخاطب تھا۔
''ناراض تو آپ یوں ہو رہے ہیں جیسے آپ کے پیسے لٹا رہی ہوں۔ اپنے پیسوں سے ہی بچوں کی فرمائش پوری کی ناں۔''
وہ ذرا تنک کر بولی تھی۔
''یہ بھی خوب رہی۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے نہیں تمہیں کماتے اور اپنی کمائی کا طعنہ بھی مارنے لگیں۔'' ارسلان کا مزاج قدرے تیز تھا وہ بیوی کی بات پر ٹھیک ٹھاک برہم ہو گیا تھا۔
''میرا یہ مطلب نہیں تھا ارسلان!'' کشف قدرے شرمندہ ہوئی۔
''آپ میری مجبوری بھی تو سمجھیں تمکین بھابھی کی طرح میں کوکنگ میں ایکسپرٹ تھوڑی ہوں۔ وہ شام میں اپنی بچیوں کے لیے کچھ نہ کچھ بنا رہی ہوتی ہیں۔ اب بچے تو بچے ہیں ناں ایمن اور ایان بھی مچل جاتے ہیں۔ اچھا نہیں لگتا کہ میں انہیں بھابھی کے پاس کھانے بھیجوں، وہ تو گھر میں میسر اشیاء سے کچھ بھی نیا اور مزے دار بنانے کا ہنر جانتی ہیں۔ میری مجبوری ہے کہ مجھے بچوں کو بازار سے منگوا کر دینا پڑتا ہے۔''
کشف ہولے ہولے شوہر کو بتا رہی تھی۔ قدرے فاصلے پر بیٹھے برگر کھاتے ایمن اور ایان کے کان ماں باپ کی گفتگو کی طرف ہی لگے تھے۔
''اور بابا! آپ کو پتا ہے جب بڑی مما ہمارا لنچ باکس تیار کر کے دیتی تھیں تو کتنے مزے کا لنچ ہوتا تھا۔ مما تو صرف نوڈلز بنا دیتی ہیں۔ وہ ٹھنڈے ہو کر اچھے نہیں لگتے، میں تو تین دن سے اپنا لنچ اپنے فرینڈ کو دے رہا ہوں۔ وہ اتنا موٹو اور ندیدہ ہے ناں میرا ابھی لنچ ہڑپ کر جاتا ہے۔'' آیان نے کھلکھلا کر باپ کو آگاہ کیا۔ ارسلان نے پھر چبھتی نگاہ بیوی پر ڈالی کشف نے نگاہیں چرائی تھیں۔

☆☆☆

''بہو! آج میٹھے میں گاجر کا حلوہ بنا لینا۔ تمہارے ابو گاجریں، دودھ اور کھویا لے آئے ہیں۔''
آج ساس سسر کو پکا کر کھلانے کا دن عروبہ کا تھا تو فہمیدہ بانو نے اسے آگاہ کیا۔ شکیل احمد خوش خوراک تھے۔ اپنی پنشن آتی تھی سو اپنی زبان کا چٹخارہ پورا کرنے کے لیے بیٹوں کی کمائی کے محتاج نہ تھے۔ سامان خود لاتے، پکانے کی ذمہ داری بہوؤں کی تھی اور کچھ عرصہ پہلے تک تو یہ ذمہ داری بھی فقط تمکین کی ہی تھی عروبہ اور کشف اس کا ہاتھ ضرور بٹاتی تھیں۔
گاجر کا حلوہ بننے کی صورت میں گاجریں چھیل کر کدوکش وہ دونوں کر دیتیں مگر اس کے بعد تمکین جانے اور اس کا کام لیکن اب گاجریں چھیلنی بھی خود تھیں، کدوکش بھی خود کرنی تھیں اور حلوہ بنانے کے بعد ساس، سسر کے چہرے پر ''سواد نہیں آیا۔'' والے تاثرات بھی برداشت کرنے تھے۔ ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے عروبہ نے سلائی والے کپڑے سمیٹے اور باورچی خانے کا رخ کیا۔

☆☆☆

اگلے دن جب کشف ٹیوشن والے بچوں کے ٹیسٹ میں کھپ رہی تھی تو مرحا دادا کا پیغام لیے چھوٹی مما کے پاس آئی تھیں۔
''دادا ابو کہہ رہے ہیں، وہ جو دوپہر کو دال بنائی تھی ناں وہ تو صبح ماسی کو دے دیجیے گا۔ رات کے کھانے میں کڑھی بنا لیجیے گا ساتھ زیرے والے چاول اور دادی اماں کہہ رہی تھیں، جب کڑھی کے لیے پکوڑے بنائیے گا تاں تو حمدان چاچو کے لیے ایک پلیٹ پکوڑے علیحدہ سے رکھ لیجیے گا۔'' مرحا تو دادی کا پیغام دے کر چلی گئی کشف کا جھنجلاہٹ کے مارے برا حال ہو گیا۔
''احمد یہ آپ نے پھر غلط ایڈ کر لیا۔ دھیان کہاں ہے آپ کا۔'' وہ بچے پر خفا ہوئی۔ بلا کا کند

ذہن بچہ جو ماہ نور کی معرفت ٹیوشن پڑھنے آیا تھا اور جس کی ماں کا کہنا تھا کہ میرا بچہ بہت ذہین ہے بس تھوڑا سا لاپرواہ ہے۔" اور کشف وہ نادیدہ ذہانت کھوج کھوج کر تھک چکی تھی۔

فورتھ کلاس کا بچہ ٹھیک سے جمع تفریق کے سوال بھی حل نہ کر پا رہا تھا، بلکہ ایک وہ ہی کیا ٹیوشن والے اکثر بچے نکمے اور کند ذہن ہی تھے۔ انہیں پڑھا پڑھا کر اس کے سر میں درد ہونے لگتا۔ شروع کے دنوں میں ان کی فیسوں کی وجہ سے جو جوش و خروش پیدا ہوا تھا، ہر گزرتے دن کے ساتھ وہ ماند پڑتا جا رہا تھا خاص طور پر احمد جیسے کند ذہن بچوں کو پڑھانا اب اسے نرا جھنجھٹ ہی لگتا۔

اوپر سے کچن کے کاموں نے مت مار رکھی تھی۔ فرمائشی پروگرام نشر کرنے میں، اس کے بچے شاید دادا پر ہی پڑے تھے۔ یا شاید نگین بھابھی نے ان کی عادتیں بگاڑ رکھی تھیں۔ سادہ سا کھانا تو حلق سے نہ اترتا۔

وہ نگین بھابھی تھیں، جو عام سی دال سبزی کو بھی خاص بنانے کا ہنر جانتی تھیں۔ جب کشف کی شام اپنے اور ان دونوں کے بچے پڑھانے میں گزرتی تھی سالن نگین بھابھی بناتیں تو روٹی وہ ڈال لیتی۔ کچن سمیٹ کر برتن دھونا عروبہ کی ڈیوٹی تھی لیکن اب تو ساری ترتیب ہی پلٹ گئی تھی۔

کچن چونکہ ایک ہی تھا عروبہ اپنی ہانڈی دوپہر کو بنے کی کوشش کرتی۔ شام کو اس کی ٹیوشن کے ٹائم نگین بھابھی کچن میں جا گھستیں۔

سب سے آخر میں کشف کو پکانے کا موقع ملتا اور جب کچن میں نگین بھابھی کے کھانوں کی اشتہا آمیز مہک پھیلی ہوتی تو سچی بات تو یہ تھی کہ اس کا اپنا دل بھی ان ہی کے ہاتھ کا پکا کھانے کو چاہتا۔ خود کو تو جبر، صبر کر کے سمجھایا جا سکتا تھا لیکن بچوں اور ارسلان کا کیا کرتی، جو اس کے ہاتھ کا پکا کھانا سو نخرے کر کے کھاتے۔

زندگی آج کل بہت مشکل لگنے لگی تھی۔ اسے کیا خبر تھی کہ اس گھر کی دوسری ورکنگ لیڈی کا حال بھی اس سے زیادہ مختلف نہ تھا۔

"مما! دیکھیں ناں یہ عرصم خود ٹھیک سے پڑھ نہیں رہا اور مجھے بھی ڈسٹرب کیے جا رہا ہے۔" جاسم نے ماں سے چھوٹے بھائی کی شکایت کی۔ ٹیوشن پڑھنے کے باوجود بچوں کا کام رات گئے تک مکمل نہ ہو پاتا تھا۔

جاسم پوزیشن ہولڈر تھا، اسے اپنے کام کی بہت فکر ہوتی جب تک سارا ہوم ورک فرفر یاد نہ کر لیتا مطمئن نہ ہو پاتا اور آج کل تو ویسے بھی ان کے مڈٹرم ٹیسٹ چل رہے تھے۔ اس بار وہ اپنی تیاری سے بالکل مطمئن نہ تھا اوپر سے عرصم بار بار اپنے کام میں اس سے ہیلپ مانگ رہا تھا۔

"مما! بھائی سے صرف ایک کوئسچن ہی تو پوچھ رہا ہوں، تنگ کب کر رہا ہوں۔" عرصم نے منہ بسورا تھا۔

"یہ کام ٹیوشن میں کمپلیٹ کیوں نہیں کیا۔" عروبہ بھی اسی پر خفا ہوئی۔

"مجھے میچر مدحت کی بالکل سمجھ نہیں آتی ایک ساتھ اتنے بچوں کو پڑھاتی ہیں پھر دوسرے بچے شور بھی اتنا کرتے ہیں۔ میچر جلدی جلدی نوٹ بک پر سوال سمجھا کر اگلے بچے کا کام چیک کرنے لگتی ہیں میں تو صرف ان کا سمجھایا ہوا کاپی کر کے انہیں چیک کروا دیتا ہوں۔ سمجھ میں تھوڑی آتا ہے لیکن اب کل ٹیسٹ میں تو خود سے کرنا ہوگا ناں۔"

سدا کا لاپرواہ عرصم بھی آج پڑھائی کی وجہ سے پریشان تھا۔

"اچھا دکھاؤ مجھے۔ میں سمجھاتی ہوں۔" عروبہ نے اس کے ہاتھ سے کتاب لی چند لمحے تک سر کھپانے کے باوجود کچھ پلے نہ پڑا۔ یہ میتھس کے پرابلم تھے سیدھے سادھے سوال ہوتے تو کچھ دماغ چلا بھی لیتی۔

"جاسم بیٹا! بھائی کی کچھ ہیلپ کر دو ناں۔ پچھلے سال تم نے یہ ہی بک پڑھی تھی ناں تمہیں تو سب آتا ہے۔"

''مما، پلیز میرا تو خود کام باقی ہے۔ ٹیچر کا تو سمجھ میں نہیں آیا، اب کوکین زبانی یاد کر رہا ہوں پلیز مجھے ڈسٹرب نہ کریں۔'' جاسم نے ہری جھنڈی دکھائی۔

''میتھس کون زبانی یاد کرتا ہے؟'' عروبہ نے اسے آنکھیں دکھائیں۔

''جب سے ٹیچر مدحت کے پاس لگے ہیں زبانی ہی یاد کرنا پڑتا ہے۔ اچھا بھلا پھوپی امی کے پاس پڑھتے تھے، پتا نہیں آپ نے کیوں ان سے پڑھنے سے منع کر دیا۔ مجھے تو لگتا ہے اس بار میری فرسٹ پوزیشن نہیں آئے گی اور یہ عرصم تو جانے پاس بھی ہوتا ہے یا نہیں۔'' جاسم نے کیا ہولناک پیشن گوئی فرمائی تھی۔

''اچھا بس فضول مت بولو۔ پڑھو اپنا، عرصم بیٹا نوٹ بک پر ٹیچر نے جو کوکین سولو کروائے تھے، وہ دکھاؤ۔ میں سمجھاتی ہوں پھر۔''

عروبہ نے ایک بار پھر اسے پڑھانے کے لیے کمر کسی تھی۔ آدھے گھنٹے پڑھا کر اس کی بس ہوگئی تھی۔ پتا نہیں عرصم کا دماغ اتنا موٹا تھا یا پھر وہ ہی ٹھیک سے سمجھا نہ پا رہی تھی۔

کشف کے پاس پڑھتا تھا، پوزیشن نہ سہی مگر ہمیشہ اچھے گریڈز لیتا تھا مگر آج کل تو بالکل ہی ڈاؤن ہوگیا تھا۔ جھنجلا کر عروبہ نے اسے ٹھیک ٹھاک قسم کا ڈانٹ بھی دیا تھا پھر خود ہی پشیمان بھی ہوگئی۔

بچے بے چارے کا کیا قصور تھا لیکن اس مسئلے کا کیا حل نکالا جائے، سوچ سوچ کر اس کا اپنا سر دکھنے لگا تھا۔

☆☆☆

کشف کا اسٹوڈنٹ احمد، جو ماہ نور کی معرفت ٹیوشن لگا تھا اس ——— کا رزلٹ بہت برا آیا تھا اور اس کی ماں مارکس شیٹ لے کر گلہ شکوہ کرنے پہنچ گئی تھی۔

''آپ کو منہ مانگی ایڈوانس فیس دی لیکن میرے بچے کا رزلٹ دیکھیں۔ ایک بھی سبجیکٹ میں مارکس امپروو نہیں ہوئے، اس کے بلکہ انگلش اور سائنس میں تو اس بار سی گریڈ آیا ہے۔''

''شکر کریں سی گریڈ بھی آگیا۔ جس لاپروائی سے یہ کام کرتا ہے مجھے تو یہ نمبرز بھی غنیمت لگے ہیں۔''

احمد کی ماں کے گلے شکوے سن کر کشف کی برداشت بھی جواب دے گئی تھی۔ اس کی ماں آگے سے مزید اکھڑے انداز میں بات کرنے لگی۔

''دیکھیے آواز نیچی رکھیں، میرے میاں گھر پر ہیں وہ غصے کے ویسے ہی تیز ہیں اگر یہ تکرار ان کے کان میں پڑ گئی تو سخت خفا ہوں گے۔ میں معذرت کے ساتھ احمد کی فیس واپس کرتی ہوں جتنے دن پڑھایا بلا معاوضہ پڑھا دیا۔ آپ اسے اس کی سابقہ ٹیچر کے پاس ہی ٹیوشن لگوا دیں۔ میں مانتی ہوں میں بچے کو چلا نہ پائی۔''

کشف نے احمد کی ماں کو فیس واپس لوٹا دی تھی۔

''میں نے اب یہ بھی نہیں کہا۔ آئے گا تو یہ آپ ہی کے پاس بس ذرا زیادہ توجہ دیجیے۔ میرا بچہ نکما یا کند ذہن نہیں بس ذرا لاپرواہ ہے۔'' اس کا لہجہ دھیما پڑا تھا۔

''آپ کا بچہ نکما یا کند ذہن ہے یا نہیں یہ فیصلہ میں نہیں کر سکتی۔ میں بس اتنا جانتی ہوں کہ میں اسے پڑھانے سے قاصر ہوں۔ میری معذرت قبول کیجیے۔''

کشف کی اب واقعی بس ہوگئی تھی۔ احمد کی ماں چہرے پر خفگی بھرے تاثرات سجا کر بڑبڑاتی ہوئی اپنے بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر چلی گئی۔ کشف کرسی کی پشت پر سر ٹکا کر کنپٹیاں دبانے لگی تھی۔

☆☆☆

''مسز آصف! یہ بالکل وہی ڈیزائن ہے جیسا آپ نے مجھے بتایا تھا میں نے اتنی محنت سے آپ کے کپڑے سیے اور آپ مجھے میری محنت کا صلہ دینے کے بجائے میری سلائی پر نکتہ چینی کر رہی ہیں۔''

عروبہ اس عورت کے طرزِ عمل پر حیران تھی۔ یہ عورت ماہ نور کی پڑوسن تھی۔ ماہ نور کے ساتھ ہی اپنے کپڑے سلائی کے لیے دے گئی تھی اور اب کپڑے سلنے کے بعد لینے آئی تھی تو ہر جوڑے کی سلائی پر کوئی نہ کوئی اعتراض جڑ دیا تھا۔

"بھئی ہم تو آپ کی سلائی کی شہرت سن کر آئے تھے مگر سچی بات ہے مزہ نہیں آیا۔ میرے اتنے مہنگے جوڑوں کی ویسی لک نہیں آئی جیسی میری خواہش تھی اور یہ پرپل والا جوڑا اس کا ڈیزائن تو مجھے ایک آنکھ نہیں بھایا اور نہ ہی میرا اتنی مہنگی سلائی دینے کا جی کر رہا۔ جب میرے بتائے گئے ڈیزائن کے مطابق کپڑے سلے ہی نہیں تو میں آپ کو منہ مانگی سلائی کیسے دوں۔ اس سے تو اچھا تھا میں اپنی پرانی درزن سے ہی سلائی کروالیتی۔"

مسز آصف بہت نخریلے انداز میں مخاطب تھیں۔ ادھر عروبہ بہت مشکل سے اپنا غصہ کنٹرول کر رہی تھی۔ دن رات ایک کر کے اس نے مقررہ تاریخ تک ان محترمہ کے کپڑے سیے اور یہ پوری اجرت دینے میں آنا کانی کر رہی تھیں۔

"آپ آئندہ اپنی پرانی درزن سے ہی کپڑے سلوایئے گا لیکن مجھے میری محنت کا پورا معاوضہ چاہیے۔" عروبہ کو اس پر ٹھیک ٹھاک غصہ آ رہا تھا۔

"ناں بھئی اتنے مہنگے دام تو میں کبھی نہ دوں۔" وہ صاف انکاری ہوگئی اور پھر اپنے بٹوے سے چند نوٹ نکال کر احسان جتانے والے انداز میں عروبہ کو تھمانے چاہے۔

"یہ بھی اپنے پاس ہی رکھیے اور آئندہ یہاں آنے کی زحمت مت کیجیے گا۔" عروبہ کا چہرہ غصے کی شدت سے سرخ پڑ گیا۔ وہ ڈھیٹ عورت واقعی کپڑوں کا شاپر لیے چلتی بنی تھی۔

☆☆☆

اگلے دن ماہ نور اس سے معذرت کرنے آئی تھی۔

"مجھے نہیں پتا تھا بھابھی! مسز آصف یوں چھوٹے پن کا مظاہرہ کریں گی۔ مجھے تو نگین بھابھی نے بتایا۔ آئی ایم سوسوری۔ اس عورت کو میں ہی آپ کے پاس لائی تھی ناں۔ میری وجہ سے آپ کو اس عورت کا چھوٹا پن برداشت کرنا پڑا۔"

ماہ نور سخت شرمندہ تھی۔ "ارے نہیں ماہ نور، تمہارا کیا قصور۔ تمہیں اس کی فطرت کا اندازہ تھوڑی تھا۔"

عروبہ کے کہنے پر ماہ نور ایک پل کو دل ہی دل میں شرمندہ ہوئی، سچ تو یہ تھا کہ مسز آصف کی فطرت کا اسے بہت اچھی طرح اندازہ تھا، تب ہی تو وہ اسے عروبہ بھابھی کے پاس لائی تھی۔

یہ اس کا اور نگین بھابھی کا پلان تھا ایک اچھے مقصد کے لیے یہ چھوٹی سی ٹمپرنگ کچھ اتنی بھی غلط نہ تھی۔ ماہ نور نے خود کو اپنی نیت نیک ہونے کا یقین دلاتے ہوئے شرمندگی کا احساس مٹانا چاہا۔

کشف بھابھی کے پاس احمد جیسے بچے کو لانے کا مقصد بھی یہ ہی تھا وہ اس کی ماں کی فطرت سے اچھی طرح واقف تھی۔ وہ بچہ ایک دو مہینے سے زیادہ کسی ٹیوٹر کے پاس ٹک کر پڑھ ہی نہیں سکتا تھا اسی طرح مسز آصف بھی اپنی ہی شہرت کی عورت تھی۔ کپڑے سلوا کر بلاوجہ کے نقص نکالتی تاکہ سلائی کم دینی پڑے چونکہ دونوں عورتیں عرصہ دراز سے ماہ نور کے پڑوس میں مقیم تھیں سو ماہ نور کو ان کی فطرت کا بخوبی اندازہ تھا۔

نگین بھابھی کے بقول عروبہ بھابھی اور کشف بھابھی اب اپنی روٹین سے تھکنے اور اکتانے لگی ہیں ایسے میں احمد کی ماں اور مسز آصف جیسی عورتوں سے ان کا کاٹا کرا کروانے کا واحد مقصد تابوت میں آخری کیل ٹھونکنا تھا۔

"اب دونوں کو ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا ان کی انا کی دیوار کو ہلکا سا دھکا مار کر گرانے کی ضرورت تھی۔ نگین بھابھی نے عروبہ بھابھی کو سمجھانے کی ٹھانی تو ماہ نور کشف بھابھی کے پاس گئی۔

بات اتنی مشکل تو نہ تھی جو دونوں کی سمجھ میں نہ

آتی۔ عروبہ نے کشف کو ایک خوب صورت شرٹ سی کر گفٹ کی۔ مقصد اپنے اور اس کے درمیان نادیدہ فاصلے کو ہٹانا تھا۔

کشف نے جاسم، عرصم، مرحا اور ارحا کو پھر سے پڑھانا شروع کر دیا تھا۔ یعقوب صاحب کے پوتوں کے علاوہ اس نے باقی ٹیوشن والے بچوں کی چھٹی کر دی تھی۔ عروبہ بھی اب صرف نغمہ یا اس کی بہنوں کے کپڑے سیتی تھی وہ لوگ جو اس کے ہنر کے صحیح قدر دان تھے۔ باقی سب کے کپڑے سینے سے اس نے معذرت کر لی تھی۔ اس کے ہنر پر سب سے پہلے اس کے گھر والوں کا حق تھا وہ ان پر خلوص رشتوں کو ٹھوکر افورڈ بھی نہ کر سکتی تھی۔

اسے بخوبی سمجھ میں آ گیا تھا کہ وہ اکیلی ہی کسی ہنر میں طاق اور یکتا نہیں ہے۔ نگین بھابھی اور کشف کے بنا نہ تو اس کا گزارہ ہے نہ اس کے بچوں کا۔

دوسری طرف کشف بھی اپنی نام نہاد انا پر سخت پشیمان تھی۔ اگر وہ عروبہ کے مقابلے میں تم ٹھونک کر یوں میدان میں نہ اترتی تو شاید گھر کی فضا اتنی مکدر نہ ہوتی۔

دونوں نے بنا کسی ضرورت کے اپنے ہنر اور علم کو کمائی کرنے کے ساتھ، دوسروں پر دھاک بٹھانے کے لیے استعمال کیا اور کچھ حاصل ہونے کے بجائے خلوص اور محبت کی بنیاد پر استوار رشتے داؤ پر لگ گئے۔ خوش آئند پہلو یہ تھا کہ دونوں کو ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا اور کوئی جادو کی چھڑی گھومے بغیر روز و شب پرانی روٹین پر لوٹنے لگے تھے۔

فہمیدہ بیگم اللہ کا شکر ادا کرتے نہ تھکتی تھیں۔ جس نے ان کے آشیانے کی رونقوں کو پھر سے بحال کر دیا تھا۔

وہ جانتی تھیں کہ اس سب میں نگین کی سمجھ داری اور معاملہ فہمی کے ساتھ ماہ نور کے مشوروں کا بھی عمل دخل ہے۔ دل ہی دل میں وہ بھی ماہ نور کی سمجھ داری کی قائل ہو گئی تھیں لیکن ابھی اس کا منی سی لڑکی کی شخصیت کے کچھ اور پہلو ان پر کھلنا باقی تھے اور اگر اس روز وہ نگین اور ماہ نور کی باتیں نہ سن لیتیں تو شاید اسے ٹھیک سے اب بھی نہیں سمجھ پاتیں۔

☆☆☆

''تم نے کمال کر دیا ہے ماہ نور! اتنی سی عمر میں اتنی سمجھ داری کہاں سے حاصل کی۔''

ماہ نور، نگین کے ساتھ کچن میں کوئی نئی ریسپی ٹرائی کر رہی تھی جب نگین نے اسے مخاطب کیا۔ کسی کام سے کچن کی طرف آتی فہمیدہ بانو وہیں رک گئی تھیں۔ ماہ نور ان کے سامنے بہت کم بولتی تھی اور آج وہ اسے بولتا سننا چاہتی تھیں۔

''ارے نگین بھابھی! جو ہوا یہ صرف اللہ کا کرم ہے۔ میں نے تو محض یہ مشورہ دیا تھا کہ آپ بھی کچھ دنوں کے لیے سب کے لیے کھانے پکانے سے ہاتھ اٹھالیں اور بس دو چار آؤٹ پٹانگ قسم کی خواتین کو دونوں بھابھیوں کا کسٹمر بنا دیا اور اس چیٹنگ پر مجھے اب تک دل ہی دل میں شرمندگی بھی ہے لیکن چونکہ میری نیت نیک تھی، اس لیے اللہ سے معافی کی امید ہے۔''

وہ دھیمی مسکان لبوں پر سجائے بول رہی تھی اور فہمیدہ بانو دل ہی دل میں، اعتراف کرنے پر مجبور تھیں کہ اس کی آواز کتنی مدھر اور رس بھری ہے۔

''دراصل میں نگین بھابھی یہ آپ ہیں، جنہوں نے اس گھر کو جوڑ رکھا ہے۔ جس بے غرضی اور خلوص سے آپ سب گھر والوں کا خیال رکھتی ہیں۔ سب کو ان کا من پسند پکا پکا کر کھلاتی ہیں اور کبھی آپ کے ماتھے پر ایک شکن نہیں آتی آپ صحیح معنوں میں تائی جان کی جانشین ہیں۔ گھر کو جوڑنے والی رشتے نبھانے والی۔ تائی جان نے بھی ساری عمر خود سے وابستہ رشتوں کو مثالی انداز میں نبھایا ہے اور اب یہ ہی سب آپ کر رہی ہیں۔''

ماہ نور کھلے دل سے نگین کو سراہ رہی تھی اور نگین محبت بھری نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''پتا ہے نگین بھابھی! میں نے ہمیشہ تایا ابو اور تائی جان کے گھر کو آئیڈیلائز کیا ہے۔ بچپن میں جب مجھے اتنی سمجھ بھی نہ تھی تب سے ہی مجھے اس گھر کی سکون بھری فضا فیسی نیٹ کرتی تھی عمر بڑھنے اور شعور آنے کے ساتھ اس

گھر کے ساتھ میرا لگاؤ بڑھتا گیا میں ہمیشہ اپنے گھر کی بے ترتیبی اور بے سکونی کا اس گھر سے موازنہ کرتی پھر جہاں تک مجھ سے بن پڑتا۔ میں تائی جان کے سلیقے اور طور طریقے اپنے گھر میں اپنانے لگی۔ تائی جان میری پہلی استاد تھیں تو میرے ڈائجسٹ مجھے زندگی گزارنے کا ڈھنگ سکھانے والے دوسرے استاد ثابت ہوئے۔ وہ تربیت جو بدقسمتی سے میری ماں نہ کرپائی، وہ سب میں نے ان رسالوں سے سیکھا۔ رشتے نبھانے میں امی کبھی کامیاب نہ ہو پائیں۔ میں نے ہمیشہ انہیں ابو سے لڑتے جھگڑتے دیکھا۔ کبھی ابو کی کم تنخواہ کو جواز بنا کر جھگڑا کرتیں کبھی ابو کی بہنوں کی تیزی طراری کو لے کر رونا ڈالتیں۔

پھر میں امی اور تائی جان کا موازنہ کرتی۔ جو رشتے ساری زندگی امی کے گلے کا طوق ثابت ہوئے تائی جان نے انہیں کس عمدگی سے نبھایا تھا۔ انہوں نے یہ سب کیسے کیا، اس سوال کا جواب مجھے میرے ڈائجسٹوں میں ملا۔

صبر، شکر، اخلاق، برداشت، خدمت گزاری وہ وصف ہیں جس سے عورت کسی کے بھی دل میں گھر کرسکتی ہے۔ یقین کریں نگین بھابھی، جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ رسالے لڑکیوں کا دماغ خراب کرتے ہیں انہوں نے کبھی یہ رسالے پڑھ کر دیکھے ہی نہیں ہوتے کم از کم میں نے تو ان سے بہت سبق سیکھا ہے۔“

ماہ نور سبزیوں کی کٹنگ کرتے ہوئے اپنی دھن میں بولے جارہی تھی۔

”مرحا، ارحا کالج جانے لگیں گی ناں تو میں انہیں بھی یہ ڈائجسٹ پڑھواؤں گی۔ تم نے ان سے جو سیکھا اسے اپنی زندگی اور اپنے گھر کو سنوارنے کے لیے استعمال کیا۔ چچی کی بات اور تھی لیکن ماشاء اللہ اب تمہارا گھر تمہارے سلیقے کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ چھوٹے بہن بھائی بھی تربیت یافتہ ہیں اور مجھے تو لگتا ہے چچی، چچا کے تعلقات بہتر بنانے میں بھی سراسر تمہاری کاوشوں کا دخل ہے۔“ نگین اسے سراہ رہی تھی۔

”ایسا بھی ہوتا ہے نگین بھابھی، کبھی کبھی بیٹیوں کو ماں کے الجھے معاملے سلجھانے پڑتے ہیں، امی کو بھی ایک عمر گزار کر یہ احساس ہوگیا ہے کہ رشتے بگاڑ کر جینا جتنا دشوار ہے۔ ذرا سا دل مار کر سب کو راضی کرنے سے زندگی اتنی ہی سہل ہو جاتی ہے۔ اب تو چھوٹی بڑی پھوپھو کے ساتھ امی کے تعلقات بہت اچھے ہوگئے ہیں اور میرے چند مشوروں پر عمل کر کے امی، ابو کے دل میں بھی پوری پوری جگہ بنا چکی ہیں۔“

اس بار وہ شرارتی انداز میں ہنس رہی تھی۔

”تمہارے مشوروں کے تو ہم بھی قائل ہو گئے ہیں جناب، اسی لیے تو سوچ رہے ہیں ناکہ تمہیں ہمیشہ کے لیے اس گھر میں ہی کیوں نہ لے آئیں۔“ نگین نے مسکرا کر اسے مخاطب کیا تو ماہ نور نے یک لخت گردن اٹھا کر اسے دیکھا۔

”ایسے حیران مت ہو۔ حمدان نے چند دن پہلے مجھے اعتماد میں لیا تھا، وہ تمہیں پسند ہے لیکن امی سے بات کرنے سے پہلے، وہ تمہاری رائے جاننا چاہتا ہے اور یہ ڈیوٹی اس نے میرے سپرد کی تھی۔ تم اس گھر کو ہمیشہ سے ہی آئیڈیلائز کرتی ہو ناں، تو بتاؤ اس آئیڈیل گھرانے کا حصہ بننے پر تیار ہو اور میری گارنٹی ہے حمدان سے بہتر لائف پارٹنر تمہیں کوئی اور نہیں مل سکتا۔“

نگین بول رہی تھی اور باہر کھڑی فہمیدہ بانو سانس روکے ماہ نور کے جواب کی منتظر تھیں اس کا جواب ان کی توقع کے بالکل برعکس تھا۔

”پلیز نگین بھابھی! اس ذکر کو یہیں ختم کردیں اور بھول جائیں کہ آپ نے کبھی مجھ سے اس موضوع پر بات بھی کی تھی۔“ وہ سنجیدگی بھرے لہجے میں نگین سے مخاطب تھی۔

”لیکن کیوں ماہ نور، کیا برائی ہے اس پروپوزل میں۔“ نگین بھی اس کے جواب پر حیران تھی۔

”نگین بھابھی، میں نے اپنے ڈائجسٹوں سے یہ بھی سیکھا ہے کہ ایک لڑکی کے لیے اس کی انا، عزت، وقار اور بھرم کسی بھی دوسری چیز سے بڑھ کر ہے۔ حمدان میرے لیے فقط تایازاد کزن ہے، اسے باتوں باتوں میں سمجھا دیجیے گا کہ وہ کبھی بھی اس موضوع پر بات کرنے

pklibrary.com

کے لیے میرا راستہ نہ روکے۔ میں ہمیشہ ہر کسی کے سامنے سر اٹھا کر جینا چاہتی ہوں۔ تائی جان کو اگر میرے لیے حمدان کی پسندیدگی کا پتا چلے گا تو وہ میرے بارے میں اچھا گمان نہیں کریں گی۔

میں جانتی ہوں وہ امی کی وجہ سے مجھے خاص پسند نہیں کرتیں۔ تابی میں ان کی من پسند بہو کے سانچے پر پورا اترتی ہوں تو پھر فضول میں یہ شوشا چھوڑنے کا فائدہ۔ میں نہیں چاہتی کہ میرے اور حمدان کے درمیان کبھی بھی اس موضوع پر بات ہو اور مستقبل میں ہمیں، ایک دوسرے سے بات کرتے ہوئے نگاہیں چرانی پڑیں۔ لڑکی کے لیے اس کا کردار اور وقار ہی تو سب کچھ ہوتا ہے بھابھی، پلیز وعدہ کریں۔ آپ اس موضوع کو یہیں لپیٹ دیں گی۔"

وہ متوحش ہو کر نگین سے وعدہ لے رہی تھی۔

نگین نے تو پتا نہیں اسے کیا جواب دیا پر فہمیدہ بانو اسی آہستگی سے بنا چاپ پیدا کیے واپس پلٹ گئی تھیں۔

☆☆☆

"عرصم کہاں جا رہے ہو یار؟" حمدان نے عرصم کو پکارا تھا۔

"چھوٹی مما نے ایمن کے لیے چپس منگوائے ہیں وہ لینے جا رہا ہوں چاچو!" عرصم نے جواب دیا۔

"اچھا یہ لو۔ اپنی ماہ نور آپی کو یہ دے آؤ۔" اس نے ڈائجسٹ کا شاپر عرصم کو پکڑایا تھا۔

"رہنے دو عرصم! رات کو میں اور تمہارے دادا ابو تمہاری ماہ نور آپی کے ہاں جائیں گے جب لے جائیں گے یہ بھی۔" فہمیدہ بانو کے کہنے پر عرصم نے جی کہہ کر شاپر انہیں پکڑایا اور خود باہر بھاگ گیا تھا۔

"کیوں جائیں گے چچا کے گھر۔ خیریت؟" حمدان نے حیرت سے استفسار کیا۔

"ماہ نور ان ڈائجسٹوں کے پیسے ویسے بھی دیتی ہے یا اپنے پلے سے لاتے ہو؟" انہوں نے بیٹے کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے بالکل غیر متعلقہ سا سوال پوچھا۔

"دیتی ہے امی! منع کرنے کے باوجود دیتی ہے۔ بڑی اونچی ناک ہے محترمہ کی۔" حمدان ہولے سے ہنسا تھا۔

"پیسے مت لیا کرو اور یہ بتاؤ کہ ساری زندگی یہ ڈیوٹی نبھانے کے لیے تیار ہو؟" انہوں نے مسکراہٹ دباتے ہوئے پوچھا۔

"مطلب؟" حمدان نے حیرت کا جھٹکا کھایا تھا۔

"مطلب سیدھا سا ہے۔ پہلے پہل تو شوق سے اس کی فرمائشیں پوری کر دیا کرو گے لیکن مرد، بیوی کے مشغلے مشکل سے ہی برداشت کرتے ہیں، بے چاری فرصت کے لمحات میں رسالے پڑھے گی تو تم اپنا موڈ خراب تو نہیں کیا کرو گے یہ بات شادی سے پہلے کھلنا بہتر ہے۔"

"مطلب، امی؟" حمدان سے اس بار بھی فقرہ مکمل نہ ہوا اس پر شادی مرگ کی کیفیت طاری ہو رہی تھی۔

"بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے میں نے۔ بڑی تینوں بہوویں کسی نہ کسی ہنر اور فن میں یکتا ہیں۔ چھوٹی بہو وہ لانے والی ہوں، جو سمجھ داری میں اپنی مثال آپ ہے۔ تم سے پوچھنا فرض ہے پھر نہ کہنا امی نے بنا پوچھے زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ کر دیا۔"

وہ بظاہر سنجیدگی بھرے لہجے میں حمدان سے مخاطب تھیں۔

"میں تو صرف یہ کہوں گا کہ آپ نے بنا پوچھے مجھے میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی دے دی۔" چھوٹا لاڈلا ڈائجسٹ کے موڈ میں آ گیا تھا اور اپنی بانہیں ان کے گلے میں ڈال دی تھیں۔

فہمیدہ بانو نے محبت سے اس کی پیشانی چومی انہیں پختہ یقین تھا، جب وہ پورے مان اور پیار سے ماہ نور کا ہاتھ مانگنے اس کے گھر جائیں گی، تو رنگوں کی یہ قوس قزح انہیں ماہ نور کے چہرے پر بھی نظر آئے گی۔ بس انہیں ماہ نور کے کان میں یہ پیار بھری سرگوشی کر کے اسے باور کروانا ہوگا کہ وہ ان چاہی نہیں بلکہ ان کی من چاہی بہو بن کر ان کے آنگن میں اترے گی۔

☆☆

لبنیٰ آصف

وقتی فائدہ

"شب برات کا مہینہ بھی تیزی سے جارہا ہے۔ رمضان میں کچھ ہی دن باقی ہیں۔ کس قدر کام ہیں۔ ابھی سے شروع کروں گی تو چاند رات تک ختم ہوں گے کام"

"ارے قرۃ العین! ایسے کون سے کام ہیں جو ابھی شروع کروگی تو رمضان کی چاند رات تک چلیں گے۔"

"لو اور یہ! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ رمضان سے پہلے کے کاموں کی ایک لمبی لسٹ ہے۔ کچن کی تفصیلی صفائی، لاؤنج کی نئی سیٹنگ کروں گی۔ رمضان میں کیا کیا پکنا ہے۔ گروسری کی لسٹ بنانی ہے۔ میں تو پہلے سے سارے کام کرتی ہوں۔ روزے میں تو اتنے ڈھیر سارے کام کرنا مشکل لگتا ہے۔ آج کل رول سموسے، اور چٹنیوں کی ویڈیو دیکھ رہی ہوں۔ خوب بنا کر فریز کردوں گی۔ بس نکالے اور تل لیے۔ چھولے دہی بڑے، پکوڑے سب کا مسالہ بنانا ہے۔ املی، آلو بخارے اور دھنیے کی چٹنی بنانی ہے۔ اب کی بار شربت بھی بدل بدل کر بناؤں گی۔ لیمن اسکوائش اور مینگو شیک کی اتنی زبردست ریسپی نیٹ پر آئی ہے۔ افطار اور سحری دونوں میں چینج لاؤں گی۔ کچھ نئی ورائٹی تو ہو۔

عید کی تیاری تو میں نے رجب میں کرلی روزے میں مارکیٹ جانا سوچ کر ہی روزہ لگنے لگتا ہے۔ ابھی ایک چکر مارکیٹ کا بھی لگے گا۔ یہ سب کام رمضان سے پہلے کرلوں گی تو مجھے ہی فائدہ ہوگا۔"

"ایک بات کہوں قراۃ العین! ہم ہر چیز میں فائدہ دیکھتے ہیں۔ اصل میں تو فائدے بھی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وقتی فائدہ جو فوری ہمیں فائدہ دیتا ہے۔ اور ایک دیرپا فائدہ ہوتا ہے۔ جس کا فائدہ ہمیں ہمیشہ ہوتا ہے۔

"وقتی فائدہ" مطلب؟"

"تم رمضان کی تیاری پہلے سے کروگی تو تمہیں وقتی طور پر افطار اور سحری میں سہولت ہوگی۔ کام بھی جلدی ہوجائے گا۔ لیکن وقت کے ساتھ یہ فائدہ ختم ہو جائے گا۔ پورے سال میں رمضان ایک مہینے کے لیے آتا ہے۔ ہمارا امین مقصد اس رمضان میں زیادہ سے زیادہ عبادت کرکے اپنے نامہ اعمال میں نیکیاں حاصل کرنے کی نیت ہونی چاہیے۔ رمضان میں ہر نیکی دس گنا ثواب دیتی ہے۔ قرآن کا ہر لفظ پڑھنے کا ثواب بے شمار کردیا جاتا ہے۔ لیکن ہم سحری اور افطاری کے کھانوں کا ہی سوچے جاتے ہیں۔ جن کا فائدہ بس وقتی ہے۔"

"یہ کیا بات کی تم نے ارے! ہم یہ سارے کام کیوں کررہے ہیں۔ پہلے سے تاکہ زیادہ سے زیادہ ٹائم عبادت میں گزاریں۔"

"قرۃ العین! میرا مطلب یہ نہیں تھا یہ سب بھی زندگی کا حصہ ہے اور خاتون خانہ کے فرائض میں شامل ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمیں اور بھی تیاری کرنا چاہیے۔

میں تو اس سال رمضان آنے سے پہلے پوری نماز ترجمے کے ساتھ یاد کروں گی، سمجھ میں تو آئے۔ ہم اللہ سے کیا کہہ رہے ہیں کیا مانگ رہے ہیں۔ پھر ذہن بھی ترجمے کی طرف فوکس رہے گا۔ پورے سال تو ہم پانچ وقت کی نماز ہی پڑھتے ہیں ان شاء اللہ اس رمضان اشراق، چاشت، تہجد کی نماز کے فائدے اور انعام کا سوچ کر دل خود بخود پڑھنے پر آمادہ ہورہا ہے۔ قرآن کا رمضان

میں پڑھنا عام دنوں کی بہ نسبت زیادہ ثواب ہے۔ نئی سورتیں بھی یاد کروں گی تاکہ نماز میں بدل بدل کر پڑھو۔ ان شاء اللہ اس سال بھی تراویح پابندی سے پڑھوں گی۔"

"صحیح کہہ رہی ہو اریبہ! ہم ہر سال بس روٹین کی ہی عبادت کرتے ہیں۔"

"اور کیا! دیکھو ابھی رمضان میں کچھ دن باقی ہیں۔ پچھلے سال کے جو روزے چھوٹے ہیں وہ بھی رکھنے کا وقت ہے پورے سال میں بھی رکھ نہیں پاتے۔ مائیں روزے رکھیں گی تو بیٹیوں کو بھی عادت پڑے گی۔ میں تو لکھ کر رکھ لیتی ہوں۔ سارے قضا روزے ایک ساتھ رکھ لیتی ہوں۔ آج کل دن بھی چھوٹے ہیں۔ اور مہینے بھی برکت اور رحمت والے ہیں۔"

"ہاں دیکھو تو اریبہ! میرا ذہن ہی نہیں گیا قضا روزوں کی طرف۔ پچھلے سال بیماری کی وجہ سے اچھے خاصے روزے چھوٹ گئے تھے۔"

یہی تو بات ہے قرۃ العین! ہم جس طرف ذہن لگاتے ہیں۔ ذہن اسی طرف لگ جاتا ہے۔ وہی چیزیں ہمارے سامنے بھی آتی ہیں۔ تم کھانا پکانے کی نئی نئی ترکیبیں سوچو گی تو تمہارے سامنے وہی چیزیں آئیں گی۔ ہمیں اپنے آپ کو خود درست سمت میں لے کر جانا ہوتا ہے۔

میں نے جس دن سے اس رمضان کو بہترین گزارنے کا سوچا ہے اس دن سے میرے سامنے دعائیں اسباب وسائل خود بہ خود آجاتے ہیں بس ایک قدم بڑھانے کی دیر ہوتی ہے۔ اللہ خود راستے بناتا ہے۔

میں نے دعائیں بھی لکھ کر رکھی ہیں کہ کون کون سی دعا مانگنی ہے۔ بلکہ خاندان میں جو لوگ بیمار ہیں معاشی مسائل ہیں۔ ان کے نام بھی لکھ کر رکھے ہیں کہ ان کے حق میں زیادہ سے زیادہ دعا کروں۔ عام دن میں تو بس روٹین کی دعائیں مانگ کر اٹھ جاتے ہیں۔ ہمیں ہر چیز میں ورائٹی اور تبدیلی لانی ہوتی ہے مگر ہم عبادتوں کو بس روٹین کے کاموں کی طرح ادا کرتے ہیں۔ نماز میں صرف سورتیں بدل کر پڑھو، اتنا مزہ آتا ہے۔ نماز اتنا سکون دیتی ہے اور نئے نئے قرآن کے الفاظ ہماری زبان پر آتے ہیں۔"

"اب بتاؤ! یہ مقصد اور کوشش ہمیں زیادہ فائدہ دے گی یا کھانوں کی ورائٹی اور گھر کی سیٹنگ۔"

"صحیح کہہ رہی ہو اریبہ! رجب آتے ہی ایک دوڑ سی لگ جاتی ہے کہ مارکیٹ کے کام، عید کی تیاری، رمضان کی تیاری سب کام کرلیں۔ اور جو کام سب سے ضروری ہے۔ اسے پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ چلوں گی اب قرۃ العین!"

"اریبہ! تم سے بات کر کے اتنا اچھا لگا۔ ان باتوں کی طرف ذہن گیا ہی نہیں۔ ان شاء اللہ میں بھی اپنے قضا روزے رکھوں۔ ابھی تو وقت ہے۔ ہاں بس میری تو دعا ہے کہ اللہ ہمیں عمل کی توفیق دے۔"

اریبہ تو چلی گئی لیکن قرۃ العین کو نئی حکمت عملی پر عمل کرنے کی سوچ دے گئی۔

☆☆

فلک تنویر

پھول زخموں میں

وہ کھڑکی میں کھڑی تھی۔ کھڑکی کے اس پار شام قطرہ' قطرہ' رات کی سیاہی میں پگھل رہی تھی۔

پیچھے کمرے میں طوفان کے بعد والی خاموشی طاری تھی۔ آف وائٹ پینٹ شدہ دیوار پر چائے کی خشک لکیر اور اس کے ارد گرد دھبے...... دیوار کے نیچے قالین پر ٹوٹا کپ پلیٹ اور چارجر......

وہ یک ٹک باہر کے منظر کو دیکھ رہی تھی۔ چنار کے پتے' پت جھڑ کے زیر اثر تھے۔ تائی کے تخت پر پڑی سبزی کی ٹوکری ویسے ہی پڑی تھی۔ تائی پڑوس میں کسی کی عیادت کے لیے گئی تھیں اور زین شاید والی بال کھیلنے بڑے میدان میں۔ گھر میں ابھی تایا جی ٹی وی پر خبرنامہ لگائے بیٹھے ہوں گے' کبیر اتنا ہنگامہ کرنے کے بعد اب کسی دوست کی بیٹھک میں بیٹھا لڈو کھیل رہا ہوگا...... یا پھر کرکٹ کا میچ دیکھ رہا ہوگا...... رات دس بجے سے پہلے وہ نہیں آنے والا تھا۔

معاً صوفے پر اس کا موبائل تھرتھرانے لگا۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو "مینو کالنگ" لکھا آ رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ کال اٹھاتے ہوئے مینو کی شکایتوں کی پوٹلی فوراً کھل جائے گی۔ پہلے تو اس نے فون نہ اٹھانے کا سوچا' لیکن مینو ڈھیٹ پن سے کال پر کال کیے جا رہی تھی۔ چاروناچار اس کو اٹھانا پڑا۔

"کیا یار پلوشہ باجی! کال اٹھا رہی ہیں آپ اور نہ ہی واٹس ایپ پر میسج کا ریپلائی۔" حسب معمول وہ سلام بھول کر ناراضی سے کہہ رہی تھی۔

"ہاں' ہاں۔ اب آپ کے رٹے رٹائے بہانے شروع ہو جائیں گے۔ تائی گھر پر نہیں ہیں' شوہر نامدار کی خدمتیں کرنا تھیں۔ اس نکمے زین کے دوست آئے تھے۔"

ناچاہتے ہوئے بھی مینو کے انداز پر وہ لمحے بھر کے لیے مسکرائی۔

"ایسا ہی ہے مینو۔" وقفے کے بعد اس نے بولنا شروع کیا تو اس کے لہجے میں ٹھہری نمی مینو سے چھپ نہ سکی۔ اس نے تھوک نگلا تھا۔

"کچھ ہوا ہے کیا پلوشہ باجی؟" مینو تشویش سے استفسار کر رہی تھی۔

گلے میں آنسوؤں کا ایک گولا پھر سے بن گیا تھا۔ لیکن اس نے سنبھل کر بات کرنا شروع کی۔

"تائی ابھی بھی گھر پر نہیں ہیں۔ یہ ایک ہفتہ تو انہوں نے بستر پر گزارا۔ ان کا بی پی کنٹرول نہیں ہو رہا تھا۔"

"ہاں تو پرہیز کیا کریں ناں۔ اس دن بھی شادی ہال میں ایسے ٹھونس ٹھونس کر چاول کھائے جا رہی تھیں۔ میں نے کہا' تائی بی پی شوٹ کر جائے گا آپ کا۔ پاس بیٹھی رخشندہ پھپھو سے کہنے لگیں کہ زبان کے ذائقے کے لیے ایک دو نوالے لیے اور یہ اس پر بھی نظر رکھے ہوئے ہے۔ شادی کے بعد یہ تو میرا کھانا ہی بند نہ کردے۔ ہر کسی کی نیکی کو دریا میں پھینک دینے کی عادت ان کی پکی ہو چکی ہے۔" مینو کے لہجے سے ناگواری ٹپک رہی تھی۔ آخر میں ایک لمبا "ہونہہ" کا اضافہ بھی کیا۔

"تم بھی ہر جگہ اپنی "حکمت" مت جھاڑا کرو۔ وہ تو ہر بات اپنے بیٹوں کو بتا دیا کرتی ہیں۔

pklibrary.com

مکمل ناول

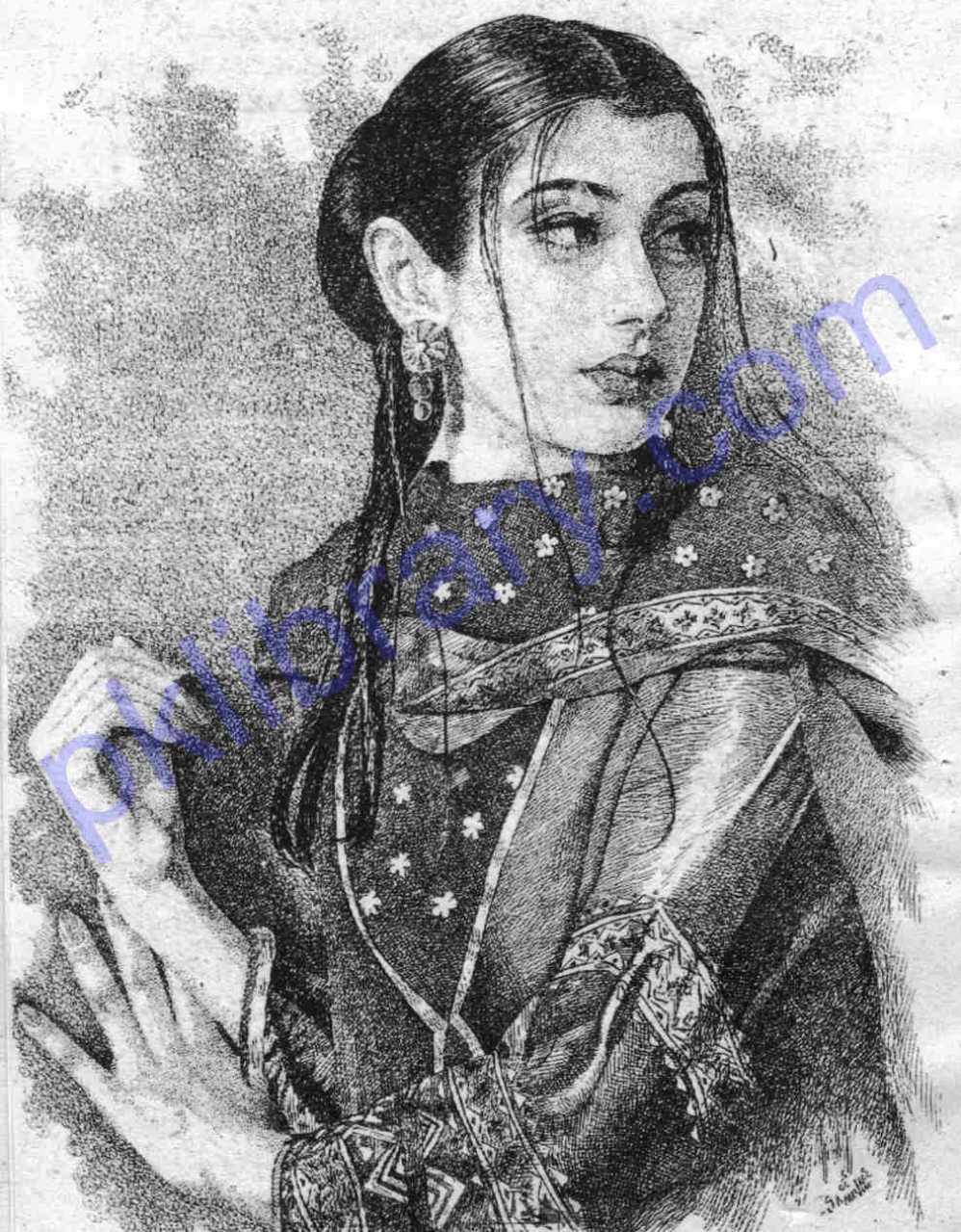

pklibrary.com

شادی سے آنے کے بعد رات کو زین کو یہ قصہ سنا رہی تھیں۔" پلوشہ اس کو سمجھانے لگی لیکن آگے سے مینو کا لہجہ بگڑ چکا تھا۔

"ابھی سے زہر گھول رہی ہیں...... ہونہہ...... اور ان کے صاحبزادے ویسے بھی "مورخانیان" (ماں کی ہر بات ماننے والے ہیں) ماں بیگم جو بھی کہہ دیں مانو پتھر پر لکیر۔"

"تو جب اتنا تائی کی پرسنالٹی پر ریسرچ کر چکی ہو تو ذرا احتیاط بھی برتا کرو نا۔"

"واٹ ایور۔" مینو کا موڈ خراب ہو چکا تھا۔ کچھ لمحے توقف کے بعد وہ پوچھنے لگی۔ "خیر یہ سب چھوڑیں۔ ایک ہفتہ ہو گیا آپ آئیں نہیں۔ کون سا پشاور بیاہی گئی ہیں آپ۔ بیس منٹ کا راستہ ہی تو ہے میکے تک۔"

"بتایا تو ہے تائی بیمار تھیں۔" اس نے حیلہ تراشا۔

"پلوشہ باجی...... ایک ہفتے سے ابو بھی بیمار ہیں...... تائی کی خدمت کرنا ٹھیک ہے، آپ کی ذمہ داری ہوگی لیکن ابو کی تیمارداری کرنا بھی تو ان کی پہلی اولاد پر فرض ہے۔"

اب کی بار مینو کے لہجے میں ٹھیک ٹھاک ناراضی تھی اور دکھ بھی...... یہ سنتے ہی وہ اپنا درد بھول چکی تھی اور کچھ دیر پہلے ہو چکا طوفان بھی...... وہ دکھ اور پشیمانی کے احساس سے ...... بُت بن گئی۔ سکتے کی حالت میں کھڑی اس سے کچھ بولا ہی نہ گیا۔

"آئی ایم سوری...... میں نے اس ایک ہفتے میں موبائل زیادہ یوز نہیں کیا اور...... تم نے مجھے کال کر کے بتایا کیوں نہیں؟"

"ابو نے منع کیا تھا کہ بلاوجہ پریشان ہوں گی۔ اب اپنے ایکسکیوز زاور گلٹ سائیڈ پر رکھیے اور جلدی سے آئیے۔ رخشندہ پھپھو کی عمر کچھ زیادہ بڑھنے والی ہے جب جب یاد کرتے ہیں۔ حاضر ہو جاتی ہیں۔ میں جاتی ہوں۔ خدا حافظ۔" مینو نے جس موڈ میں بات شروع کی تھی اس میں ختم بھی کی تھی۔

اور وہ...... یعنی پلوشہ کبیر، دکھ سے وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ یہ ہفتہ کیسا عذاب گزرا یہ تو وہ جو گزار چکی، وہی جانتی تھی۔ تائی کا بیمار رہنا تو محض ایک حیلہ بہانہ تھا۔ اصل وجہ تو "کبیر" تھا۔ اس کا شوہر۔

جو ابھی کچھ دیر پہلے آفس سے آنے کے بعد برے موڈ میں تھا۔ اس سے چائے میں چینی تھوڑی کم ہو گئی تھی اور دوسرے گھونٹ پر کبیر نے چائے کا کپ پلیٹ میں رکھے سینڈوچ کے ساتھ دیوار پر دے مارا۔ وہ جو سامنے کھڑی اس کے تاثرات سے ہی جانچ کر رہی تھی کہ اس نے اس دفعہ کیا کمی بیشی کی ہوگی...... سہم کر دیوار میں انارکلی کی طرح چن گئی۔ کبیر نے سائیڈ ٹیبل پر رکھا موبائل کا چارجر اٹھا کر اس پر دے مارا وہ ٹوٹ کر کرچی ہو گیا۔ ایک کرچی اس کے دائیں ہاتھ میں چبھی اور خون بہنا شروع ہو گیا۔

وہ اول فول بکتا جا رہا تھا، ایسے میں تایا اندر داخل ہو گئے اور اس کو خوب سنائیں لیکن وہ ہنوز چلاتا رہا......

"باہر سے تھک ہار کر آؤ تو کبھی سوکھی روٹی رکھی ہے سامنے...... کبھی سیلاب کے پانی جیسی چائے...... کم اصل سمجھ رکھا ہے اس نے مجھے......"

دروازے کو لات مارتا، وہ تن فن کرتا گھر سے نکل گیا۔ وہ وہیں سہم کر ڈری ہوئی کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ اس کو اپنا درد نہیں ستا رہا تھا، بس اپنی عزت نفس کی کرچیاں ہونے پر دکھی تھی کہ دیوار کے اس پار شام کی چائے پر پڑوسیوں کا موضوع بحث ہوگی وہ...... ایک بری اور پھوہڑ بیوی کا ستایا، سارے دن کی محنت کرتا ایک مظلوم شوہر......

تایا افسوس بھرے انداز میں اس کو دلاسے کے چند بول، بول کر جا چکے تھے اور وہ وہیں بت بنی کھڑی رہی...... جیسے مینو کی بات نے ایک بار پھر سے بت بنا دیا تھا۔

☆☆☆

سورج انتہائی آلکسی سے اونگھ رہا تھا۔

ویک اینڈ پر "احمد اللہ خلیل مرحوم" کے گھر میں اگرچہ خوب رونق جمتی لیکن کافی دیر بعد...... ابھی امی یعنی حسینہ اور دادی شاندانہ بی بی اٹھ چکی تھیں۔ امی

کچن میں دادی کے لیے ناشتا تیار کر رہی تھیں اور دادی اشراق پڑھنے کے بعد اب فریم اٹھائے سرخ دوپٹے پر سلمہ ستارے ٹانک رہی تھیں.....

اس دوپٹے کو وہ پورے چار مہینے سے کاڑھ رہی تھیں ہر ٹانکے پر وہ دعا کرتیں۔

"اللہ میرے مجتبیٰ کو ایک چاند سی بیوی عطا فرما۔"

اور کوئی ان سے پوچھتا کہ یہ دوپٹہ وہ کس کے لیے کاڑھ رہی ہیں' تو وہ کہتیں۔

"یہ میرے مجتبیٰ کی دلہن کے لیے ہے۔ یہ بیچ والی جگہ میں نے اس خوش نصیب کے نام کے لیے چھوڑی ہے۔ یہاں میں سنہری دھاگوں سے اس کا نام لکھوں گی ۔ بس اللہ مجھے وہ دن دیکھنا نصیب فرمائے۔ یہی میری اس ڈھلتی زندگی کی آخری خواہش ہے۔"

معاً حیدر کے رونے کی آواز پر ان کے جھریوں زدہ ہاتھ تھمے اور انہوں نے مڑ کر دیکھا تو مجتبیٰ اس کو گود میں اٹھائے باہر نکل رہا تھا۔ دادی کے چہرے پر حیدر کو دیکھتے ہی ایک مہربان مسکراہٹ پھیل گئی اور انہوں نے اپنا فریم سائیڈ پر رکھا اور ہاتھ پھیلا کر حیدر کو گود میں لے لیا۔

"وائی زما زڑگیا! (میرے دل) زما خوگ زڑگیا!" دادی اس کا ماتھا چومتی رہیں۔

مجتبیٰ مسکراتا ہوا کچن گیا اور پانی چولہے پر رکھ کر اس میں فیڈر رکھا۔ امی پراٹھا بنا رہی تھیں' مڑ کر اس کو منع کرنے لگیں۔ "میں بنا دوں گی بیٹا فیڈر۔"

"نہیں امی! خیر ہے کوئی بات نہیں۔ آپ ناشتہ بنائیں دادی کے لیے..... بلکہ میرے لیے بھی ..... اب اٹھ چکا ہوں تو..... ویسے بھی نیند نہیں آئے گی۔" وہ نرم لہجے میں کہتا حیدر کے لیے دودھ گرم کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد جب وہ فیڈر بنا کر باہر نکلا تو ڈھائی سالہ حیدر نیچے بیٹھا کھلونے والا جہاز ہاتھ میں پکڑا اڑا رہا تھا اور دادی اس سے ایسے باتیں کر رہی تھیں کہ جیسے وہ ان کی باتیں سمجھ رہا ہو۔

"حیدر..... بیٹا آؤ ادھر....." وہ حیدر کو گود میں اٹھا کر دادی کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ حیدر اب جہاز بھول کر فیڈر پی رہا تھا۔ مجتبیٰ کی نظریں فریم میں پھنسے دوپٹے پر پڑیں تو اس نے "پھر سے دادی؟" والی نظروں سے دیکھا اور دادی اس کی نظریں پڑھ کر کہنے لگیں۔

"مان جاؤ نا مجتبیٰ! کرلو شادی۔ دوسری شادی میں کیا قباحت ہے۔ اتنے مرد کرتے ہیں دوسری شادی ۔ اپنے لیے نہ سہی' حیدر کے لیے......" دادی کے لہجے میں منت تھی' درخواست بھی اور...... ایک نادیدہ دکھ بھی ...... جو اپنے خوب صورت' حسین جواں پوتے کو دیکھ کر ان کے دل میں کسی سوئی کی طرح چبھ جاتا تھا۔ "دیکھو! میرا دوپٹہ بھی مکمل ہونے لگا ہے!"

ان کے چہرے پر ایک ہی بات بار بار سننے کے بعد والی ناگواری چھا گئی۔

"بس یہ دوپٹہ حفیظ لالہ کے بیٹوں کے لیے سنبھال کر رکھ دیں۔" مجتبیٰ ہنسا تھا اور یہ آخر میں ہنسنے کی وجہ' اپنے لہجے کی کڑواہٹ کو اس میں چھپانا مقصود تھا۔ ورنہ روز روز ایک ہی بات کی رٹ نے اس کو حد درجہ بیزار کیا ہوا تھا۔ جانے اس گھر کے مکینوں کے پاس ڈسکس کرنے کے لیے "اس کی شادی" کا موضوع ہی بچ گیا تھا کیا؟۔

اور یہ سچ تھا کہ ان کے پاس بس یہی موضوع تھا۔ گھر کے ہر فرد کی زندگی' معمول پر آچکی تھی۔ سب پھر سے تین سال پہلے کی طرح ہنسی خوشی رہ رہے تھے۔ چٹکلے چھوڑے جاتے' آؤٹنگ کے لیے جاتے' حفیظ لالہ کے پورشن میں سردراتوں کو بون فائر کروائے جاتے' باربی کیو کرواتے یا پھر سیما آپا کی طرف بنا بلائے دعوت پر نکل جاتے ...... سب کی زندگیاں ویسی ہی تھیں' جیسے تین سال پہلے کے حادثے سے پہلے تھیں۔

سوائے مجتبیٰ خلیل کے ...... جس کی زندگی میں ٹھہراؤ آچکا تھا۔ اس کے رویے سے' اس کی عادتوں تک میں ایک جمود آچکا تھا۔ پورے گھر کا شوخ وزندہ دل لڑکا' ایسا خاموش ہو چکا تھا کہ جیسے وہ کبھی زندگی میں ہنسا ہی نہ ہو۔ اور اس سب کے پیچھے کی

pklibrary.com

وجہ "کائنات" تھی..... اس کی بیوی.....

مرحوم..... کائنات' اس کی بڑی بھابھی صدف (حفیظ لالہ کی بیوی) کی چھوٹی بہن تھی اور اس کی چچازاد۔ دونوں میں اچھی خاصی دوستی تھی۔ الگ الگ اسکول اور کالجز میں' لیکن ایک ہی کلاس میں پڑھنے والے دو دوست..... جن میں ہمیشہ مقابلہ ہوتا تھا اور اس کے لاپروا' بے فکرے پن کی وجہ سے ہمیشہ کائنات جیت جاتی تھی۔ وقت تیزی سے بدلا' ان کی منگنی ہوگئی اور پھر شادی..... شادی کے دوسرے ماہ ہی ان کو خوش خبری ملی۔ یہ مجتبیٰ کے بی ایس کا لاسٹ سمسٹر تھا اور کائنات نے سمسٹر فریز کروایا تھا۔ یہ نو ماہ ان کی زندگی کی خوشیوں سے بھرے دن تھے۔ وہ اس کا خوب خیال رکھتا تھا اور شائستہ بھابھی (ارسلان بھائی کی بیوی) اپنے شوہر کو چھیڑتیں' اس کی مثالیں دیتیں۔

پھر وہ سیاہ دن اس کی زندگی سے ساری روشنی بجھیں گیا۔ کائنات کی زچگی میں پیچیدگیاں ہوئیں' ڈاکٹرز کو آپریشن کرنا پڑا۔ دادی اور امی خوب رو رہی تھیں۔ صدف بھابھی نے واویلا مچایا ہوا تھا کہ آپریٹ نہ کریں۔ لیکن انہیں کرنا پڑا اور یوں حیدر کو جنم دیتے ہوئے' کائنات اس کو دیکھے بنا' اس کو خدا حافظ کہے بنا اس دنیا سے کوچ کر گئی۔

اس کے بعد مجتبیٰ' ویسا نہ رہا۔ کچھ مہینے تو وہ کمرے میں بند رہا۔ پھر حیدر کی موجودگی اس کو پگھلانے لگی اور وہ اپنے گرد بنائے خول کو توڑنے لگا۔ یونی ورسٹی سے آکر' وہ دو تین گھنٹے حیدر کے ساتھ بتاتا۔ پھر ابو کے ہوٹل کا ایک چکر لگا کر آجاتا اور پھر ساری رات حیدر کے ساتھ بیٹھا کارٹونز دیکھتا' اس کو کہانیاں سناتا۔ اس کی غیر موجودگی میں حیدر' زیادہ تر اپنی دادی اور پر دادی کے ساتھ ہوتا۔ پورے گھر کا لاڈلا تھا۔

اگرچہ دو سال تک کسی نے اس کی شادی کا ذکر نہیں کیا لیکن اب، سب اس کی شادی کے بارے میں بات کرنے لگے۔ اس موضوع پر اگر کسی کا اختلاف تھا تو وہ صرف مجتبیٰ تھا، البتہ صدف بھابھی شروع سے میں اپنی بہن کی جگہ کسی اور کو لانے کی سوچ پر خوب غصہ ہوتیں اور دکھی ہو کر رو پڑتیں۔ لیکن رفتہ رفتہ انہیں بھی احساس ہونے لگا کہ بھتیجی تو ابھی لڑکا ہے' اس کے آگے ایک لمبی عمر پڑی ہے.....!!

ناشتہ ختم کرنے کے بعد، ایک ایک کر کے سارا گھر والے جاگنے لگے۔ اس سے پہلے کہ ناشتے پر اس کی شادی کا ذکر چلتا' اس نے حیدر کو گود میں اٹھایا اور باہر نکل گیا۔ پیچھے دادی اس کو پکارتی رہ گئیں۔

☆☆☆

"اللہ بخشے میری ماں کو..... ایک دفعہ پڑوس کی شمیم باجی کی پہلی بیٹی کی پیدائش پر انہوں نے شمیم سے کہا تھا اللہ تمہیں ایک اور بیٹی بھی دے تاکہ اس بچی کی ایک رازداں ہو۔ دونوں ایک دوسرے سے اپنے دل کی بات کہہ سکیں۔ یہی بات انہوں نے پلوشہ کی پیدائش پر بھی کہی اور پھر تو زیتون بھابھی نے اس پر اتنی سنجیدگی سے عمل کیا کہ بیٹیوں کی ایک لائن لگا دی..... یوں جیسے پورے ملک کی بیٹیوں کے رازدار بنے کا فریضہ ملا ہو میرے بھائی کو....."

یہ تقریر نما کڑوی کسیلی باتیں' رخشندہ پھپھو کی تھیں اور یہ نہیں تھا کہ یہ تاریخی تقریر انہوں نے کسی خاص موقع پر کی تھی، یہ وہ تقریباً ہر جگہ' ہر محفل میں کیا کرتیں..... جب جب زیتون اور اس کی سات بیٹیوں کی بات چھڑتی۔

"ماسٹر فراز کی زندگی بھی جہنم بن چکی ہے' اللہ معاف کرے۔ اتنی مہنگائی میں تین نہیں سات سات لڑکیوں کو پالنا جن کو پرایا ہونا ہی ہے۔ اور سونے پر سہاگہ ساری کی ساری لڑکیاں پڑھائی بھی کر رہی ہیں۔" کسی خاندان والی پھپھو' خالہ کا رحم کھاتا لیکن آخر میں بے زار ہو جاتا لہجہ.....

اور ان سب باتوں پر نہ تو ماسٹر فراز کے ماتھے پر شکنیں ابھریں اور نہ ہی زیتون بی بی نے جواب دینا بہتر سمجھا ہو۔ وہ دونوں بہت تحمل سے بات سنتے اور آخر میں اللہ کا شکر ادا کر کے "بحث تمام شد" کرتے

۔لیکن اب یہ ایک دفعہ کی بات ہوتی' تو خیر تھا لیکن یہ تو معمول سا بن گیا تھا۔

حسین خان کے دو بیٹے شاہ جہاں' فراز اور تین بیٹیاں رخشندہ' رخسانہ اور روزینہ تھیں۔ شاہ جہاں اور گل ناز کے دو بیٹے کبیر اور زین تھے جبکہ فراز اور زیتون کی سات لڑکیاں تھیں جن میں پلوشہ کی شادی کبیر اور ماہین کی منگنی زین سے ہو چکی تھی۔

پلوشہ نے پشاور یونی ورسٹی سے مائیکرو بائیو لوجی میں ایم فل کیا ہوا تھا' اس کا آگے بھی پڑھنے کا ارادہ تھا لیکن تائی نے شادی کی تاریخ مانگ لی، اس شرط پر کہ وہ اسے آگے پڑھنے دیں گے لیکن شادی کے ایک مہینے بعد وہ مکر گئیں کہ کبیر کو ایسی لڑکیاں ذرا نہیں پسند۔ ابو کو رشتے کی نزاکت کے آگے خاموش ہونا پڑا' سو پلوشہ کو بھی.....

اگرچہ پلوشہ کو تایا اور اس کے بیٹوں کے مزاج کا پہلے سے پتا تھا مگر جو حقیقت اس کو کچھ عرصہ گزارنے پر پتا چلی' وہ انتہائی ناقابل برداشت تھی لیکن اس کو اپنی بہنوں کی خاطر، ہر بری بات برداشت کرنا پڑ رہی تھی۔

تایا فطرتاً کافی غصیلے تھے اور ان کے یہ شارٹ ٹیمپر والی جینز کبیر اور زین میں بھی بدرجہ اتم پائی جاتی تھیں۔ کب کس بات پر ان کا پارہ چڑھ جاتا' پتا نہیں چلتا تھا اور چونکہ فطرت پانی پر تیرتا ہوا کارک ہوتی ہے' جس کو جتنا دباؤ' اس کو اوپر آنا ہی ہوتا ہے۔

ان تینوں میں کبیر کچھ زیادہ ہی شارٹ ٹیمپر تھا۔ چائے میں چینی کم ہوتی' سالن میں تھوڑا نمک زیادہ ہو جاتا۔ اس کو شاید بہانہ چاہیے ہوتا تھا غصہ کرنے کا' اپنی فرسٹریشن نکالنے کا۔ اب تو وہ اس پر ہاتھ بھی اٹھانے لگا تھا۔ اس دن غلطی سے اس نے رات کو اس کی نیوی بلیو شرٹ استری کر دی تھی' حالانکہ اس نے سیاہ شرٹ کا کہا تھا۔ پہلے تو کبیر نے اس شرٹ کو چولہے پر رکھا' پگھل میں پڑا کولر تڑاخ سے لات مار کر توڑ دیا اور پھر جلتی شرٹ اٹھا کر اس پر پھینکی..... جلتی ہوئی قمیص سے چنگاریاں اس کے دودھیا پیروں پر پڑیں اور نشان ثبت کر گئی۔

تائی اس کو سمجھاتیں۔

''پلوشے! تم کیوں اس کو غصہ ہونے کا موقع دیتی ہو۔ دھیان دیا کرو' جو وہ کہتا ہے..... جو وہ چاہتا ہے..... تمہارے تایا کو دیکھو' وہ بھی ایسے ہی تھے۔ اور اب بھی ہیں لیکن اب میں ان کی فطرت کو سمجھ چکی ہوں۔ ان کا خیال رکھتی ہوں' جیسا وہ چاہتے ہیں۔''

آنسوؤں کا گولا اس کے حلق میں پھنسا اور ایک خاموش آنسو کی لکیر اس کے چہرے پر بہنے لگی۔ جب بولی تو اس کی آواز میں منہدم ہوتے شہروں کی وحشت اور ویرانی تھی۔

''کوشش..... کوشش کرتی ہوں' تائی۔ ہر چیز کا خیال رکھتی ہوں۔ اس کا ردعمل کا اتنا شدید ہوتا ہے کہ سوچ کر کچھ نہ کچھ غلط ہو جاتا ہے..... میں کوشش کرتی ہوں.....'' آخر میں اس نے کہنا چاہا کہ وہ غلطیاں اتنی بڑی نہیں ہوتیں کہ نظر انداز نہ کی جا سکیں۔ لیکن وہ جانتی تھیں کہ یہ جملہ پھر کبیر کے گوش گزار ہو چکا ہوگا.....!!

اس لیے اس نے خاموشی اختیار کرنا شروع کی اور ہر درد چھپانا بھی.....! ابھی ابو کے گھر جانے سے پہلے وہ ہر داغ' ہر زخم کو کنسلر سے چھپا رہی تھی اور ایک مسکراہٹ بھی اپنے چہرے سجاتی تھی۔ جو سب سے مشکل کام تھا۔ انتہائی مشکل۔ اپنا درد چھپا کر مسکرانا' واقعی میں دنیا کا مشکل ترین کام ہوتا ہے کہ آپ چاہتے بھی ہوں کہ لوگ، آپ کا درد سمجھیں لیکن پھر بھی اپنے بھرم اور عزت نفس کی خاطر آپ کو چھپانا پڑ رہا ہو.....!!

☆☆☆

''کبیر کیسا ہے' مہینے ہو گئے یہاں چکر لگائے ہوئے۔'' زیتون بی بی' تائی سے پوچھ رہی تھیں جو پلوشہ کے ساتھ دیور کی تیمارداری کرنے آئی تھیں۔ تائی کے چہرے پر تاثرات فوراً بدلے۔

''کیا کہوں' زیتو نے! بے چارہ پورا دن خوار ہوتا ہے۔ بینک کی منیجری بھی دماغ خراب کر دیتی ہیں۔ اتنا حساب کتاب کرنا۔ دیکھا نہیں ہے لوگوں کی لانبی لگی

ہوتی ہیں بیٹوں میں۔ اس دن گئی تھی ہسپتال میں۔ دیکھا تھا میں نے کتنا رش ہوتا ہے۔" آخری جملوں میں ان کا لہجہ ایسا ہو گیا کہ لمحے بھر میں وہ دنیا کی سب سے لاچار اور بیمار عورت بن گئی ہوں۔

"مجھے اندازہ تھا کہ تائی نے اپنی ہمدردی بٹورنے کے لیے کچھ نہ کچھ کہہ دینا ہے۔" مینو ہنسی تھی اگرچہ اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔ کچن کی کھڑکی باہر صحن میں کھلتی تھی، جہاں چارپائی پر لیٹے ابو اور پاس دوسری چارپائی میں تائی اور امی بیٹھی تھیں۔ پلوشہ مینو کے ساتھ کچن میں کھڑی چائے بنا رہی تھی۔

"خیر تو تھی ناں بھابی جان؟ ہسپتال کیوں گئی تھیں۔" امی نے تائی سے پوچھا تائی کو تو موقع چاہیے تھا۔

"لو تمہیں پلوشہ نے نہیں بتایا کچھ؟ سارا دن تو اس مینو کے ساتھ موبیل (موبائل) پر لگی ہوئی ہوتی ہیں گھر کی سیکنڈ سیکنڈ کی بات بتائی رہتی ہے۔ یہ نہ ہو سکا کہ تائی کی صحت کا بھی بتا دے۔ بھئی نیک بخت! جتنا میں اس کو بیٹی سمجھتی ہوں، قسم سے اگر اس نے مجھے ماں سمجھا ہو بھی۔" تائی کا لہجہ روہانسا ہوا اور آخر میں آواز دھیمی کر کے، دوپٹے کا پلو منہ پر رکھ کر چند سسکیاں بھریں۔

"اور یہ ملتا ہے...... ساس کی خدمتیں کرنے والی بہو کو ان کی طرف سے نوبل پرائز!" مینو نے صحن کی اور ہاتھ پھیلا کر کے، کورنش بجالانے والے انداز میں پلوشہ کو کہا، جس کا چہرہ لمحے بھر میں تاریک ہو چکا تھا۔

"ارے ارے بھابی جان۔ ایسا نہیں ہے۔ اس پورے ہفتے میں اس کی طرف سے کوئی فون تک نہیں آیا۔ میں کل مینو کو کہہ رہی تھی کہ ذرا خبر لو کہ میری بیٹی کس حال میں ہے، ایک ہفتے سے بات نہیں ہوئی۔" امی نے ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی، جو کہ ایک اور انگارہ ثابت ہوئی۔

"کیوں زیتون بی بی؟ کس حال میں ہو گی کا کیا مطلب؟ ہم نے کیا باندی بنا کر رکھا ہے خدانخواستہ۔"

"یا خدایا گل تازے خور! یہ کیا آپ ہر بات کو منفی رنگ دیئے جا رہی ہیں۔ بچی ہے، بھول گئی ہوگی۔ ہم تیمارداری کرنے نہ آئے، خیر ہے کوئی بات نہیں۔ وہ تو آپ کی خدمتیں کرتی رہی ہوں گی ناں۔ اپنی تربیت پر یقین ہے مجھے اتنا۔" ابو جو اتنی دیر تک خاموش بیٹھے تھے بولے اور ان کا بارعب لہجہ نا چاہتے ہوئے بھی تائی کو خاموش کر گیا۔ چند لمحے خاموشی رہی اور پھر ابو خود ہی اٹھ کر کمرے میں چلے گئے، جاتے سے انہوں نے کچن میں سر جھکائے خاموش کھڑی پلوشہ کو دیکھا، جس کی آنکھوں میں اداسی ہی اداسی تھی۔

"ابو کو بھی کیا سوجی تھی، اس مینٹل اسائلم جیسے گھر میں رشتے کرنے کی؟" مینو نے کڑھ کر اس سے پوچھا، وہ ٹرے میں چائے کے کپ رکھ رہی تھی۔ معاً اس کے ہاتھ سے کپ پھسلا، اور چھناکے کی آواز کے ساتھ فرش پر گر کر چکنا چور ہو گیا۔ مینو جو جھک کر کرچیاں سمیٹ رہی تھی، رک کر حیرت سے پلوشہ کو دیکھنے لگی۔ جو سہم کر دیوار سے لگی، لمبی لمبی سانسیں لے رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں وحشت، چہرے پر خوف تھا اور مینو یک ٹک اس کے پیروں پر لگے کینسلر کو دیکھے جا رہی تھی۔

☆☆☆

"کبیر بھائی آپ کو مارتے ہیں؟" مینو بے یقینی سے اس کے سامنے بیٹھی تھی جس کا سر یوں جھکا تھا کہ جیسے وہی مجرم تھی۔ تائی کو چائے دینے کے بعد وہ ہاتھ پکڑ کر اس کو کمرے میں لے آئی، اور اس کے کنسیلر زمٹا کر اس کے داغ کو یک ٹک دیکھے جا رہی تھی۔ "کب سے چھپا رہی ہو یہ سب پلوشہ باجی؟"

پلوشہ کا ذہن کئی بہانے تراش رہا تھا، جیسے یہ چائے گر گئی تھی اور سبزی کاٹتے ہوئے ہاتھ کٹ گیا اور بال اسٹریٹ کرتے ہوئے گردن جل گئی تھی۔ لیکن جانے کیوں، ہر بہانہ اس کی زبان پر دم توڑ رہا تھا۔

"میں ابو کو بتاؤں گی یہ سب۔ کس حق سے وہ یہ سب کر رہا ہے؟" غصے سے کہتی مینو اٹھی، پلوشہ نے فوراً اس کی کلائی تھامی۔ مینو کی نظریں اپنی کلائی سے

pklibrary.com

ہوتی ہوئی' اس کے چہرے تک گئیں۔ اس کی آنکھیں منت کر رہی تھیں۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ایسی کوئی بات ہو جو اس کی بہنوں کے لیے رکاوٹ کا باعث بنے۔

"پلیز امینو...... ایسا کچھ نہیں ہے...... تم بلاوجہ نیگٹیو سوچ کر اس کو ایگزیجریٹ کر رہی ہو۔ ابو کی طبیعت ویسے بھی خراب ہے مینو' ان کی ای سی جی رپورٹ قابل تشویش ہے۔ ایسا کچھ مت کہنا تم' پلیز۔ میں ٹھیک ہوں۔" اس نے جتنی بھی کوشش کی اپنا لہجہ مضبوط بنانے کی' آخر میں اس کا لہجہ ٹوٹ ہی گیا۔

مینو نے خفگی سے اپنا ہاتھ جھٹکا تھا اور ناراضی سے منہ پھیر کر بیٹھ گئی۔ پلوشہ کے جانے تک' مینو نے اس سے ایک بات تک نہ کی۔ جو کہ امی نے بھی محسوس کیا اور کبیر نے بھی...... جو رات کو اس کو لینے آیا تھا۔

گاڑی میں بیٹھنے کے بعد وہ ناگواری سے اس سے پوچھ رہا تھا۔ "یہ مینو مجھے ایسے ناگواری سے کیوں دیکھ رہی تھی؟"

پلوشہ نے کھڑکی کے پار دیکھتے ہوئے' کھوئے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔ "ابو کی طبیعت کی وجہ سے کافی چڑچڑی ہو گئی ہے شاید۔ مجھ سے بھی بات نہیں کی اس نے پورا دن۔"

کبیر "ہونہہ" کہتا سامنے دیکھنے لگا اور وہ دور اس بچے کو دیکھ رہی تھی، جو گاڑی کے سامنے کھڑا اس مسکراتے کپل کو گجرے خریدنے کے لیے اکسا رہا تھا اور وہ اس بچے سے ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ وہ آدمی اب خوب صورت گجرا لے کر اپنی بیوی کی دودھیا کلائیوں میں پہنائے گا اور اس کی بیوی کا چہرہ شرم سے لال ہو جائے گا...... شاید وہ لاڈ سے مسکرا بھی دے......

وہ محرومی سے سوچے جا رہی تھی۔

☆☆☆

"کیا مطلب گجرے نہیں لو گے میرے لیے؟" یک ٹک اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی...... جن میں شرارت چھپی تھی۔

مجتبیٰ کی نظریں گجرے والے بچے کی تلاش میں گھوم رہی تھیں۔ ہونٹوں پر دبی دبی مسکراہٹ اور پورے پشاور کی روشنیاں سمیٹے آنکھیں مڑ کر اس کو دیکھنے لگیں' جو منہ بسورے ہوئے تھی۔ کتنی کیوٹ لگ رہی ہے' اس نے سوچا تھا۔

"گجرے لینے کی لاجک کیا ہے اور...... اور بیگم میں ایک غیرت مند پختون ہوں۔ بیوی کو گجرے پہناؤں گا؟" ابرو اچکا کر طنز میں ڈوبا لہجہ۔ کائنات کو تو مانو آگ ہی لگ گئی۔

"اس غیرت مند پٹھان کی غیرت کہاں مر گئی تھی؟ جو نکاح سے پہلے بکے لایا کرتا تھا چپکے چپکے؟ جو بھی ہو...... مجھے تو گجرے چاہئیں...... بس......!!" کائنات کا چہرہ غصے سے لال تھا۔ وہ اس کے تاثرات دیکھ کر ہنس پڑا اور اسی وقت اس کو گجرے والا بچہ دکھ گیا......

"رورا (بھائی)! سگنل کھل گئے ہیں۔" پیچھے سے عجلت بھرے انداز میں بجتے ہارن اور شیشہ بجاتا ٹریفک والا اس کو یوں جیسے عالم تنویم سے گھسیٹ کر لے آیا۔ وہاں ایک نیا بچہ ہاتھ میں گجرے لیے کھڑا تھا۔ ایک دکھ بھری مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی۔ برابر میں دیکھا تو حیدر کا ٹیبلٹ آن تھا اور وہ سو چکا تھا۔

وہ حیدر کو رنگ روڈ پر نیا نیا بنتا وی پلے گھمانے لایا تھا۔ گھر کے باقی بچے امینہ بھابھی (مرتضیٰ بھائی کی بیوی) کے بھائی کی منگنی میں گئے تھے۔ چونکہ امی نہیں گئیں تو اس نے صدف بھابھی کے کہنے پر بھی حیدر کو نہیں بھیجا کہ اس کا خیال کون رکھ پائے گا منگنی میں...... اور مزید بھابھی کا ایونٹ بھی سپوائل ہو جائے گا...... تو وہ اس کو وی پلے لے کر آ گیا۔ حیدر نے خوب انجوائے کیا۔

گھر آیا تو سب بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ صدف بھابھی تیار کھڑی' حفظ بھائی سے تصویریں کھنچوا رہی تھیں اور باقی بھابھی کی فوٹو شوٹ دیکھ رہے تھے وہ ان کے اسٹائل پر خوب لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ وہ ہلکا سا مسکرا کر حیدر کو سلا کر نیٹ فلیکس لگا کر بیٹھ گیا۔

pklibrary.com

لوگ کہتے ہیں' وقت زخم بھر دیتے ہیں' لیکن ایسا وہ نہیں سوچتا تھا۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کا زخم ہرا ہوتا۔ کائنات کی ہنستا مسکراتا چہرہ' ایک پل کے لیے اس سے نہیں بھولتا تھا۔ جب جب وہ حیدر کو دیکھتا' اس کے سامنے کائنات آ کھڑی ہوتی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ دوسری شادی کے بہت خلاف تھا۔ اگر وہ عورت اس کو حیدر سے دور کردے' اور روایتی سوتیلی ماؤں کی طرح اس کے ساتھ برا کرے..... جس کی بھی اس کو خبر ہی نہ ہو اور اس کا بیٹا چپ چاپ سفر کرے.....

کائنات کو کتنا دکھ ہوگا؟ کیا وہ اس کو پھر معاف کردے گی؟۔ ایک بار پھر وہ اپنے احتسابی کٹہرے میں کھڑا تھا۔ اس کا دل اچاٹ گیا اور اس نے لیپ ٹاپ بند کردیا۔ اسی وقت امی دروازہ کھٹکھٹا کر اندر داخل ہوئیں تو ان کے ہاتھ میں چائے تھی۔

''کیسا رہا دن؟'' امی اس کو چائے پکڑا کر نرم لہجے میں پوچھ رہی تھیں۔

''اچھا رہا امی..... حیدر نے خوب انجوائے کیا.....''

امی کچھ دیر بیٹھی رہیں' پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر نرمی سے دبایا اور وہ سمجھ گیا کہ وہ آگے کیا کہنے والی ہیں۔

''مجتبیٰ! اب تو مان جاؤ..... دیکھو حیدر ابھی چھوٹا ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ ہر سوتیلی ماں کہانیوں اور ڈراموں کی طرح ظالم اور.....'' امی کا لہجہ نم ہو رہا تھا۔

مجتبیٰ نے ان کی بات بیچ میں کاٹی۔ ''امی پلیز let not discuss this! میں بہت تھک گیا ہوں' نیند آ رہی ہے۔''

امی نے دکھ سے دیکھا اسے اور پھر کپ اٹھا کر باہر نکل گئیں۔ ساری رات وہ کائنات کی یادوں میں جاگتا رہا۔ صبح نماز پڑھ کر سویا کہیں.....!

☆☆☆

شام کی نیلگوں روشنیاں ہر سو پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ تائی کے ساتھ بازار گئی تھی۔ اس نے یہ سوچ کر بازار سے ہی کھانے کی کچھ چیزیں خریدیں کہ شاید کبیر آ چکا ہو۔ جیسے ہی وہ لوگ گھر پہنچے' کبیر واقعی میں آ چکا تھا۔

''کہاں گئی تھیں تم؟''

اس کا لہجہ اس کے برے موڈ کا غماز تھا۔

''تائی کے ساتھ بازار.....'' اتنا کہہ کر وہ اس کے دور پھینکے گئے جرابیں' ٹائی اور جوتے سمیٹ کر اپنی جگہ پر رکھنے لگی۔ کبیر نے اس کے بعد جواب میں کچھ نہیں کہا اور وہ بھی اس کے کپڑے نکال کر کچن آ گئی۔

جلدی سے سلاد بنا کر پلاؤ اور کڑھی نکال کر' وہ اپنے کمرے چلی آئی۔ تائی شام کی نماز پڑھ رہی تھیں۔ کبیر نے ٹرے میں سجا بازار کا کھانا دیکھا اور پھر اس کو مڑ کر دیکھ کر پوچھنے لگا۔

''یہ کیا ہے؟''

''تائی نے کہا تھا کہ بازار سے کھانا لیتے جائیں گے' پھر اتنا ٹائم نہیں ہوگا..... کھانا بنانے کا.....'' اس کی آواز کبیر کے بدلتے تاثرات دیکھتے ہوئے دھیمی پڑنے لگی۔ دلیل دیتی آواز آخر میں جرم قبول کرنے والی مجرم آواز بن گئی۔

ایک استہزائیہ ہنکارا بھر کر کبیر نے اس کو دیکھا۔ ''تائی نے کیا کہا تھا؟''

''کہ..... بازار سے.....'' اس سے جملہ مکمل نہیں ہو پا رہا تھا۔ اس کا نچلا ہونٹ لرزنے لگا۔

کبیر نے ٹرے کو ہاتھ مار کر گرایا۔ ''تائی نے یہ کہا تھا' تائی نے وہ کہا تھا۔ کس اسلام میں یہ کہا گیا ہے کہ بیوی کوئی بھی کام کرنے سے پہلے شوہر کے بجائے ساس کی اجازت لے گی؟''

کبیر کے گلے کی رگیں ابھریں اور چہرہ سرخ پڑنے لگا۔ پلوشہ کا نچلا لب لرزنے لگا۔ کبیر کے غصے کی آواز سن کر تائی بھی چلی آئیں۔ پلوشہ نے مڑ کر تائی کو مدد چاہتی نظروں سے دیکھا تائی آگے بڑھیں۔

''کیا ہوا ہے؟ کیوں غصہ ہو رہے ہو؟''

تائی ایسے سوال کر رہی تھیں کہ جیسے ان کو اپنے بیٹوں کی فطرت کا پتا نہیں تھا۔ پلوشہ سر جھکائے اپنے آنسو پینے لگی۔

"پوچھیں اس سے...... پوچھا تھا اس نے مجھ سے کہ یہ بازار جائے؟ اور...... بندہ سارا دن تھک ہار کر گھر سکون کے لیے آتا ہے۔ بازاری کھانوں سے بچنے کے لیے صبح سے لے کر شام تک بھوکا رہتا ہے...... کہ گھر کا پکا ہوا کھانا کھائے گا۔ لیکن یہاں محترمہ، اس پھوہڑ ناکارہ عورت کو ذرا اگر کھانا بنانا آتا ہو۔ اور اس پر یہ کہ بازار سے لے آئی ہے کھانا...... اب یہ نئی عیاشی سیکھ لی۔" وہ غصے سے چلا رہا تھا اور بات کرتے کرتے پلوشہ کی طرف یوں بڑھتا جیسے اس کو مارنا چاہ رہا ہو...... تائی اس کے سامنے آ کھڑی ہوئیں اور اس کو بازو سے پکڑ کر پیچھے کیا۔

"غصہ تھوکو میری جان۔ کوئی بات نہیں۔ جاؤ پلوشہ جلدی سے لوبیہ پکا لو اور کچھ سیخ کباب بھی فریج رکھے ہیں، انہیں بھی تل دو۔" تائی بیٹے کو شانت کرنے کے بعد اس کو ہدایات دینے لگیں۔

وہ فوراً سے پیشتر کمرے سے باہر نکلی اور روتے ہوئے کچن میں کھانا تیار کرنے لگی۔

کچھ دیر بعد تائی بھی کچن میں داخل ہوئیں۔

"دیکھو پلوشہ بیٹا۔ اس کو بازار کے کھانے پر غصہ نہیں تھا۔ تمہارے اس سے اجازت نہ لینے پر تھا۔ اگلی بار اس سے اجازت لے کر جانا۔" تائی اس کو گلے لگا کر دلاسہ دے رہی تھیں۔ بجائے اس کے، کہ تائی اپنے "غیرت مند" بیٹے کو کہتیں کہ میرے ساتھ گئی تھی...... وہ الٹا اس کو سمجھا رہی تھیں......

مینو ٹھیک کہتی تھی۔ تائی کبھی غلطی نہیں مانتیں، ہمیشہ وکٹم بنتی ہیں۔

"اچھا پلوشہ...... میں یہ لے کر جاتی ہوں، تم میرے شہزادے کے لیے ایک کپ چائے بنا دو...... کڑک سی......" تائی ٹرے اٹھا کر اس کو ایک نیا آرڈر دے کر چلی گئیں۔

وہ چائے چڑھا کر بالکل اس کے سامنے بت بنی کھڑی رہی...... کیا اس کی عادی ہو گئی۔

☆☆☆

آج سیما آپا آئی تھیں اور ان کی بیٹیاں بھی...... گھر میں خوب رونق تھی۔ رات کو سب نے باربی کیو کا پروگرام بنایا۔ صدف بھابھی چائے بنا کر سرو کر رہی تھیں۔ حفیظ لالہ تکوں کو مسالا لگا رہے تھے، ارسلان بھائی ان تکوں کو سیخ میں پرو رہے تھے۔ ایسے موقعوں پر جب سارا خاندان اکٹھا ہوتا اور ایسے پروگرامز بنتے تو اس کے سارے کام مرد کرتے تھے۔

دادی حیدر کو گود میں سلائے ہوئے، اپنی بہن سے فون پر بات کر رہی تھیں اور باقی خواتین سیما آپا کے گرد بیٹھی، ان کی نند کی متوقع شادی اور سسرال کے بارے میں محو گفتگو تھیں۔

مجتبیٰ دور بیٹھا، انسٹا اسکرول کر رہا تھا۔ اس کو پی ایچ ڈی کے لیے اپلائی کرنا تھا۔ کسی دوسرے ملک نہ سہی، قریب پشاور یونی ورسٹی میں ہی کر لینا چاہیے۔ وہ سوچ رہا تھا۔

"چائے؟" صدف بھابھی اس کو چائے دے رہی تھیں۔

"نہیں بھابھی، شکریہ۔ موڈ نہیں ہے۔" وہ لمحے بھر کے لیے مسکرایا۔ اگرچہ اس کا موڈ یہاں بیٹھنے کا بھی نہیں تھا لیکن یہ وہ امی کے لیے کر رہا تھا تاکہ خفا نہ ہو۔

"مجتبیٰ! ادھر آؤ ذرا...... آگ لگانے میں ہیلپ کرو۔" مرتضیٰ بھائی اس کو مدد کے لیے بلا رہے تھے۔

"مرتضیٰ بھائی! غلط انسان کو بلا رہے ہیں آپ۔ یہ کام تو آپ کی زوجہ بخوبی کر سکتی ہیں۔" شائستہ بھابھی ہنس کر بولیں۔ (شائستہ اور امینہ بہنیں تھیں)

"نہیں ناں، ان کی یہ صلاحیت خاص موقع کے لیے پریزرو کی ہوئی ہے۔" امینہ بھابھی سے پہلے مرتضیٰ بھائی نے جواب دیا۔

وہ مرتضیٰ بھائی کے ساتھ بیٹھ کر لکڑیاں جلانے

pklibrary.com

لگا۔ سیما آپا نے اس کو قریب دیکھا تو امی سے کہنے لگیں۔

"امی! شمع کی شادی میں ایسی خوبصورت لڑکی دیکھی ہے ناں۔ آپ دیکھیں گی تو اش اش کر اٹھیں گی۔ ایسا حسین سراپا، نیلی آنکھیں، گوری رنگت۔ اور سونے پر سہاگہ یہ کہ ایم فل کر چکی ہے انگلش لٹریچر میں۔" سیما آپا اب موبائل کھول کر ان کو تصویر دکھا رہی تھیں اور ساری خواتین سب کچھ بھول بھال سیما آپا کے گرد دائرہ بنا کر تصویر دیکھنے لگیں۔

وہ ضبط کر کے یوں بیٹھا رہا کہ جیسے بہرہ ہو۔ معاً سیما آپا موبائل لے کر اس کے پاس آئیں اور اس کو تصویر دکھانے لگیں۔ "دیکھو...... کتنی پیاری ہے...... میں نے تو اس کے گھر میں بات تک......"

اس کے ضبط کا پیالہ چھلکا اور وہ آپا کا ہاتھ جھٹک کر اٹھا۔

"فار گاڈ سیک! بس کر دیں۔ چھوڑ دیں مجھے اکیلا۔ نہیں کرنی مجھے شادی۔ آپ سب اپنی ہمدردی اپنے پاس سنبھال کر رکھیں۔ گھر کے بچے کپلو کو دیکھ کر میرے لیے فکر مند ہونا چھوڑ دیں۔ میں اپنی زندگی میں ٹھیک ہوں۔ کیوں ایک بات کی رٹ لگا رکھی ہے" وہ غصے سے تن فن کر کے باہر نکل گیا۔ سب تاسف سے اس کو جاتا دیکھتے رہ گئے۔ ارسلان بھائی اس کے پیچھے نکل گئے۔

"سیما غلط جگہ بات چھیڑ دی۔" دادی ناگواری سے سیما آپا کو کہہ رہی تھیں اور سیما آپا جو پہلے تو اس کے رویے پر خفا ہو چکی تھیں۔ اب برا فیل کر رہی تھیں۔ ان کو واقعی میں ایسے موقع پر یہ موضوع نہیں چھیڑنا چاہیے تھا۔

☆☆☆

"دو سال ہو گئے ہیں، گل نازے! ابھی تک گھر میں بچے کی قلقاریاں سنائی نہیں دے رہیں۔ کسی ڈاکٹر کو دکھاؤ۔ یہ پشاور میں شیر پاؤ کے پاس ہی ڈاکٹر فوزیہ ہے۔ اتنی قابل ڈاکٹر۔ میری نند نے جب سے اس سے علاج کروایا ہے، تب سے ماشاءاللہ تین بیٹے ہیں اس کے۔" رخشندہ پھپھو، تائی کی تیمار داری کے لیے آئی ہوئی تھیں اور ان کو مشورے دے رہی تھیں۔ بالخصوص یہ بات انہوں نے تب چھیڑی، جب انہوں نے سامنے سے پلوشہ کو آتے دیکھا۔

وہ چائے رکھتی، پاس ہی بیٹھ گئی۔

"جانے کیسی قسمت پائی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ شادی کے بعد لڑکے ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ نیم جیسے کڑوے، شہد میں بدل جاتے ہیں۔ ایک میرا بیٹا ہے جو ہر گزرتے دن پلوشہ کی غلطیوں و نادانیوں کی وجہ سے کڑوا اور چڑچڑا ہوتا جا رہا ہے۔" تائی نمناک لہجے میں کہہ رہی تھیں۔ پلوشہ کا ان کی بات پر آن کی آن میں چہرہ سرخ پڑ گیا اہانت سے۔ رخشندہ پھپھو نے ناگواری سے اس کو دیکھا۔

"اے پلوشے! تم ایسے کام کرتی کیوں ہو کہ شوہر غصہ ہو؟ مرد تو ہوتے ہی غصیلے اور بالخصوص پختون۔ آج کل کی لڑکیاں ایسی ہیں کہ ادھر کچھ بولا نہیں اور آنسو آنکھوں میں محفل سجا بیٹھتے ہیں۔ بھئی، ہم نے تو اتنی ماریں کھائیں، لیکن دیکھو اپنی قابلیت اور سگھڑاپے سے ان کی عادتوں کو بدلا ہم نے۔ تم بھی بیٹا ذرا خیال رکھا کرو شوہر کا۔" رخشندہ سمجھانے والے انداز میں کئی تیر چھوڑ کر اب چائے کی چسکی لینے لگیں۔ "اے بیٹا! اتنی چینی ڈال دی ہے۔ خوب جانا ہے کہ مجھ بڑھیا کو شوگر ہے۔"

رخشندہ پھپھو کی شکایت پر اس نے تائی کے چہرے پر ناگواری دیکھی، جو رخشندہ پھپھو کو نظروں میں کہہ رہی تھیں کہ...... "دیکھا؟"۔ اور بجائے اس کے وہ کہتی پھپھو میں نے تو اس میں چینی ڈالی ہی نہیں ہے۔ اس نے نرم لہجے میں کہا۔

"لائیے، میں نئی چائے بنا کر لاتی ہوں۔"

رخشندہ پھپھو اس کو چائے پکڑا کر، تائی سے نظروں میں بات کرنے لگیں۔ جب وہ کچن میں چلی گئی تو ناگوار لہجے میں کہنے لگیں۔

"بھئی، برحق غصہ کرتا ہے کبیر۔"

pklibrary.com

☆☆☆

اگرچہ یہ اولاد کا طعنہ پہلی بار نہیں ملا تھا اور نہ ہی وہ پہلی بار کسی گائنا کولوجسٹ کے پاس گئی تھی۔ تائی بہت پابندی سے اس کو نت نئے ڈاکٹرز سے علاج کروانے لے جایا کرتی تھیں اور یہ سلسلہ شادی کے دوسرے مہینے سے شروع ہوا تھا۔

مینو کو یہ بات بہت بری لگتی۔ ”آپ ایجوکیٹڈ جاہل ہو پلوشہ باجی! ابھی تو شادی کو ایک سال نہیں ہوا اور آپ نے علاج شروع کر دیا ہے..... سیریسلی؟ وہ ’ریسرچ‘ کی عادت‘ کہاں گئی جو ہر چیز پر گھنٹوں ریسرچ کرتی تھیں؟“

”مینو! شادی کے بعد ساری ترجیحات بدل جاتی ہیں پھر جب ایسے معاشرے میں رہ رہے ہو آپ‘ جہاں بڑوں کی چلتی ہیں یا پھر شوہر کی۔“

اس کے جواب پر مینو طنزیہ ہنکارا بھرتی‘ پھر افسوس سے اس کو کہتی کہ ’آپ دیوار بن چکی ہو۔ ساکت‘ جامد۔“

اور وہ کسی حد تک ٹھیک بھی تھی۔ ہر کسی نے اس کو‘ اس کی بہنوں کو یہ طعنے دیے ان کے باپ پر کتنی بڑی بوجھ ہیں۔ سات بہنوں کا بوجھ۔ پڑھانا لکھانا تو چھوڑو‘ ایک سرکاری اسکول کے ٹیچر کی تنخواہ میں اتنا بھرا پرا گھر سنبھالنا۔ سوان کے جہیز کا بوجھ‘ جہاں جہیز اتنا بنایا جاتا ہے کہ جتنا ایک نئے گھر کا پورا سامان.....!

وہ سب کچھ بس اس لیے سہہ رہی تھی کہ ایسا نہ ہو‘ کہ وہ ایسا قدم بھی نہ اٹھائے جو کہ بہنوں کے لیے طعنہ نہ بن جائے .....اور ان کے رشتوں میں رکاوٹ نہ ہو۔

مینو اس پر کڑھتی تھی۔

امی اس پر خاموش تھیں۔

اور ابو بے خبر تھے.....امی نے یا تو بھرم رکھنے کے لیے کبھی ان سے کچھ نہیں کہا تھا اور یا پھر اس کا رشتہ ٹوٹنے کے ڈر سے.....

لیکن یہ ڈر ایک دن سامنے آ گیا جس رشتے کو وہ مضبوطی سے تھامے ہوئے تھی وہ خود اس کی گرفت سہہ نہ سکا اور ٹوٹ گیا۔

وہی روزمرہ خوف میں مبتلا کرنے والی شام کا قصہ ہے۔ کئی بار کھانا چکھنے کے باوجود بھی اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ جیسے ہی کبیر کی گاڑی گھر میں داخل ہوئی‘ اس کے چہرے پر تنے تاثرات نے اس کے اوسان خطا کر دیے تھے۔ یہ وہ تاثرات تھے‘ جو عموماً اس کی مار پیٹ کا سبب بنتے تھے۔

وہ کھانا لے کر جیسے ہی گئی‘ کمرے میں خلاف معمول اندھیرا تھا اور کبیر فون پر کسی سے لڑ رہا تھا۔ اس نے خاموشی سے لائٹ آن کی اور کھانا اس کے سامنے رکھا۔

جیسے ہی وہ باہر نکلی تھی‘ اس نے گلاس ٹوٹنے کی آواز سنی تھی۔

”کیا ہوا؟“ وہ بھاگ کر واپس کمرے میں گئی۔ کبیر کا چہرہ انتہائی سرخ تھا اور کنپٹی کی رگیں ابھری ہوئی تھیں۔

”جہنم بنا دی ہے تم نے میری زندگی۔“ وہ اٹھ کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا اور اس کو گلے سے پکڑ کر کہنے لگا۔ اس کی آنکھیں ابلنے لگیں۔ ”تمہاری وجہ سے میں لیٹ ہو گیا آج‘ تمہاری وجہ سے میں نے آج اتنی باتیں سنی۔ اتنا بڑا پروجیکٹ میرے ہاتھ سے نکل گیا۔“

”آپ نے خود..... کہا تھا کہ..... دس بجے جائیں گے آپ.....“ اس نے کھانستے ہوئے بمشکل اپنی بات مکمل کی۔ اس کے ہاتھ کی گرفت مضبوط تھی‘ یوں جیسے وہ یہ غصہ وہ بہت عرصے سے دبائے بیٹھا تھا۔

معاً اس نے پلوشہ کو چھوڑا اور ایک زناٹے دار تھپڑ رسید کیا‘ پلوشہ چکرا کر گری اور اس کا ماتھا میز سے لگا۔ خون کی ایک دھار آن کی آن میں پھوٹی۔

”بدزبان عورت۔ رحم کھا کر میں نے اس شادی پر رضامندی دی تھی کہ چچا کی اتنی بیٹیاں ہیں۔ اتنی کہ فقیر بیاہنے آئے تو فوراً بیاہ دی جائے۔ لیکن

یہ رحم تو میرے ہی گلے کا پھندہ بن گیا۔ ہر وقت میں اس رحم کی وجہ سے ذلیل ہوتا ہوں۔ کھانا پکانا اس کو نہیں آتا' بانجھ یہ ہے۔ بدزبان' بے حیا' نافرمان عورت۔'' اس کا غصہ کنٹرول نہیں ہو رہا تھا اور وہ جو نیچے ماتھے پر ہاتھ رکھے ہوئے تھی' یک ٹک سر اٹھائے اس انسان کو دیکھ رہی تھی...... جس کی ایک ایک بات اس کی عزت نفس کی دھجیاں اڑا رہی تھیں۔

کبیر کے چیخنے کی آواز سن کر' سب دوڑ کر کمرے میں چلے آئے۔ تائی نے پہلی نظر میں فرش پر پڑی کھانے کے پلیٹوں کو دیکھا اور پھر پلوشہ کو...... ان کے چہرے پر ناگواری پھیل گئی یوں جیسے وہ اب تسلیم کر چکی تھیں کہ ان کا بیٹا برحق غصہ کرتا تھا۔

''ختم ہو گئی ہے میری برداشت۔ میں اب اس عورت کو برداشت نہیں کر سکتا۔ میری طرف سے فارغ ہے۔ طلاق دیتا ہوں میں اس کو۔'' میز کو ٹھوکر مارتا وہ کہہ رہا تھا اب تائی کے اوسان خطا ہوئے۔ وہ فوراً آگے بڑھیں۔ کبیر کو جھنجھوڑا۔

''اللہ کا واسطہ دے رہی ہوں' آگے ایک لفظ مت کہنا۔''

تایا بھی چیخ رہے تھے۔ لیکن کبیر کا غصہ کسی طور کنٹرول نہیں ہو رہا تھا اور اس نے وہ جملہ دو دفعہ مزید دہرایا۔ تائی کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے اور چہرہ سفید......

اور وہ...... پلوشہ......

اس کا ہاتھ ماتھے سے گرا' خون سے رنگا وہ اٹھی۔ اپنی سفید چادر اٹھائی۔

☆☆☆

گول فریم والے چشموں کے پار' کئی انسانوں کو پڑھا چکی آنکھیں اپنی بیٹی کو نہ پڑھ سکنے کے غم میں ہلکان تھیں۔ بے بسی کی اعلیٰ مثال بنے۔ ابو سر جھکائے پلوشہ کو کبھی دکھ سے دیکھتے...... کبھی بے بسی سے...... اور کبھی ناراضی سے......

اتنے سارے احساسات کو سنبھال نہیں پا رہے تھے' اس لیے آنکھیں بے آواز آنسو چھلکا رہی تھیں۔

منظر بدلا...... اور انہوں نے دیکھا کہ ان کے کمرے میں تایا بیٹھے ہیں' تائی جو مسلسل بول رہی تھیں اور کبیر...... جس کا سر جھکا تھا......

''غصے میں کہہ دیا تھا فراز! غلطی ہو گئی ہے بچے سے۔ غصے میں تو طلاق نہیں ہوتی نا' انسان کو پتا نہیں ہوتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ کیا کر رہا ہے۔'' تائی کہہ رہی تھیں اور ابو بے یقینی سے ان کے ڈھیٹ پن کو دیکھے جا رہے تھے۔

''طلاق؟ مسئلہ طلاق کا ہے؟'' ابو نے بے یقینی سے پوچھا تھا۔ تائی ان کے سوال پر جز بز ہو کر رہ گئیں۔ حیرت سے ابو کو دیکھا۔ ''ماتھے پر نشان دیکھو' گلے پر' ہاتھ پر' پیروں پر۔ مسئلہ طلاق کا ہے؟'' اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے۔ ''میں نے تو یہ سوچا تھا کہ بھائی کے ہاں بیاہ رہا ہوں...... اپنوں میں بیٹی بھیجتے ہیں۔ کتنی غلط فہمی کا شکار تھا میں۔'' ابو کے الفاظ ٹوٹتے جا رہے تھے۔

تائی نے ان کی بات بیچ میں کاٹی۔

''واللہ۔ اللہ کی قسم کھا کر کہتی ہوں فراز۔ بیٹی سے بھی بڑھ کر سمجھا ہے۔ کیا کمی تھی اس کو پوچھیں اپنی بیٹی سے؟ ہر طرح کی آزادی دے رکھی تھی۔ اب تم جذبات میں ایسا فیصلہ مت کرو۔ ایک عدد تھپڑ مار بھی دیا تو شوہر تو مجازی خدا ہوتا ہے۔ یہ حق رکھتا ہے' تمہارا بھائی بھی تو مجھے......''

''نہیں رکھتا حق۔'' ابو چلائے تھے۔ ''نہیں رکھتا حق کوئی بھی' اپنی بیوی کو مارنے کا۔ میرے بھائی نے اگر آپ کو مارا بھی تو ہر بار میں آپ کے سامنے آ کھڑا ہوا' بھائی سے لڑ پڑتا آپ کے حق کے لیے۔''

''ہم مولوی صاحب سے یہ مسئلہ ڈسکس کریں گے' کوئی حل نکل آئے گا فراز۔ عزت کا معاملہ ہے۔'' تایا نے پہلی بار' سنجیدگی سے اپنی تئیں بہت اہم بات کہی تھی۔ ابو استہزائیہ ہنسے تھے۔

''عزت کی ہی تو بات ہے بھائی۔ دو سالوں تک میری بیٹی اس درندے کی مار سہتی رہی۔ کتنی بار اپنی عزت نفس کے قتل پر روئی گی۔ جسمانی درد تو

pklibrary.com

کہیں دور رہ جاتا ہے عزت نفس کے کچلنے کے درد کے آگے۔ اور مسئلہ ختم ہو چکا ہے بھائی۔ طلاق دے ہے آپ کے درندے بیٹے نے۔ اب یہ مسئلہ بھی ختم ہو چکا اور یہ رشتہ بھی۔'' ابو کا لہجہ آخر میں مضبوط ہو گیا۔

''اے زیتون! تم ہی بولو کچھ ناں۔ سات بیٹیاں ہیں۔ ابھی پہلی بیٹی کو طلاق ہو جائے تو باقی کیا بیاہو گی۔ لوگ طرح طرح کی باتیں کریں گے۔ سمجھاؤ اپنے میاں کو۔'' تائی نے آخری حربہ بھی استعمال کرنا چاہا۔ زیتون بی بی' پلوشہ کے ساتھ بیٹھی بے آواز رو رہی تھیں۔ جانے اپنی بیٹی کے زخموں پر' یا تائی کی باتوں پر.....!

''آپ میری بیٹیوں کی فکر مت کریں۔ بلکہ کسی کو بھی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ طلاق ہو چکی ہے' اس کے آگے کوئی بھی بحث بے کار ہے اور ایسے لوگوں کے ساتھ تو بالکل بھی نہیں..... جو میری بیٹی کے ساتھ کیے گئے ظلم میں برابر کے شریک رہے ہوں۔'' ابو غصے سے سخت لہجے میں بولے تھے۔

تائی کو جب لگا کہ اب ان کا شاطر پن اور چرب زبانی ناکام ہو چکی تو چیخ کر بولیں۔

''ارے! نیکی کا تو زمانہ ہی نہ رہا۔ بجائے اس کے' کہ شکر ادا کرو ہمارا کہ دو دو بیٹیوں کا بوجھ ہلکا کر دیا الٹا کبر (تکبر) سے انکار کر ——

رہے ہو۔ اس بانجھ لڑکی کو کوئی فقیر بھی نہ بیاہے' یہ تو میرے چاند سے بیٹے کا بڑا پن تھا کہ دو سال برداشت کیا ورنہ اس پھوہڑ.....'' تائی بے حسی کی تمام حدیں عبور کرتی کہے جا رہی تھیں اور ابو یک دم غصے سے اٹھے۔

''اس سے آگے ایک لفظ مزید کہا تو میں سارے رشتے بھول جاؤں گا۔'' پوری زندگی میں پہلی بار' ابو غصے سے چلائے تھے۔

تایا نے غصے سے تائی کو اٹھایا اور چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی ابو چکرا کر کرسی پر ڈھے گئے۔ مینو فوراً سے بیشتر ان کی اور بڑھی تھی۔

''ابو.....!!''

ان کی مضبوطی کو تائی کی بے حسی نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا۔

☆☆☆

ایک ہفتے تک ابو نے اس سے بات نہیں کی تھی۔ وہ ان کے پاس بیٹھتی' وہ اٹھ کر چلے جاتے۔ وہ اس سے خفا تھے بہت۔ بلکہ ابو کسی سے بھی بات نہیں کر رہے تھے۔ امی سے بھی نہیں۔ مینو کے ڈھیٹ پن کے آگے ابو کی نہیں چلتی تھی۔ اس لیے وہ صرف اس کے ہاتھ کی چائے پیتے اور کھانا کھاتے۔

وہ کھڑکی میں کھڑی باہر دیکھ رہی تھی۔ جہاں اس کے جہیز کا سامان واپس آ رہا تھا اور مینو کی منگنی کی چیزیں بھی واپس کر دی گئی تھیں۔ اتنا سامان کہ ان کے گھر کا صحن بھر چکا تھا اور انہیں اس کو سنبھالنے کی جگہ تک نہیں مل رہی تھی۔ امی سامان کو دیکھتی اور روئے جاتیں۔ اب یہ سامان کسی اور بیٹی کے جہیز میں دینے کے قابل تھا نہ ہی اس کے..... اس دن رخشندہ پھپھو آئی تھیں اور تائی کے پیچھے خوب باتیں کیں کہ سارا کیا دھرا ہی ان کا ہے ورنہ مجال تھی کبیر کی کہ وہ پلوشہ پر ہاتھ اٹھاتا۔

مینو کڑھتی۔ ''منافقت کی بھی حد ہے ویسے۔''

اور یہ صرف رخشندہ پھپھو نہیں تھیں' خاندان کا ہر ایک ہمدردی کا کارڈ استعمال کرتا پہلے یہاں آ کر چائے بمع لوازمات ٹھونستا' اور کبیر کی خوب مٹی پلید کرتا۔ پھر تائی کے ہاں جا کر پیٹ پوجا کرنے کے بعد' پلوشہ کے کردار پر خوب سیر حاصل گفتگو کرتا۔ اس کی طلاق کا ڈھول' سب اپنے مفاد کے لیے بجا

لیکن کوئی یہ نہیں دیکھ رہا تھا کہ دو خاندانوں کے بیچ ہو چکی کشیدگی کے بجائے..... اس پر کیا بیت رہی تھی؟ جو مظلوم تھی؟..... یعنی پلوشہ فراز.....

وہ تو اندر سے کب کی ٹوٹ چکی تھی۔ ایک زندہ لاش تھی' جس کی عزت نفس کا کفن کب سے تار تار ہو چکا تھا۔ اس کی خاموشی امی کو رلاتی مینو اس سے

باتیں کرنے کی کوشش کرتی، لیکن وہ خاموش ہی رہتی۔شام کے پر پھیلتے ہی، اس کی آنکھیں خوف اور ہراس کی سیاہی سے پر ہو جاتیں..... وہ ایک جگہ بیٹھی تھر تھر کانپتی۔ مینو اس کو گلے لگا کر روہانسی ہو کر کہتی۔

"کوئی نہیں ہے پلوشہ! کوئی بھی نہیں ہے۔"

پلوشہ مینو کا لمس پا کر، گہری گہری سانسیں لیتی۔ ایک آنسو بے آواز اس کے گالوں پر بہتا۔ اس دوران اس کی عدت بھی ختم ہو چکی تھی اس کے لیے رخشندہ پھپھو کی طرف سے ان کے بیٹے کا رشتہ آ گیا..... جس کو ابو نے بہت نرمی سے مسترد کر دیا۔ ابو اب اپنے خاندان میں اپنی کسی بھی بیٹی کا رشتہ نہیں کرنا چاہ رہے تھے اور اس صورت میں تو قطعاً نہیں ..... جب لڑکے کے مزاج و کردار کا پورے خاندان میں چرچا ہو.....!!

☆☆☆

"مینو! مینو!"

دوپہر کی دھوپ منڈیروں پر چڑھ آئی تھی اور ابو نماز پڑھ کر گھر میں داخل ہو کر مینو کو آواز دے رہے تھے حالانکہ انہیں پتا تھا کہ مینو یونی ورسٹی میں ہوتی تھی اس وقت۔

وہ لیپ ٹاپ کھولے پی ایچ ڈی کے لیے یونی ورسٹی کا انتخاب کر رہی تھی۔ اس کا ارادہ باہر جانے کا نہیں تھا..... بس وہ پڑھائی میں خود کو مصروف رکھنا چاہ رہی تھی اگرچہ وہ مختلف ہسپتالوں میں، پرائیویٹ کلینک میں جاب کے لیے مسلسل اپلائی بھی کر رہی تھی۔

"جی ابو!" وہ سر پر دوپٹہ ٹھیک کرتے باہر نکلی تو ابو ہاتھ میں پھلوں کا شاپر پکڑے کھڑے تھے۔ باقی بہنیں اسکول کے بعد، پاس فوزیہ باجی سے قرآن پڑھنے گئی ہوئی تھیں۔

ابو نے بنا کچھ کہے، اس کو شاپرز پکڑائے اور اپنے کمرے چلے گئے۔

"ابو کھانا کھائیں گے آپ؟" پلوشہ نے پوچھا۔ابو رکے، لیکن پیچھے مڑے نہیں.....

"نہیں..... میں کھا چکا ہوں اسکول میں۔"

"چائے؟ قہوہ؟"

اتنا سن کر ابو اپنے کمرے چلے گئے۔ وہ کچھ دیر وہیں کھڑی رہی۔ ابو کی خفگی بدستور جاری تھی۔ وہ اس سے اس لیے خفا تھے کہ اس نے جانتے بوجھتے ظلم سہا تھا۔

وہ پھل فریج میں رکھ کر، چائے بنانے لگی۔ ابو کی یہ عادت تھی قیلولہ سے پہلے چائے پیتے تھے۔ مینو کی جب چھٹی ہوتی تو وہ کھانے کے فوراً بعد چائے چڑھا دیتی تھی۔ جب سے مینو نے کھانا پکانا سیکھا تھا۔ کچن کا شعبہ وہی سنبھالتی تھی۔

چائے کے دو کپ بھر کر اور اس کے ساتھ خشک میوہ جات رکھ کر، وہ ابو کے کمرے میں گئی تو ابو حسب معمول صبح کا اخبار پڑھ رہے تھے۔

"ابو چائے!" چائے سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر وہ بھی وہیں بیٹھ گئی۔ کچھ دیر تک ان میں خاموشی رہی۔ بالآخر جب ابو نے چائے کا کپ اٹھایا تو اس نے پوچھ ڈالا۔

"ابو! آپ ابھی تک خفا ہیں؟"

"نہیں۔"

"تو آپ مجھ سے بات کیوں نہیں کرتے۔"

"کیا بات کرنی ہے؟"

"کچھ بھی..... مطلب میں نے آپ کو پرسوں کہا تھا کہ مجھے پی ایچ ڈی کرنی ہے، آپ نے صرف ہم کہا۔ میں نے پوچھا کہ میں جاب کر لوں؟ آپ نے کر لو، کہا۔ پلیز ابو! مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہو تو مجھے معاف کر دیں..... میں تو بس اس لیے خاموش تھی کہ....." وہ باقاعدہ رونے لگی۔ ابو نے چائے کا کپ میز پر رکھا اور اخبار تہ کر کے پہلی بار اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔

"کہ وہ تمہیں طلاق دے دے گا اور پھر تمہاری بہنوں کے لیے مشکلات کھڑی ہو جائیں گی؟ کیونکہ تمہاری بہنوں کو تو یہ معاشرہ پال رہا ہے ناں

..... میں نہیں..... معاشرے کو زیادہ فکر ہے' مجھے نہیں..... تمہیں پتا ہے' پلوشہ! تمہاری غلطی کیا ہے؟ یا میں کیوں خفا ہوں تم سے؟ اس لیے..... کیونکہ میں نے تمہیں اتنا پڑھایا' لکھایا پھر بھی تم اپنے اوپر ہوتے ظلم پر خاموش رہیں؟ یہ ایک تعلیم یافتہ انسان کرے گا؟''

''میں تو بس..... اس لیے.....'' اس کی ہچکی بندھ گئی۔

''تم اپنی بہنوں کے ساتھ اچھا نہیں کر رہی تھیں۔ تم الٹا یہ ظلم سہ کر ان کے ساتھ برا کر رہی تھیں۔ ظلم کسی بھی صورت میں ہو' اس کو کنڈیم کرنا چاہیے۔ جب ایک ایم فل کی اسٹوڈنٹ' ڈومیسٹک ایبوز پر خاموش رہے۔ وہ ایک ان ایجوکیٹڈ لڑکی کو کیا ترغیب دے گی؟ کہ وہ بھی اس کی طرح اپنے لب سی لیں؟

تم نے مجھے بہت مایوس کیا ہے' پلوشہ! میری زندگی کی ساری محنت اور اپنی ساری تعلیم ضائع کردی۔'' ابو کے لہجے میں واقعی اس کے لیے مایوسی تھی۔

''آئی ایم سوری ابو!'' وہ اٹھ کر ان کے گلے لگ گئی۔ ''یہ میری غلط فہمی تھی کہ میں ٹھیک کر رہی ہوں..... پلیز مجھے معاف کردیں!''

ابو نے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا اور مسکرائے۔

''کس یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کرنی ہے؟''

☆☆☆

صبح وہ اٹھا' تو حیدر سو رہا تھا خلاف معمول۔ ورنہ اس کی آنکھ سورج طلوع ہوتے ہی کھل جاتی تھی۔ پھر شام کو کہیں دو تین گھنٹوں کے لیے سو جاتا تھا۔ باہر نکلا تو امی کچن میں کھڑی' دادی کا ناشتہ تیار کر رہی تھیں۔ امی صرف دادی اور اپنا ناشتہ بناتی تھیں۔ باقی تینوں بھابیوں نے اپنا کام تقسیم کر رکھا تھا۔

وہ کچن میں آیا تو امی کو سلام کر کے' پانی میں فیڈر ڈال کر ابالنے لگا۔

''رہنے دو میں بنا دوں گی۔'' امی نے ہمیشہ کی طرح اس کو منع کیا۔

اور اس نے وہی پرانا جواب۔ ''خیر ہے' امی۔ میں کرلوں گا۔''

وہ تقریباً حیدر کے سارے کام خود کرتا تھا۔ اس کو کھانا کھلانا' ڈائپر بدلنا' فیڈر بنانا۔ کپڑے بھابیاں دھو دیتی تھیں۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا بیٹا اس گلٹ میں بڑا ہو' کہ اس کی ماں نہیں تھی اور باپ نے اس کو دوسروں کے سہارے چھوڑ دیا تھا۔ اکثر امی وغیرہ اس پر خفا بھی ہو جایا کرتے۔

''ہم پرائے تھوڑی ہیں۔ لوگ کیا کہتے ہوں گے کہ محبتی کو اپنے خاندان والوں پر بھروسہ نہیں یا اس کے اپنے اس کے بیٹے کے ساتھ سوتیلا سلوک کرتے ہیں؟''

وہ گہری سانس لے کر' چہرے پر ایک تھکی مسکراہٹ سجا کر جواب دیتا' اگرچہ وہ دلیل نہ ہوتی کہ وہ قائل ہو جاتے۔

''امی' اتنے بڑے کام نہیں ہیں کہ میں نہ کرسکوں۔ جو کام میں نہیں کرسکتا' وہ آپ کو کہوں گا۔''

امی خاموش ہو جاتیں۔

اس نے پی ایچ ڈی کے لیے پشاور یونی ورسٹی میں اپلائی کیا تھا۔ ٹیسٹ کے بعد' اس نے انٹرویو بھی کلیئر کرلیا تھا اور اب اس کی زندگی تھوڑی بہت معمول پر آگئی تھی۔

ابھی بھی حیدر کے فیڈر کے بعد' اس نے ناشتہ کیا اور جانے سے پہلے امی کو یاد دہانی بھی کروائی کہ حیدر کے اٹھتے ہی اس کو فیڈر پلا دیجیے گا۔

''میں نو بجے تک آؤں گا' ان شاء اللہ۔''

گاڑی میں بیٹھتے ہی' اس کو اپنے سپروائزر سر اقرار کا واٹس ایپ پر میسج آیا۔ اس نے ٹائم دیکھا تو آٹھ چالیس بج رہے تھے۔ اس کا رنگ اڑا۔ فوراً ایکسیلیٹر پر ہاتھ رکھا اور تب تک نہ اٹھایا' جب وہ ڈیپارٹمنٹ نہ پہنچا۔

وہ واش اپ کھولے تیزی سے سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ معاً وہ کسی سے ٹکرایا اور شیشے کے ٹوٹنے کی آواز آئی۔ شرمندہ ہو کر اس نے سامنے دیکھا تو لڑکی کا چہرہ انتہائی سرخ ہو چکا تھا۔

"آئی ایم سوری۔" وہ نیچے جھک کر پیٹری پلیٹس اٹھانے لگا کہ لڑکی نے ٹوکا۔

"رکیں۔ میں کر لوں گی۔" وہ نیچے جھکی اور پیٹری پلیٹس کی ٹوٹی کرچیاں سمیٹنے لگی۔

وہ بھی شرمندہ ہو کر کرچیاں سمیٹنے لگا تھا۔ لڑکی نے اب کی بار اس کو دیکھا۔

"میں نے آپ کو کہا ناں کہ۔ میں کر لوں گی۔ آپ نے گلوز نہیں پہنے ہوئے۔" اس لڑکی نے اپنے ہاتھ میں پہنے ہوئے دستانوں کی اور نظروں سے اشارہ کیا۔ "اور یہ فنجائی کی پیٹری پلیٹس ہیں۔"

"اوہ! سوری!" ایک دفعہ پھر وہ شرمندگی سے پانی پانی ہو گیا۔

"آپ کو اگر اور پلیٹس چاہئیں تو......" مجتبیٰ نے جھجک کر پوچھا۔

"نہیں۔ تھینک یو۔"

"اگر آپ کو......" اس نے مزید اصرار کرنا چاہا تھا۔

"میں اجنبیوں کی ہیلپ نہیں لیتی، شکریہ۔" اس لڑکی کا لہجہ مضبوط تھا اور وہ کرچیاں سمیٹ کر مڑی اور نیچے اترنے لگی۔

وہ کچھ دیر رکا، اس کے کان تک سرخ ہو چکے تھے۔ صبح کی شروعات بہت بری ہوئی تھی۔

اس لڑکی کی آنکھیں کتنی اداس تھیں...... اس آنکھوں کی طرح، اداس کہانی کہتی آنکھیں...... اور اس کی آواز نرم ہونے کے باوجود بھی کتنی مضبوط تھی۔

اس نے سر جھٹکا، پورے انٹرویو میں اس کے ذہن پر اس کا چہرہ جانے کیوں چھا رہا تھا۔ وہ حیرت سے خود سے پوچھ رہا تھا۔

☆☆☆

اس نے پشاور یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کا ارادہ کیا اور باقی کا سفر آسانی سے طے ہوا۔ ٹیسٹ، انٹرویو، ہاسٹل وغیرہ۔ وہ بہت خوش تھی، لیکن اس کی ساری خوشی کرکری ہو گئی...... جب اس نے اپنے سپروائزر کی سپرویژن میں کام شروع کیا۔ وہ انتہائی کھڑوس اور سخت مزاج تھے۔ ماتھے پر ہمہ وقت رہنے والی پانچ شکنیں۔ جس کو وہ ہر میٹنگ میں گنتی تھی۔ یہ اس کی غلط فہمی تھی کہ اس کی پی ایچ ڈی جلدی ہو جائے گی اور پشاور میں بہت یادگار وقت گزرے گا۔

اس دن وہ انکیوبیٹر سے پلیٹس نکال کر نیچے اپنے آفس جا رہی تھی کہ ایک لڑکا اس سے ٹکرایا اور اس کے دس دنوں کی ساری محنت زمین بوس کر دی تھی۔ اگرچہ وہ بہت شرمندہ ہوا لیکن اس نے اپنے غصے کو قابو کیے رکھا۔ وہ دن اس کا خراب دن تھا۔

اگلے دن جب وہ اپنے آفس جانے لگی تو ایل ایف ایچ (مائیکروبائیولوجی میں مائیکروبس کو گرو کرنے کا ایک apprratus) میں ایک لڑکا بیٹھا کام کر رہا تھا۔ اس کی پشت پلوشہ کی طرف تھی۔

آفس میں کسی کی موجودگی محسوس کرتے ہوئے وہ لڑکا مڑا اور پلوشہ کو دیکھ کر پہلے سلام کیا اور پھر گویا ہوا۔

"مس پلوشہ فراز! آپ کو سر خبیر نے آفس بلایا ہے۔ انہوں نے میسج چھوڑا تھا۔"

وہ جو اس کی موجودگی پر حیران و پریشان تھی، اس کے طوطے اڑ گئے۔ انہوں نے رپورٹ مانگی تھی اور کل تو اس لڑکے کی وجہ سے اس کا سارا کام تباہ ہو گیا تھا۔ اس کے گال مزید سرخ ہونے لگے۔

مجتبیٰ نے پہلے حیرت سے دیکھا اور پھر اس ڈر سے کہ پھر سے اس کو شرمندہ نہ کر دے۔

"ایوری تھنگ آل رائٹ؟"

"یس۔ یس۔" ناخن دانتوں سے کترتے ہوئے اس نے کہا۔ اس کے لہجے میں سراسیمگی واضح طور پر تھی۔ اتنا کہہ کر وہ فوراً مڑی اور باہر چلی گئی۔

جب آئی تو اس کا چہرہ مزید سرخ تھا۔ وہ جو

لیپ ٹاپ پر ریسرچ آرٹیکلز کھنگال رہا تھا۔ حیران ہوکر دیکھ رہا تھا۔ مجتبیٰ کا دل چاہا کہ ایک دفعہ پھر پوچھ لے کہ وہ ٹھیک ہے۔ لیکن اس نے خاموش ہونا مناسب سمجھا۔

وہ خاموشی سے اپنا کام کرنے لگی۔ دونوں کے درمیان خاموشی چھائی رہی۔

☆☆☆

''میں اجنبیوں کی ہیلپ نہیں لیتی' شکریہ۔''

آسمان تاروں سے بھرا تھا اور ان تاروں میں کہیں اس کی نظر ایک چہرہ ڈھونڈ رہی تھی۔۔۔ وہ کوئی کہانی کہتی اداس آنکھیں' نرم لہجہ اور کان کے پیچھے اڑسی وہ لٹ۔

اس نے معاً سر جھٹکا اور کھڑکی سے نظریں ہٹا لیں۔ کیا وہ پلوشہ فراز کے بارے میں زیادہ سوچنے لگا تھا؟...... یقیناً۔

اس نے پلٹ کر دیکھا۔

حیدر اس کے قریب ہی سو رہا تھا' اس کا ٹیب الٹا پڑا تھا اور اس پر کوئی کارٹون چل رہا تھا۔ اس نے آرام سے حیدر کے ہاتھوں میں پھنسا ٹیب اٹھایا اور سائیڈ ٹیبل پر رکھا۔ پھر فیڈر چیک کیا' وہ بھی تقریباً ختم تھا۔ اس کو دادی کب سے منع کر رہی تھیں' اب تین سال کا ہو چکا ہے۔ اس کو کھانا کھلانے کا عادی بناؤ۔ لیکن حیدر کے نخرے تھے۔ اس کو آلو نہیں پسند تھا نہ سیب' آم۔ بس کیلا کھالیا کرتا تھا۔ اب جب اس کا زیادہ وقت باہر گزرنے لگا تو امی دوپہر میں اس کو کھانا کھلا دیا کرتی تھیں۔ اور اس کو یہ ماننا پڑ رہا تھا کہ اس کی حیدر کی کیئر کرنا' امی کے تجربے کے سامنے کچھ نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی' کہ صبح کا فیڈر ناشتے میں بدلا اور فیڈر محض رات کے لیے رہ گیا۔

اگلی صبح بہت روشن تھی۔ نومبر کی صبح' اوس سے بھیگ چکی تھی اور سورج کی نارنجی روشنیاں اوس سے گیلی سڑکوں پر پڑتیں تو یوں معلوم ہوتا کہ جیسے کسی نے سڑک پر موتی بکھیر دیے ہو۔

اس نے کو بام (سنٹر آف بائیوٹیک اینڈ مائیکرو بائیوڈیپارٹمنٹ) کے پارکنگ لاٹ میں گاڑی پارک کی جیسے ہی ڈیپارٹمنٹ جانے لگا تو اس کو فٹ پاتھ پر کھڑی پلوشہ نظر آئی۔ سیاہ شلوار قمیص پہنے' اس کا حسن مزید نکھر رہا تھا۔ وہ بھی ڈیپارٹمنٹ کی طرف آرہی تھی' اس نے دوبارہ مڑ کے دیکھا تھا۔ معاً اس کے سامنے گاڑی رکی اور اس کے چہرے پر غصہ اور خوف بیک وقت نظر آیا۔ وہ گاڑی اس کا دور سے پیچھا کر رہی تھی...... اس کے قدم فوراً اس کی جانب بڑھے تھے۔

☆☆☆

''ایکسیوزمی؟''

پلوشہ کا خون ابلنے لگا۔ اس لڑکے کی جرات اور بے شرمی پر اس کا پارہ چڑھنے لگا۔ لیکن اس نے خود کو پرسکون کیا اور بہت تحمل سے پوچھا کیا۔

وہ کسی امیر شخص کا بگڑا بیٹا تھا' جس کو اپنے پیسوں کا زعم تھا۔ گلاسز چڑھائے' جیل سے سیٹ کیے گئے بال' مہنگی گھڑی اور لیدر جیکٹ۔ وہ سنٹرل لائبریری سے اس کو فالو کر رہا تھا۔ پہلے تو اس نے اگنور کر دیا' لیکن اب وہ اس کے ڈیپارٹمنٹ تک پہنچ گیا۔ اور وہ اسی بے شرمی سے اپنی بات دہرا رہا تھا۔

''دراصل آپ سے ضروری بات کرنا تھی' تو اگر آپ کمفرٹیبل نہیں ہیں تو آپ مجھے اپنا نمبر دے دیں یا میرا لے لیں۔ پلیز اٹس ارجنٹ!''

''میں کمفرٹیبل ہوں' بھائی!'' اس نے پھر تحمل سے بات کی۔

''آپ نیچے اتر کر مجھے بتائیں' آپ کو کیا ارجنٹ بات کرنی ہے۔''

اس کے ارد گرد لوگ گزرتے پیچھے مڑ کر دیکھتے جا رہے تھے۔ وہ لڑکا جز بز ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ پلوشہ اس کو کھری کھری سناتی' ایسے میں مجتبیٰ آیا اور پلوشہ سے کہنے لگا۔

''آپ جائیے۔ میں دیکھتا ہوں۔''

پلوشہ نے پہلے اس کو حیرت سے دیکھا۔ وہ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ وہ آگے بڑھا اور اس لڑکے سے

مصافحہ کیا۔ اب وہ اس کو اترنے کا کہہ رہا تھا۔ مجتبیٰ نے مڑ کر اس کو دیکھا اور پہلی بار اس کی نظروں میں تحکم تھا...... ایک حفاظت کرنے والے کا تحکم......

بلوشہ مڑی اور تیزی سے ڈیپارٹمنٹ جانے لگی۔

"کیا نام ہے آپ کا؟"

"مبشر ناصر خانزادہ۔" لڑکے نے اپنے سرنیم کا رعب جتانا چاہا۔

مجتبیٰ مسکرایا۔ "تو ناصر خانزادہ کے صاحبزادے ہیں؟ جو اس بار الیکشن لڑنے والے ہیں؟" مجتبیٰ استہزائیہ ہنس کر سر ہلانے لگا۔

"اچھا بیٹے۔ اب میری بات غور سے سنو۔ آپ کے والد ایک نامی گرامی شخصیت ہیں اور سیاست دانوں کے کیریئر کے لیے کنٹروورسیز بہت بری ثابت ہوتی ہے اور پھر ہمارے پختون معاشرے میں...... یہ سوشل میڈیا پر وائرل ہو گیا کہ ان کا بیٹا پشاور کی یونیورسٹی میں ایک لڑکی کو ہراس کر رہا ہے...... پھر جن چیزوں پر آپ اترا رہے ہیں نا...... یہ تو جائیں گی ہی...... ساتھ میں آپ کے باپ کی ریپوٹیشن بھی۔"

مبشر نامی لڑکا طنزیہ ہنسا۔

"آپ اتنا کیوں بول رہے ہیں؟ بہن ہے آپ کی؟"

اب کی بار، مجتبیٰ آگے بڑھا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر زور سے دبایا۔ "اپنی بہن سے...... دور رہو...... ورنہ......!"

مبشر کا ہاتھ اس کی سخت گرفت سے سرخ پڑنے لگا۔ اس نے مجتبیٰ کی آواز میں غراہٹ اور آنکھوں میں تپش دیکھی اور اگلے پل اس کا چہرہ متغیر ہوا۔ اس نے ہاتھ چھڑایا اور فوراً بھاگ کھڑا ہوا۔

مجتبیٰ نے ہاتھ جھاڑا، یہ بگڑے امیرزادے محض زبان کے تیز ہوتے ہیں ورنہ تو چھوٹی سوئی...... ڈرپوک......!

☆☆☆

آفس جا کر لیپ ٹاپ کھولا، کل کی رپورٹ پڑھنے لگی۔ لیکن الفاظ اس کی نظروں کے سامنے سے گزرتے جا رہے تھے۔ اس انسان کے ساتھ مسلسل ٹکراؤ اس کو مردوں کا وہ کون سا روپ دکھا رہا تھا؟ کیا وہ سب مردوں کو کبیر کے پیمانے پر ماپنے لگی تھی؟...... یقیناً...... سب مرد ایک جیسے ہوتے ہیں۔ حکم جتاتے ہیں، ظلم کرتے ہیں اور عورتوں کو مظلوم سمجھ کر اپنی انا کو تسکین پہنچاتے ہیں۔ وہ سوچے جا رہی تھی۔ احتساب کر رہی تھی۔ لیکن ابھی بھی اس کا ترازو اچھے اور برے میں سے برے کی طرف زیادہ جھک رہا تھا۔

ایسے میں، مجتبیٰ داخل ہوا اور سلام کر کے پی سی آر کی اور بڑھ گیا۔ وہ اس کی پشت کو گھورتی رہی۔ معاً اٹھی۔

"میں نے آپ کو منع کیا تھا۔ آپ بلاوجہ میری ہیلپ کرنے کی کوشش مت کیجیے۔ کسی فلاحی ادارے میں بھرتی ہیں کیا آپ؟"

مجتبیٰ مڑا۔

"وہ مدد نہیں تھی۔" مضبوط لہجے میں کہا۔ "وہ میری پختو (غیرت) کو گوارا نہیں تھا کہ کسی لڑکی کو یوں کوئی بیچ راستے میں ہراس کرے۔ آپ کی جگہ کوئی بھی لڑکی ہوتی تو میں یہی کرتا۔ یہ میں نے غیرت کے لیے کیا۔ اپنی غیرت کے لیے۔"

اب وہ استہزائیہ ہنسی۔

"بات وہی پھر غیرت کی آ ہی گئی۔ آپ میرے مسئلوں سے اپنی غیرت کو دور رکھیں، مسٹر مجتبیٰ خلیل۔ مجھے اپنے مسئلے خود حل کرنے دیجیے۔ مجھے آپ مردوں کے ٹیکٹکس کے بارے میں خوب معلوم ہے۔ میں کوئی امیچور لڑکی نہیں ہوں۔" وہ پہلی بار غصے سے بولی۔ بولتے بولتے اس کا تنفس چڑھ گیا۔ مجتبیٰ خاموشی سے سنتا رہا۔

"ویل، آپ کی مردوں کے بارے میں رائے کافی منفی ہے۔" اتنا کہہ وہ اپنی چیزیں سمیٹ کر،

چلا گیا۔ اس نے یہ نہیں کہا وہ اس کی مدد نہیں کرے گا' آئندہ۔

اس نے گہری سانس خارج کی اور واپس ریسرچ آرٹیکل پڑھنے بیٹھ گئی۔ الفاظ ہنوز اڑتے جا رہے تھے۔ لنچ کے دوران اس کو وہ لڑکا پھر سے نظر آ گیا لیکن اب کی بار اس نے پلوشہ کو یکسر نظر انداز کر دیا اور فوراً وہاں سے ہٹ گیا۔ پلوشہ تحیر سے اس کو دیکھتی رہ گئی۔ مجتبیٰ نے آخر اس کو ایسا کیا کہہ دیا تھا۔

☆☆☆

پلوشہ نے کچھ دنوں تک اس کو نظر انداز کیا اور مجتبیٰ نے بھی اس سے حتی المقدور بات نہیں کی۔ پلوشہ ہاسٹل آ کر اس کے بارے میں سوچتی رہتی اور پھر خود پر غصہ ہوتی کہ وہ اس انسان کے بارے میں کیوں سوچے جا رہی ہے۔

وہ خود ہی نہیں طے کر پا رہی تھی۔

اس دن بہت دنوں بعد سورج نکلا تھا۔ دسمبر کا سورج غنیمت کی طرح تھا۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے پوری یونی ورسٹی کلاسیں بنک کر کے لان میں دھوپ سینک رہی تھی۔ وہ آفس لیٹ پہنچی۔ وہاں ایک بچہ بیٹھا ٹیب پر کارٹون دیکھتے ہوئے' ہاتھ میں چاکلیٹ پکڑے تھا۔

اس کا دل زور سے دھڑکا اور اس کو پھپھو کی بات یاد آ گئی اور اولاد کے لیے کیا گیا دو سالوں تک مسلسل علاج یاد آیا......! وہ کسی ٹرانس کے عالم میں آگے بڑھی اور بچے کو دیکھتے ہی اس کا دل ایک دم سے کئی احساسات سے بھر گیا۔

''ہیلو۔'' اس نے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر' مسکرا اس بچے سے کہا۔ بچے نے ٹیب سے سر اٹھا کر دیکھا اور مسکرایا لیکن جواب میں کچھ نہیں کہا۔

''کیا نام ہے بے بی آپ کا؟'' وہ پوچھ رہی تھی' وہ اس کی کرسی کے پاس بیٹھ کر پوچھنے لگی۔

''حیڈر!'' بچے نے کہا اور وہ اس کے 'ذ' کو 'ڈ' کہنے پر ہنس پڑی......

''ہاؤ کیوٹ! کس کے ساتھ آئے ہو؟''

''بابا......'' وہ ٹیب سے سر اٹھائے بنا کہہ رہا تھا۔

''اور بابا کہاں ہیں؟'' اب وہ حیرت سے پوچھ رہی تھی۔ اس کے ساتھ تو تین لڑکیاں اور محض مجتبیٰ کام کرتا۔ معاً شمائلہ داخل ہوئی۔

''مجتبیٰ کا بیٹا ہے......اس کی میٹنگ ہے سر کے ساتھ تو مجھے اس کا خیال رکھنے کا کہا ہے اور اب بدقسمتی سے مجھے بھی میم حرا نے بلا لیا ہے آفس۔ پلیز تم اس کا خیال رکھنا تب تک...... جب تک مجتبیٰ نہ آ جائے......پلیز!''

وہ جوگنگ بیٹھی بنے جا رہی تھی کہ یہ مجتبیٰ کا بیٹا ہے......اس کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ مطلب اس کی شادی ہو چکی تھی۔

''تم سے کہہ رہی ہوں' پلوشہ!'' شمائلہ نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ ہلا کر کہا۔

''اوکے......اوکے......تم جاؤ میں خیال رکھ لوں گی۔'' اس نے ہامی بھر لی۔

شمائلہ شکریہ ادا کر کے چلی گئی اور اب وہ اس کے ساتھ بیٹھ کر' اپنے بیگ پیک سے چپس نکال کر پیش کرنے لگی۔ اس نے سر نفی میں ہلایا۔

''بابا نے کہا تھا......اسٹرینجر سے کچھ نہیں لیتے۔'' حیدر نے اپنے معصومانہ لہجے میں ٹوٹے پھوٹے الفاظ کے ساتھ یہ جملہ مکمل کیا۔ پلوشہ نے ابرو اٹھا کر' اوہ آئی سی والے انداز میں اس کو دیکھا۔

(یعنی مسٹر مجتبیٰ! بہت کیئرنگ بابا ہیں۔ نائس)

حیدر نے اکتا کر ٹیب بند کی اور کرسی سے اترنے لگا۔ پلوشہ نے فوراً اس کو واپس بٹھایا۔

''مجھے بابا کے پاس جانا ہے۔''

''بابا آنے والے ہیں' حیدر! تب تک میں آپ کو ایک کہانی سناؤں؟'' اس نے اس کو روکنا چاہا۔

حیدر نے حیرت سے بھرے انداز میں اپنی بڑی بڑی نیلی آنکھیں کھول کر دیکھا۔ ''ریئلی (سچ؟)؟''

وہ اس کے انداز پر پھر سے ہنس پڑی۔

"سچ۔ اچھا۔ سنو بہت پہلے ایک......"

حیدر انتہائی دلجمعی سے کہانی سن رہا تھا اور آخر میں جیسے ہی کہانی ختم ہوئی۔ وہ اپنی کرسی پر کھڑا ہوا اور تالیاں پیٹنے لگا۔ پلوشہ نے مسکراتے ہوئے جلدی سے اس کو گلے لگایا تاکہ گر نہ جائے۔

"اچھا' حیدر! میرے دوست بنو گے؟" پلوشہ ہاتھ بڑھا کر پوچھ رہی تھی۔ حیدر نے فوراً اس کو اپنا ہاتھ دیا اور مسکرا کر کہا۔

"یش! (یس)"

"چلو پھر ایس ٹی سی چلتے ہیں۔ آپ کو کیا پسند ہے؟ چاکلیٹ' کوکوموٴ چپس؟"

"کوکومو......کوکومو......" حیدر پرجوش لہجے میں بولا۔ پلوشہ نے اس کا ہاتھ پکڑا اور ایس ٹی سی (کیفے ٹیریا) تک اس سے باتیں کرتی رہی۔ وہ اس کے معصومانہ لہجے پر مسکرائے جاتی۔ جانے کیوں' دل کے کسی خانے میں وہ اس ابھرتے جذبے کو کوئی نام نہیں دے پا رہی تھی......کیا وہ ممتا کی محرومی تھی' جو اس نے پورے دو سال تک محسوس کی تھی یا پھر وہ خواہش تھی؟......

وہ حیدر کے ساتھ لگی باتیں کرتی رہی اور اس کو پورے لان کی سیر کروا کر جب وہ آفس میں آئی تو مجتبیٰ ابھی تک نہیں آیا تھا۔ اس نے حیدر کو کرسی پر بٹھایا اور باہر آفس کے عین سامنے فلٹر سے بوتل بھرنے لگی۔ جب وہ آفس میں داخل ہوئی تو اس کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔

حیدر وہاں نہیں تھا۔ وہ فوراً باہر نکلی۔ اس کا چہرہ متغیر ہونے لگا۔ تنفس چڑھنے لگا۔ اس کو تین سال کے بچے کو یوں دو منٹ کے لیے سہی' لیکن اکیلا نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔ وہ اس کے باپ کو کیا جواب دے گی؟۔

"اللہ......اللہ......" اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھرنے لگیں اور وہ آس پاس دیکھنے لگی۔ وہ کہیں نہیں تھا۔ وہ اس انسان کو کیا جواب دے گی' جس کو اس نے ہر ملاقات میں شرمندہ کیا ہے......' اس کا دل گھبرانے لگا......عین اسی وقت' مجتبیٰ سیڑھیاں اترتا دکھائی دیا اور اس کو مزید رونا آیا۔

"مس فراز؟ کیا ہوا؟ سب خیریت؟" مجتبیٰ اس سے پوچھ رہا تھا۔

"آئی ایم سوری۔ سوسوری۔ شمائلہ نے مجھے حیدر کے پاس بیٹھنے کا کہا اور میں پورے دو گھنٹے اس کے ساتھ بیٹھی رہی اور......" اس کی ہچکی بندھ گئی۔

"اور پھر میں آفس کے سامنے فلٹر سے پانی بھرنے گئی دو منٹ کے لیے۔ اور......جب میں واپس آئی تو......حیدر آفس میں نہیں تھا......وہ کہاں گیا......آئی ایم سوری......پلیز......"

وہ رو رہی تھی اور مجتبیٰ فوراً آفس کی اور بھاگا تھا وہ بھی اس کے پیچھے بھاگنے لگی۔

"حیدر؟ بیٹا......" وہ ایسے پکار رہا تھا جیسے حیدر وہیں کہیں تھا۔ اب وہ ٹیبل کے نیچے جھک کر دیکھ رہا تھا اور حیدر وہیں بیٹھا تھا۔ مجتبیٰ نے فوراً اس کو نکالا اور ماتھا چوما۔

پلوشہ نے جیسے ہی حیدر کو سامنے دیکھا۔ یک دم وہ مڑی اور دوبارہ رونے لگی۔

"دراصل اس کو جب میری بہت یاد آتی ہے یا مجھ سے خفا ہوتا ہے' تو یہ سب سے چھپ کر اپنے کمرے میں کھلونے والے گھر میں چھپ کر بیٹھ جاتا ہے۔" وہ پلوشہ کو مسکرا کر کہہ رہا تھا۔ اس کی ناک ٹماٹر بن رہی تھی۔

"لک' حیدر! آپ نے مس پلوشہ کو اتنا پریشان کر دیا......سوری کہو......" وہ پیار سے کہہ رہا تھا۔

"سوری فرینڈ۔" اس نے اپنی معصوم آواز میں کہا۔ پلوشہ روتے ہوئے ہنس پڑی۔

☆☆☆

شام کو مجتبیٰ جب ہوٹل سے لوٹا تو حیدر جاگ چکا تھا اور دادی کی گود میں بیٹھا' ان کو اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں قصے سنا رہا تھا۔ دادی اس کی توتلی زبان پر

pklibrary.com

واری صدقے ہوئے جارہی تھیں۔ وہ دادی کو سلام کرتا' ان کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

''اور یہ چاکلیٹس کس نے دیئے' میرے سلطان حیدر کو؟'' دادی اس کے ہاتھ میں موجود چاکلیٹ کے بارے میں پوچھ رہی تھیں۔

''یہ میری فرینڈ نے۔''

''اور آپ کی فرینڈ کون ہے؟''

مجتبیٰ نے پہلو بدلا' اس کے بعد سوالنامہ اس کی طرف مڑنا تھا۔

''میری فرینڈ!'' حیدر نے اپنی معصوم لہجے میں' کندھے اچکا کر جواب دیا۔ وہ دونوں ہنس پڑے۔

''اور آپ کی فرینڈ کا نام کیا ہے؟''

حیدر نے کندھے اچکائے' اس نے یہ حرکت سیکھی تھی اور ہر جواب میں یہ ری ایکشن دیا کرتا تھا۔ دادی کے لیے حیدر کا کسی انجان لڑکی کے ساتھ لگاؤ' خوشی کا باعث بن رہا تھا۔ وہ اب انجان بن چکے مجتبیٰ کی طرف مڑیں۔

''مجتبیٰ! حیدر نے آج کس کے ساتھ اتنا وقت گزارا تھا کہ اس کی زبان سے اس کا نام ہی نہیں جارہا؟''

مجتبیٰ آہستگی سے کہا۔ ''میرے ساتھ پی ایچ ڈی کررہی ہے۔''

اسی وقت امی بھی داخل ہوئیں۔ دادی جوش سے آگے آئیں۔

''شادی شدہ ہے یا کنواری؟''

''دادی!'' اس نے دادی کو ناگواری سے دیکھا تھا۔

''کیا مطلب؟ سیدھا سادہ سوال ہے۔ دیکھو اگر اس کی شادی نہیں ہوئی تو.....''

مجتبیٰ نے ان کو پھر سے گھور کر اٹھنے میں ہی عافیت جانی۔ ان کے جانے کے بعد' دادی امی سے کہنے لگیں۔

''اس لڑکی کا پتا لگانا چاہیے۔ دیکھو' جب سے حیدر یونی ورسٹی سے آیا ہے اس کی زبان پر اپنی دوست کا ہی نام ہے۔''

☆☆☆

پلوشہ فراز کے ساتھ پہلی ملاقات کافی فلمی تھی۔ ٹکرانا' اس کے ہاتھ سے چیزوں کا گرنا اور اس کا اٹھا کر دینا..... جو نیا تھا' وہ اس کا ردعمل تھا۔ وہ کٹھور نہیں تھی' نہ ہی روڈ تھی۔ اس نے بس کسی ذاتی وجہ سے خود کو خول میں بند کیا ہوا تھا اور وہ جانتا تھا کیونکہ یہی تو وہ بھی کررہا تھا۔ اندر سے ٹوٹ چکنے کے بعد' اپنے گرد مضبوط آہنی خول چڑھانے کا فن وہی تو جان سکتا تھا۔

معاً حیدر کسمسایا۔

''مما.....'' حیدر کی آواز پر وہ جامد ہوگیا۔ وہ اکثر خواب میں بولتا تھا اور یہ کائنات کی عادت بھی تھی۔ کیا اس کا بیٹا' اپنے کزنز کو اپنی ماؤں کو پکارتے' ان کی لاڈ اٹھاتے دیکھ کر' احساس کمتری کا شکار ہورہا تھا۔ کیا ایسا ممکن تھا؟

امی کی باتیں اس کی کانوں میں گونجنے لگیں۔

''ابھی حیدر چھوٹا ہے' جلدی اپ سیٹ ہوجائے گا۔ تم شادی کرلو۔ اپنے لیے نہ سہی' حیدر کے لیے۔''

پہلی بار' اس کا ذہن شادی کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔

☆☆☆

''حیدر کی پیدائش کے دوران ہی مجتبیٰ کی وائف کی ڈیتھ ہوگئی تھی۔ بہت پیارا کپل تھا۔'' شائلہ اس کو بتارہی تھی۔ اس کا دل اچانک اداسیوں سے بھر گیا۔

شائلہ اس کی کلاس فیلو رہی تھی۔ اس لیے وہ اس کو بہت قریب سے جانتی تھی۔

''کائنات میری کلاس فیلو تھی، کالج اور اسکول میں۔ پھر اس نے الگ سبجیکٹ لے لیا اور ایسے میں میں اور مجتبیٰ یونی فیلوز ہوگئے۔ کائنات بہت زندہ دل لڑکی تھی۔ اس کی موت بہت اچانک ہوئی۔ وہ بہت صدمے میں تھا۔ کائنات کی موت کے بعد مجتبیٰ بالکل بدل گیا۔ اس کو دیکھ کر مجھے بہت دکھ ہوتا ہے۔ وہ شاید کائنات کو ابھی تک بھلا نہیں سکا کیونکہ اس

نے دوسری شادی ابھی تک نہیں کی ہے۔" شمائلہ نے اس کے دل میں ابھرتے سوالات کے جوابات اس کے پوچھنے سے پہلے ہی دے دیئے تھے۔

وہ دل ہی دل میں شرمندہ ہو رہی تھی۔ وہ اس انسان کے ساتھ ابھی تک کتنی سرد مہری کا مظاہرہ کرتی رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بتاتی تھیں۔ میں کتنے بھید چھپے تھے۔ بالکل اس کی طرح۔

ایسے میں مجتبیٰ داخل ہوا۔ شمائلہ نے اس کو آتے دیکھ کر اس کی بائیوگرافی سنانا بند کی۔ مجتبیٰ سلام کرتا ہوا آگے بڑھا اور لیپ ٹاپ نکال بیٹھ گیا۔ پلوشہ نے دیکھا۔ آج وہ بہت بدلا بدلا سا لگ رہا تھا۔

شمائلہ اپنی پلیٹس لے کر چلی گئی۔ اب آفس میں وہ اور مجتبیٰ اکیلے تھے۔

وہ اپنی جگہ بیٹھی، اس شش و پنج میں انگلیاں مروڑتی رہی، کہ اس کو اپنے رویے کی معافی مانگنی چاہیے یا نہیں۔ نظروں کے حصار کی حدت محسوس کرتے ہوئے، مجتبیٰ نے نظریں اٹھا کر اس کو دیکھا اور یک دم پلوشہ اس کی نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے سرخ ہو گئی۔

"وہ مجھے آپ سے سوری کرنی تھی۔" تو پلوشہ نے اپنی شرمندگی چھپانے کے لیے فوراً کہہ دیا۔

"کس لیے؟" اب کی بار مجتبیٰ نے لیپ ٹاپ بند کیا۔ اس کی مکمل توجہ پا کر وہ اور بھی گھبرا ہو گئی۔

"اپنے پرانے رویوں کے لیے۔" اس نے نظریں جھکائیں۔

"میں آپ سے بلاوجہ روڈ لی بات کرتی رہی۔ سوری فار دیٹ۔"

"کوئی بات نہیں، مجھے وہ روڈ نہیں لگا تھا۔ آپ اپنی جگہ ٹھیک تھیں۔ آپ کو کسی اجنبی سے مدد نہیں لینی چاہیے تھی۔" وہ مسکرایا۔ مسکراتے وقت اس کے دائیں گال میں ایک چھوٹا سا گڑھا بن جاتا، جس کو شیو نے چھپایا ہوا تھا۔

(کیا وہ اس کو اتنا غور سے دیکھ رہی تھی؟...... پلوشہ خود سے پوچھ رہی تھی۔

"حیدر کیسا ہے؟"

"ٹھیک ہے، الحمدللہ۔ کل ساری رات دادی کو اپنی نئی دوست کے قصے سناتا رہا تھا۔" وہ مسکرایا۔

وہ بھی جواباً ہلکا سا مسکرائی۔

"او کیوٹ!"

☆☆☆

"میں آپ سے خفا ہوں، حیدر!" پلوشہ حیدر سے مصنوعی خفگی بھرے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔ حیدر ٹیبل پر بیٹھا پلوشہ کو دیکھ رہا تھا۔

"کیوں؟"

"آپ آئے کیوں نہیں اتنے دن؟"

حیدر نے پھر سے کندھے اچکائے۔ "پاپا نہیں لے کر آتے۔"

"آپ کے پاپا بہت برے ہیں نا۔" اس نے تائید چاہتی نظروں سے حیدر کو دیکھا۔ معاً کوئی کھنکھارا۔ پلوشہ نے نظریں گھما کر دیکھا، دروازے میں مجتبیٰ کھڑا تھا۔ پلوشہ کا چہرہ یک دم شرمندگی سے سرخ ہو گیا۔

"نہیں۔ پاپا تو بہت اچھے ہیں۔" حیدر ٹیبل سے اترا اور مجتبیٰ کی طرف بھاگا۔ مجتبیٰ نے اس کو اٹھا کر گلے لگایا۔

"آپ اس کے ساتھ تھوڑی دیر رہ سکتی ہیں؟ میری میٹنگ ہے۔ کچھ دیر کے لیے۔ ابھی میری مما اور بھابھی آئیں گی اس کو پک کرنے۔ تب تک کے لیے۔" مجتبیٰ اس سے کہہ رہا تھا۔

"شیور!"

"آپ اپنی فرینڈ کے ساتھ چل کرو۔ میں آتا ہوں، او کے۔" وہ حیدر کو اتار کر کہہ رہا تھا۔

"او تے (او کے)" حیدر خوشی سے اترا کر بولا۔

مجتبیٰ کے جانے بعد وہ اس کے ساتھ بیٹھی کھیلتی رہی۔ جانے کیوں حیدر کے ساتھ ایک عجیب سی

انسیت تھی۔ وہ اپنا کام بھول کر اس کی معصومیت میں کھو سی گئی۔ کچھ دیر بعد چوکیدار آیا تو وہ حیدر کو باہر لے کر نکلی۔

ڈیپارٹمنٹ کے سامنے گاڑی کھڑی تھی اور ایک بڑی عمر کی خاتون نکل رہی تھیں۔ اس نے سلام کر کے حیدر کو ان کے حوالے کیا۔ اندر سے ایک بزرگ خاتون نے آواز لگائی۔

"اے لورے' (بیٹی) ادھر آنا ذرا۔"

وہ حیرت سے مڑی۔ اس نے بزرگ خاتون کو سلام کیا' شاید یہ مجتبیٰ کی دادی تھیں۔

"کیسی ہو بیٹا۔ کیا نام ہے آپ کا؟"

"پلوشہ۔" وہ مروتاً مسکرا کر بولی۔

"کتنا پیارا نام۔ ماشاءاللہ۔ کہاں کی ہو۔"

"سوات۔"

"اسی لیے بالکل حوروں جیسا حسن رکھتی ہو۔ شادی ہوئی ہے؟" دادی کے صاف گو لہجے پر صدف بھابھی نے ان کو ٹوکا تھا۔ پلوشہ کا چہرہ ایک دم تاریک ہوا۔ وہ شاید اس سوال کی توقع نہیں کر رہی تھی۔

"ہوئی تھی۔" توقف کے بعد بولی۔

"میں چلتی ہوں۔ مجھے میں اپنا کام مکمل کرنا ہے۔ آپ سے مل کر اچھا لگا' آنٹی۔"

وہ اتنا کہہ کر جلدی سے مڑی۔ پیچھے اس نے خاتون کو کہتے سنا تھا۔

"دادی آپ نے اس بے چاری کو شرمندہ کر دیا۔ آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

☆☆☆

سیما باجی کافی عرصے بعد آئی تھیں۔ اگرچہ گھر میں مجتبیٰ کی شادی کا ذکر ختم ہو چکا تھا لیکن پھر بھی دادی دبے دبے لفظوں میں اس موضوع کو ہوا دے دیا کرتی تھیں۔

"ایسی خوب صورت لڑکیاں تھیں' نجمہ کی شادی میں۔ اللہ امی کیا بتاؤں۔ ایک لڑکی اتنی پسند آئی کہ خود پر قابو نہ پا کر اس کی تفصیلات تک لے لیے۔ وہ ماڈل ٹاؤن میں فارمیسی اسٹور نہیں ہے' اس کے مالک کی بیٹی ہے۔ پیاری بھی اور تعلیم یافتہ بھی۔" سیما باجی اگرچہ پرجوش لہجے میں بتا رہی تھیں' لیکن چہرے پر اداسی بھی طاری تھی کہ کیا فائدہ؟

"سیما باجی! ایک بات کا اضافہ کرنا بھول گئیں آپ۔ کہ وہ کنواری ہے۔ اور کوئی بھی یہ نہیں چاہے گا کہ ان کی بیٹی کو منہ دکھائی میں تین سالہ کا بیٹا دیا جائے۔" صدف بھابھی ناک بھوں چڑھا کر ناگواری سے بولیں۔

"تو میرا بھائی کون سا انکل شکل ہے۔ ابھی کیا عمر ہو گی اس کی۔ اکتیس بتیس۔ اس عمر میں تو تمہارے میاں نے شادی کی تھی بھئی۔" سیما باجی کو صدف بھابھی کا ٹوکنا ہمیشہ سے ناگوار گزرتا تھا۔ آخر میں نتھنے پھلا کر اضافہ کیا۔

"مجتبیٰ کے بعد سب سے بڑی مخالف تم ہی ہو اس شادی کی۔ اپنی بہن کی جگہ تم کسی اور کو نہیں دے سکتیں۔ مان لیا۔ کم از کم اس معصوم بھانجے کا ہی خیال کر لو۔"

سیما باجی کے یوں اچانک طنز نے صدف باجی کا دل چیر ڈالا۔ باقی سب کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے حیرت سے۔ صدف بھابھی کے تاثرات بدلے اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"سیما!!" دادی نے غصے سے ٹوکا۔ "کیا اول فول بکے جا رہی ہو۔ جب بھی آتی ہو ہنگامہ کرنا فرض سمجھ لیا ہے کیا تم نے؟"

"ہاں! بھئی...... میں ہی غلط ہوں اس میں۔ اور میں ہی بے غیرت ہوں جو ہر دفعہ اپنے بھائیوں کی خوشیوں کی خواہش کا اظہار کر کے یہاں بے عزت ہوتی ہوں۔" سیما باجی فوراً اٹھیں۔

"اب ایک نیا تماشہ۔" دادی اپنی پوتی کی رگ رگ سے واقف تھیں' اس لیے ناک بھوں چڑھا کر بولیں۔

صدف بھابھی خاموشی سے وہاں سے اٹھ کر چلی گئیں اور باقی سب سیما باجی کو روکنے کے لیے اٹھے۔ ایسے میں مجتبیٰ اپنے کندھے پر حیدر کو بٹھائے

pklibrary.com

اندر داخل ہوا۔ لاؤنج میں ہنگامہ دیکھ کر رکا۔ اس کو دیکھ کر سیما باجی رو پڑیں۔

"کیا ہوا ہے باجی۔؟" وہ حیدر کو اتار کر ان کی جانب لپکا۔

"وہی پرانی بات۔" سیما باجی کے بجائے امی نے جواب دیا۔

"تمہاری شادی۔ کیوں اپنی ضد پر اڑ گئے ہو' مجتبیٰ! لوگ تمہاری منتیں کر کے تھک چکے ہیں۔ ہر روز کوئی نہ کوئی دل خفا کر کے چلا جاتا ہے۔ صرف تم نے ہی غم نہیں جھیلا' ہم بھی جھیل رہے ہیں۔ اپنے لیے نہ سہی' حیدر کا ہی سوچ لو اب۔" پہلی بار امی کے لہجے میں منت نہیں' غصہ تھا۔ سب تھم سے گئے۔ سیما باجی بھی اپنے آنسو روک کر مجتبیٰ کو دیکھنے گئیں۔

مجتبیٰ نے پیچھے مڑ کر حیدر کو دیکھا' جو کرسی کے ساتھ کھڑا احمد ان کو دیکھ رہا تھا جو شائستہ بھابی کی گود میں تھا۔ پہلی بار اس کو اپنی ضد بے جا لگی اور دل موم کی طرح پگھل گیا۔

"ٹھیک ہے۔ جب آپ لوگوں کی خوشی اسی میں ہے تو مجھے قبول ہے لیکن....." پل بھر کے لیے تھما۔ "یہ حیدر کی پسند پر ہوگا۔"

اور نیچے بیٹھی دادی کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو جھلملا گئے۔ وہ جانتی تھیں کہ حیدر کی پسند کون تھی؟

وہ' جو اس کی فرینڈ تھی.....!

☆☆☆

مجتبیٰ کی ہتھیلیاں پسینہ پسینہ ہو رہی تھیں۔ اس کے سامنے بیٹھی پلوشہ اس کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کے بولنے کے انتظار میں تھی۔

"شائلہ نے آپ کے ماضی کے بارے میں بتایا۔" مجتبیٰ نے تمہید باندھی اور توقف کیا۔ پلوشہ نے نچلا لب کاٹا۔ ایک دم سے اس کا چہرہ تاریک ہوا۔ کبیر کا غصہ' اس کی وحشت' طلاق..... سب کچھ ایک دم سے اس پر آوارد ہوا۔ مجتبیٰ نے اس کے بدلتے تاثرات غور سے دیکھے تھے۔

"میں اکثر سوچتا تھا کہ آپ کی اداسی کے پیچھے کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ مجھے ایسا لگتا تھا کہ ہم میں ایک چیز کامن ہے اور وہ تھی..... شادی..... ایک ناکام شادی اور ایک ختم ہو چکی شادی....." ایک اداس مسکراہٹ اس کے چہرے پر آن ٹھہری۔

"گھر والوں نے مجھے بہت فورس کیا دوسری شادی پر۔ لیکن مجھے یہ کائنات کے ساتھ بے وفائی لگتی تھی۔ میں دوسری شادی نہ کرنے کی ضد پر اڑا رہا اور یہ ضد تب ٹوٹی' جب میں نے حیدر کی نفسیات پر غور شروع کیا۔ وہ جب مجھ سے خفا ہوتا ہے' یا اکیلا محسوس کرتا ہے تو وہ کہیں چھپ جاتا ہے۔ پھر میں نے غور کیا..... وہ جب جب اپنے کزنز کو اپنے والدین کے ساتھ دیکھتا ہے تو تب بھی وہ ایسا لاشعوری طور پر کرتا ہے..... امی ٹھیک کہتی تھیں' ابھی وہ چھوٹا ہے..... دوسری ماں کو قبول کر لے گا..... بڑا ہو کر وہ اپنی ماں کی کمی کو بہت محسوس کرے گا اور یہ احساس اس کی ان سیکیورٹی نہ بن جائے۔"

پلوشہ یک ٹک اس کو سنتی جا رہی تھی۔ شاید پہلی بار دونوں نے خود اپنے ارد گرد بنائے خول کو توڑ کر اپنی کہانی شیئر کی تھی۔

"اتنی لمبی تقریر کے بعد' اصل مدعے پر آتا ہوں۔ میں نے شادی کے لیے ہاں کر دی لیکن میں چاہتا ہوں کہ یہ فیصلہ حیدر کی پسند پر زیادہ ہو..... اور وہ اتنے عرصے میں پہلی بار کسی کو دل سے فرینڈ بنا چکا ہے....." مجتبیٰ اس پر نظریں گاڑے کہہ رہا تھا اور پلوشہ کا منہ حیرت سے کھل گیا اور یک دم چہرہ لال ہو گیا۔ کیا وہ.....؟

"کیا آپ حیدر کی پرمنٹ فرینڈ بنیں گی؟ اس کے ساتھ ہمیشہ کے لیے اس کے گھر میں رہ کر.....؟ آئی نو' آپ کے لیے یہ بہت ویرڈ (عجیب) ہو گا۔ اور مشکل بھی۔ لیکن....." مجتبیٰ خاموش ہو گیا' یوں جیسے بہت تیاری کے بعد کہی گئی باتیں ختم ہو چکی ہوں اور اس کے پاس مزید کہنے کے لیے الفاظ نہیں تھے۔

پلوشہ فوراً اٹھی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

مجتبیٰ بھی فوراً اٹھا۔ ''اگر آپ کو برا لگا ہو تو آئی ایم رئیلی سوری...... آپ کے جواب کا انتظار رہے گا......''

پلوشہ رکی۔ مجتبیٰ اس کو منت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''میں شمائلہ کو بتا دوں گی۔'' اتنا کہہ کر وہ فوراً باہر نکلی۔

☆☆☆

وہ کھڑکی کے پار دیکھ رہی تھی، جہاں مین گیٹ سے وہ لوگ داخل ہو رہے تھے۔ ہنستے چہرے، خوش لباس لوگ۔ مجتبیٰ کی دادی، جریب ٹیکتی، آنکھوں میں خوشی کے آنسو لیے داخل ہو رہی تھیں۔

اس کا دل تیزی سے دھڑکتا جا رہا تھا...... بالکل اسی طرح...... جب مجتبیٰ نے اس کو پروپوز کیا تھا۔ ساری رات وہ بے چینی سے کبھی لیٹ جاتی اور کبھی کمرے میں جلے پیر کی بلی بنی اضطراب میں چہل قدمی کرتی۔ وہ دو عدالتوں کے بیچ معلق تھی۔ ایک عدالت اس کے دل کی تھی اور ایک اس کے ذہن کی۔

وہ خود کو ایک نئے رشتے کے لیے آمادہ نہیں کر پا رہی تھی اور وہ بھی ایک ایسے مرد کے ساتھ، جو اپنی پہلی بیوی کو ٹوٹ کر چاہتا رہا ہو...... یا اس کے اعتبار کے زخم ابھی ہرے تھے۔

پھر اس کا دل کہہ رہا تھا کہ اس اداس آنکھوں والے شخص کا دل کتنا صاف تھا۔ اس کے بقول اس کی مردوں کے بارے میں رائے 'بائیسڈ (متعصب)' تھی۔ وہ کبیر کے معیار پر، مجتبیٰ کو ناپ رہی تھی۔

اور ان سب باتوں سے برطرف، اس کا دل مجتبیٰ کو دیکھ کر دھڑک دھڑک کیوں جاتا تھا؟ کیا وہ اس سے محبت کرنے لگی؟ اس کا جواب جتنا مبہم تھا، اتنا ہی واضح بھی...... بس وہ خود اقرار نہیں کر پا رہی تھی

بلا آخر جب وہ تھک ہار چکی، تو مینو کو کال ملا کر پوری کتھا سنا ڈالی۔ مینو سنتے ہی چیخ پڑی تھی، اس نے فوراً امی کو فون پکڑا دیا۔ پہلے تو اس شرم سے وہ نروس ہو گئی پھر سنبھل کر امی کو سب کچھ بتا دیا تو امی نے فیصلہ اس پر چھوڑ دیا اور یہ بھی کہا کہ اگر وہ اس کو رشتے بھیج دینے کا کہنے کا ارادہ رکھتی ہوں...... تو زہے نصیب۔

امی کے یوں پلو جھاڑ کر، ایک طرف ہو جانے پر اس کو مزید مضطرب کر دیا۔ ساری رات حیدر کا چہرہ اس کے سامنے گھومتا رہا۔ اس کی اداس آنکھیں۔

صبح کی نیلگوں روشنیوں میں جب سفیدی گھل مل رہی تھی، تو اس نے شمائلہ کو ٹیکسٹ کیا۔ شمائلہ کا فوراً جوابی ٹیکسٹ آیا تھا۔

''اوہ مائی گاڈڈڈڈڈڈ!!!!!''

پھر انہوں نے جس دن آنے کا کہا تو وہ گھر آ گئی۔

ابھی وہ کھڑکی میں کھڑی، دیکھ رہی تھی کہ ایسے میں مینو داخل ہوئی۔ مینو کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔

''اللہ! پلوشہ باجی...... کسی سلطنت کے شہزادہ لگ رہے ہیں مجتبیٰ بھائی تو......''

اس نے یقیناً بیٹھک کے دروازے کی جھری میں سے دیکھ لیا ہو گا۔ ''اور گھر والے...... ایسے خوش مزاج...... ان کی دادی اور امی کی تو مانو دوستی ہو گئی ہے۔'' مینو ہنس ہنس کر کہہ رہی تھی۔ ''چلیں...... تیار ہو جائیں اور جلدی سے کچن میں آئیں۔''

ان کے لیے پلوشہ کا رشتہ آنا اور وہ بھی ایسے اچھے خاندان سے غنیمت ہی تھا۔ ابو نے ان کے آنے سے پہلے ان کے خاندان کے بارے میں اچھی خاصی معلومات حاصل کر لی تھیں۔ جنہوں نے یہ معلومات فراہم کیں، وہ مجتبیٰ کی خاندان کے تعریفوں میں رطب اللسان تھے۔ ابو کے کندھوں سے بوجھ ہلکا ہوا اور سکھ کی سانس بھری۔

pklibrary.com

☆☆☆

''ہوٹل میں ٹھہرنے کی کیا ضرورت تھی بھلا؟'' امی خفگی بھرے لہجے میں دادی سے کہہ رہی تھیں۔

وہ سب لوگ سوات آئے ہوئے تھے۔ ایک تیر سے دو شکار۔ رشتہ بھی مانگ لیا اور سوات کی سیر بھی۔

''زیتون بیٹا! اب تو ٹھہرنے تب آئیں گے' جب پلوشہ کے ساتھ دریمہ (شادی کے بعد دلہن کا آنا) میں آئیں گے۔'' دادی نے مسکرا کر کہا۔

ایسے میں ہلکے پیازی رنگ کے کپڑوں میں ملبوس' پلوشہ چائے کی ٹرالی دھکیلتی داخل ہوئی۔ سیما باجی' جنہوں نے آنے سے پہلے خوب واویلا مچایا ہوا تھا کہ ایک طلاق یافتہ لڑکی سے رشتہ کیوں کیا جا رہا ہے؟ اب ان کا منہ پلوشہ کی خوب صورتی دیکھ کر کھلا کا کھلا رہ گیا۔ باقی بھابھیاں بھی حیرت بھری خوشی سے دیکھ رہی تھیں۔ ایسی پری وش لڑکی کو کوئی کیوں کر طلاق دے سکتا ہے؟.....!

''وائی زار و قربان!'' دادی فرط جذبات سے رو دی پڑیں۔ ''وائی زار! دلتہ راشہ (ادھر آؤ) میرے پاس بیٹھو۔'' پلوشہ قدم اٹھاتی' دادی کے پہلو میں بیٹھ گئی۔ دادی نے اس کے ماتھے پر پیار کیا۔

''یہ تو بدری جمالہ پری ہے۔ اتنی پیاری ماشاء اللہ۔'' دادی اب زیتون کی اور مڑیں۔

''دیکھو زیتون بیٹا' آئے تو اس امید پر تھے کہ رشتہ ہو جائے لیکن اب تو جائیں گے ایک ہی صورت میں کہ یہ حور جیسی بیٹی ہمیشہ کے لیے میری بیٹی ہو جائے۔'' دادی کا منت بھرا لہجہ آخر میں سخت ہو گیا۔

زیتون بی بی ان کی بات پر ہنس پڑیں۔ وہ جو اپنے میاں کے ساتھ رات کو ہی فیصلہ کر چکی تھیں' مسکرا کر بولیں۔

''اپنی بیٹی کے ہاتھوں سے بنی چائے پی لیجیے' ورنہ ٹھنڈی ہو جائے گی!!''

☆☆☆

''دادی آپ بتائیں' آپ کے وقت میں شادی کس طرح ہوتی تھی۔ بالکل اسی انداز میں کرتے ہیں۔ اپنے آبائی گاؤں جا کر۔ یہ شادی' ہال میں نہیں کرتے۔'' ارسلان بھائی دادی سے کہہ رہے تھے۔

دادی مسکرائیں۔ ''اب تو حافظہ اتنا کمزور ہو چکا ہے کہ کیا بتاؤں۔ جو جو یاد آتا ہے' وہ بتاتی ہوں۔''

سب دادی کے کمرے میں گھیرا ڈالے بیٹھے تھے۔ شائستہ بھابھی چائے کی ٹرے لے کر اندر داخل ہوئیں اور صدف بھابھی نے ٹرے میں' ڈرائی فروٹس رکھ کر سب میں تقسیم کر دیے۔

''سب سے پہلے تو تاریخ طے ہونے پر' خاندان کے سارے مرد درختوں کی لڑکیاں کاٹ کر لاتے ہیں۔ سارے گھر کے چولہے شروع کرتے' سڑک والی دیوار پر 'شادی مبارک' چونے سے لکھی جاتی جو اس بات کی نشاندہی کرتی تھی کہ اس گھر میں شادی ہو رہی ہے۔''

وہ لوگ اپنے آبائی گھر و رسک روڈ پر آباد اپنے گاؤں جا رہے تھے۔ گاؤں میں مقیم سارے خاندان کے لڑکے جنگل سے درخت کاٹ کر لا رہے تھے۔ گھر کے کچے صحن میں خواتین بیٹھی فنجان (گول کٹورہ نما پیالی) میں گڑ کی چائے پی رہی تھیں۔ دور کھڑی لڑکیاں تصویریں بنا رہی تھیں اور انسٹاگرام اسٹوریز اپلوڈ کیے جا رہی تھیں۔

''پھر ہر گھر میں مہندی بھیجی جاتی تھیں۔''

پڑوس میں اکبر ماما کے صحن میں کھڑی بریرہ (سیما باجی کی بیٹی) اپنی پھپھو کی بیٹیوں کے ساتھ کھڑی پرات میں مہندی دے رہی تھی۔

''اللہ نصیب اچھے کرے' مجتبیٰ خان کی دلہن سوات کی ہے.....اتنی دور؟''

''جی اتنی دور.....''

''سب کو تو سونے کے کڑے وغیرہ بھی دیئے ہوں گے انہوں نے' ان کی تو روایت ہے کہ

گھونٹ (دعائے خیر) کے بعد لڑکے کی بہنوں بھابیوں کو زیور دیتے....."

"وہ دادی نے منع کر دیا۔" بریرہ تنک کر بولی۔

"اور تم لوگوں نے دیئے پیسے؟"

"کس چیز کے؟" بریرہ اب چڑنے لگی' ہر جگہ یہ بات سن سن کر.....

"یہی....." خاتون اشارے سے سمجھاتی۔

"یہی کیا' خالہ؟"

"وہ لوگ لیتے ہیں نا دلہن کے سر پر پیسے۔" جملہ مکمل کرنے کے بعد کھسیانی سی ہنس دیے۔

بریرہ نے اس "دقیانوسی سوچ" پر ان کو پہلے گھورا اور پھر تنک کر بولی۔

"خالہ! وہ سر پر نہیں لیتے..... وہ بھی ان کی روایت ہے کہ اتنا بھاری بھرکم جہیز دیتے ہیں وہ لڑکی کو۔ تو لڑکے والے انہیں لڑکی کے کپڑوں کے پیسے دیتے ہیں جتنی استطاعت ہو۔ جیسے ہم خود بناتے ہیں دلہن کے کپڑے۔ لڑکے والے یہ زحمت بھی انہیں کرنے دیتے ہیں۔ اچھا خالہ' انٹرویو ختم ہو چکا ہو تو پرات دے دیں۔"

"اچھا تو جہیز دیں گی وہ؟"

"خالہ پرات.....؟" بریرہ اب چڑ گئی تھی۔

گھر آکر اس نے پرات پٹخ دیا۔ "یہ ٹریڈیشنل ویڈنگ کا آئیڈیا جس کا بھی تھا' انہیں یہ کام اب خود کرنے چاہئیں۔ میرا تو ہر کسی کو جواب دے دے کر منہ سوکھ گیا بلڈ پریشر الگ بڑھ گیا۔"

ساری خواتین ہنس پڑیں۔

"مزید کچھ میرے دشمنوں والا کرنا ہے؟ بیل گاڑی والی بھی ایک روایت اور ڈھولی بھی بناتے ہیں۔" دادی نے لکڑیاں توڑتے ارسلان سے شرارت سے ہنس کر پوچھا۔

ارسلان بھائی ہانپتے کانپتے پیچھے مڑے۔ "بس دادی! اب نکریزے (مہندی) کا ٹریڈیشن ہی رہنے دیتے ہیں۔ میری توبہ!"

ساری خواتین ہنس پڑیں۔

☆☆☆

نکاح کے وقت دادی نے اپنے سرخ دوپٹے کو نکالا اور پیار سے پلوشہ کے سر پر رکھا' جس پر انہوں نے پلوشہ کا نام لکھا تھا اور اس کو سیتے چار ماہ لگا دیئے تھے۔ حجلہ عروسی میں بیٹھی پلوشہ کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اس کے گالوں کی حدت ہی نہیں ختم ہو رہی تھی۔ وہ کسی خواب کی کیفیت میں تھی۔

ایک نئی زندگی کی شروعات اور وہ بھی بالکل مختلف حالات کے ساتھ۔

ایک نئی نویلی دلہن' جو نکاح کے فوراً بعد تین سال کے بیٹے کی ماں بن چکی تھی۔ کچھ دیر پہلے حیدر اس کے پاس سے گیا تھا۔ دادی نے اس کو سمجھایا کہ اس کی دوست اب اس کی ماما بن گئی ہے اور حیدر اس ماما کے لفظ پر اتنا خوش ہوا کہ وہ بار بار دادی سے پوچھتا تھا.....

"میری ماما؟ دادو..... میری ماما؟" وہ خوشی سے یقین چاہنے والے انداز میں پوچھتا اور اس کے انداز پر پلوشہ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس کو اپنے فیصلے پر خوشی ہوئی..... ایک عجیب احساس تھا' جو دل پر بھاری تو تھا لیکن وہ اس کو نام نہیں دے پا رہی تھی۔ شاید وہ حیدر کو اپنا بیٹا تسلیم کر چکی تھی.....!

شاید نہیں..... یقیناً.....

وہ حیدر کا ماتھا چومتی اور دادی روپڑتیں۔ سیما باجی نے دادی کو روکا۔

"دلہن ہے دادی ابھی۔ کیا کر رہی ہیں آپ۔ حیدر کو ابھی مت بھیجیں۔"

جب حیدر اس کے پاس سو گیا' تو اس کو شائستہ بھابھی اپنے پاس سلانے لے کر چلی گئیں۔ اس کا دل چاہا کہ ان کو روکے لیکن کچھ کہہ نہ پائی۔ کچھ دیر بعد' جب باہر شور کم ہوا تو مجتبیٰ اندر داخل ہوا اور اس کے آتے ہی کمرہ اس کی مخصوص خوشبو سے مہک اٹھا۔

مجتبیٰ اس کے پاس بیٹھا' گھونگھٹ کے پار اس کے مردانہ ہاتھ' رگیں ابھرے دکھائی دے رہے تھے۔ یک دم سے اس کا دل گھبرانے لگا۔

مردانہ ہاتھ..... مرد کی قربت.....

ایک دم سے ماضی کی کھڑکیاں دھڑ۔ سے کھلیں اور گھونگھٹ کے پار مجتبیٰ کی جگہ کبیر نے لے لی۔ معاً کبیر کے ہاتھ بڑھے اور اس کا گھونگھٹ اٹھایا۔ وہ یک دم پیچھے ہٹی اور گلے پر ہاتھ رکھا یوں جیسے ابھی اس کے ہاتھ پلوشہ کے گلے کی طرف بڑھنے والے تھے۔

آنسو کی ایک لمبی لکیر اس کی وحشت سے پر آنکھوں سے بہنے لگی۔ چہرہ زرد پڑ گیا تھا

''آر یو اوکے۔'' مجتبیٰ جو حیرت سے پوچھ رہا تھا' اس نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑا اور پلوشہ نے یک دم اس سے ہاتھ چھڑایا۔

''پلوشہ؟'' مجتبیٰ کی نظریں حیرت سے کھلی رہ گئی کی کھلی تھیں۔ اس نے ایک بار پھر سے اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا۔ لیکن پلوشہ نے فوراً سے خود کو دور کیا۔ وہ گہری سانسیں لے رہی تھی۔ مجتبیٰ حیران پریشان اس کو دیکھتا جا رہا تھا۔ اس کا مسلسل رونا' ردعمل سمجھ ہی نہیں پا رہا تھا۔ معاً وہ اٹھا۔ سائیڈ ٹیبل سے پانی کا گلاس بھرا اور اس کو پیش کرنے لگا۔

''پلوشہ! کام ڈاؤن پلیز..... میں تمہاری مرضی کے بغیر ہاتھ نہیں پکڑوں گا..... یہ میرا وعدہ ہے تم سے..... یہ لو پانی پیو!'' وہ نرمی سے کہہ رہا تھا۔ پلوشہ رخ موڑے ہوئے' ویسے ہی گہری سانسیں بھر رہی تھی۔

کچھ دیر کے لیے ان کے درمیان خاموشی چھائی رہی' جب پلوشہ کا خوف تھوڑا کم ہوا تو اس نے مڑ کر دیکھا..... مجتبیٰ ہنوز' پانی کا گلاس لیے کھڑا تھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ پلوشہ نے نظریں چرا کر' گلاس پکڑا لیکن تب تک کافی دیر ہو چکی تھی..... کیونکہ..... مجتبیٰ کو ان نظروں نے ساری کہانی سنا دی تھی۔

☆☆☆

صبح کی البیلی روشنیاں' نئے نکور ہلکے جامنی سلک کے پردوں کے پار ہوتی' اندر ایرانی قالین پر استراحت فرمانے کی سر توڑ کوشش کر رہی تھیں۔ باہر سے ہلکی ہلکی آوازوں کا شور' اس کے کانوں میں پڑ رہا تھا۔ اس کی رات کو کب آنکھ لگی' پتا ہی نہیں چلا۔ مجتبیٰ کے جانے کے بعد' وہ دیر تک بیٹھی شرمندہ ہوتی رہی۔ اب اس کا دل دھڑکتا جا رہا تھا کہ وہ مجتبیٰ سے نظریں کیسے ملا پائے گی؟.....

معاً دروازے پر دستک ہوئی۔ امی کی مہربان آواز آئی۔ ''پلوشہ بیٹا!''

وہ فوراً اٹھی' جلدی سے دروازہ کھولا۔

''صبح بخیر بیٹا!'' امی نے آگے بڑھ کر' اس کا ماتھا چوما۔ ''تم جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ تاکہ سب ناشتہ کر لیں ایک ساتھ۔ تمہارے انتظار میں بیٹھے ہیں سب۔''

امی یہ کہتی مڑ گئیں اور وہ کچھ لمحوں کے لیے وہیں شل کھڑی رہی۔ اس کے کانوں میں تائی کی آواز گونج رہی تھی۔

''بیٹا' شادی کے پہلے دن یہ سبق ذہن نشین کر لو کہ گھر کے بڑے اور مرد سب سے پہلے ناشتہ کرتے ہیں..... اس لیے ناشتے کے لیے جلدی اٹھا کرنا.....''

وہ سر جھٹکتی مڑی۔ صدف بھابھی نے پہلے سے ہی اس کے لیے پہلے دن کے کپڑے منتخب کر کے رکھے ہوئے تھے۔ اس لیے وہ جلدی سے تیار ہو کر ڈائننگ روم جانے لگی۔ جہاں سب چہکیں ہانک رہے تھے۔ ارسلان بھائی مسکراتے ہوئے مجتبیٰ کی ٹانگ کھینچ رہے تھے۔

''ویسے دادی! چونکہ یہ شادی تو ہمارے پرانی روایتوں پر ہوئی ہے۔ تو ایک روایت میں بھی یاد دلاتا چلوں کہ دولہا شادی کے پہلے تین دن حجرے میں گزارتا ہے..... اس لیے قواعد وضوابط کے عین مطابق اس نئے دولہا میاں کو حجرے میں ہونا چاہیے۔''

سب ہنسنے لگے..... سیما باجی اپنے بھائی کو

بچانے کو دیں۔

"آپ اپنی خاطر بچائے رکھیں۔ حجرہ نہیں' تو روایت نہیں۔" آخر میں 'ہونہہ' کا اضافہ بھی.....

"حجرہ نہ سہی..... بیٹھک ہی سہی....." شائستہ بھابھی ہنس کر بولیں۔

"خود تو شادی ہال میں اپنی بیگم کے پہلو میں ایسے چپکے بیٹھے تھے کہ مانو صدیوں بعد شادی ہوئی ہو۔" دادی نے بھی مجتبیٰ کی سائیڈ لی۔

"میاں! دو لمحے شادی کے بعد تین دن حجرے میں گزارتا ہیں' تم نے تو وہ شادی کے فوراً بعد میکے میں گزارے تھے۔" حفیظ لالہ بھی کود پڑے اور ان کی بات پر سب قہقہے لگانے لگے۔

معاً دادی کی نظریں پلوشہ پر پڑیں۔ "وائی میری سوات کی پری! آؤ..... آؤ..... اٹھو مجتبیٰ۔" دادی کے اشارے پر مجتبیٰ اٹھا اور پلوشہ کے لیے کرسی کھینچی۔ اس پر سب خوشی سے مسکرائے اور خواتین نے "اوووو" کی آواز لگائی۔ ناصرف پلوشہ بھی شرمائی بلکہ مجتبیٰ بھی شرما کر فوراً اپنی نشست پر براجمان ہوا۔

پلوشہ نے اپنے سامنے بیٹھے مجتبیٰ کو دیکھا' اسی وقت مجتبیٰ نے بھی دیکھا۔ اس کی نظروں میں کل والی بات کا کوئی شائبہ تک نہیں تھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ گھر والوں کے مذاق اور لطیفوں پر ہنس رہا تھا۔

کیا وہ اداکاری کر رہا تھا؟ یا وہ غصہ تھا..... کبیر کی طرح؟ جب کبیر کو اس کے میکے میں کسی کی بات بری لگتی تو تب تو وہ ہنس کر بات کرتا لیکن گھر آ کر اس پر خوب چلاتا' مارتا۔ معاً اس کی دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی۔ وہ نچلا لب اضطراب میں کاٹنے لگی۔

☆☆☆

دوپہر تک وہ مبارکی کے لیے آتے رشتے داروں کے نرغے میں پھنسی رہی اور مجتبیٰ بھی بیٹھک میں مہمانوں کے ساتھ مصروف رہا۔ حیدر کے اٹھتے ہی امی نے اس کو آملیٹ بنا کر دیا۔ اب اس کا فیڈر رات تک محدود ہو چکا تھا۔ جب گھر میں مہمان نہیں ہوتے' تو پلوشہ اس کے ساتھ لگی رہتی..... اس کے ساتھ کارٹون دیکھتی' یا اس کے ساتھ کھیلتی.....

"ہائے' ابھی تو بچہ ہے۔ نئے مہمان کی خوشی میں' اس کے اردگرد منڈلاتا جا رہا ہے۔ جب اس کو پتا چلے گا کہ سوتیلی ماں ہے یا اس کے خود کے بچے ہوں گے تو خود ہی پس منظر میں چلا جائے گا..... ہائے بے چارا حیدر..... اور یہ نئی بہو تو دکھاوے کے لیے کرتی ہوگی' لکھ لو میری بات۔" دادی کی چچازاد' رضیہ خالہ آئی ہوئی تھیں' جو جاتے ہوئے برآمدے میں اپنی بہن کو کہہ رہی تھیں۔ یہ صرف اس نے ہی سنا تھا اور ان کو 'خدا حافظ' کہتی امی نے..... دونوں کی نظریں ملیں اور نا چاہتے ہوئے بھی پلوشہ کو شرمندگی محسوس ہوئی۔

جب وہ جا چکے' تو امی اس کے کمرے میں آئیں۔ ان کے ہاتھ میں دو کپ تھے۔ ایک پلوشہ کو پیش کیا۔

"چائے پیو گی' پلوشہ؟"

"اب آپ لا چکی ہیں' امی! تو پینی پڑے گی۔" وہ خوش دلی سے مسکرائی۔

"پتا ہے' پلوشہ۔ لوگ پیٹھ پیچھے' وہی باتیں کرتے ہیں جنہیں ہم یا تو بھلانا چاہتے ہیں یا وہ ہماری کمزوری ہو۔ وہ سو فیصد سچ بھی ہو تو بھی..... ہم اس کو کہیں دفنا دینا چاہتے ہیں۔" امی بنا اس کو دیکھے کہہ رہی تھیں۔ معاً اس کو دیکھا۔ "اگر کبھی غلطی سے وہ باتیں سن بھی لیں تو اس پر دل برا مت کرنا..... تمہارے خلوص پر ہمیں کوئی شک نہیں ہے۔ کبھی بھی دوسروں کی اپنے بارے میں باتیں سن کر' اپنی ہی نظروں میں شرمندہ مت ہونا۔" ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ چوما۔

پلوشہ ان کی اس محبت پر موم کی طرح پگھل گئی۔ آنکھیں بھرنے لگیں۔

"تمہاری امی کا فون آیا تھا۔ وہ لوگ ناشتہ بھیج رہے تھے' ہم نے منع کر دیا۔ اب جائیں گے نادریمہ

کے لیے تو خوب ناشتہ بھی کرلیں گے' لنچ بھی' ڈنر بھی۔" امی مسکرائیں۔

☆☆☆

شام کو جب سب دادی کے کمرے میں مشغول تھے' وہ حیدر کو سلا رہی تھی۔ اگرچہ امی نے منع بھی کیا لیکن حیدر اپنی 'فرینڈ' کے پاس سے ہل ہی نہیں رہا تھا۔ پلوشہ حیدر کے ساتھ رکنے کے لیے بضد رہی تو امی بھی مسکراتی چلی گئیں یہ سوچ کر' کہ ویسے بھی ابھی مجتبیٰ آجائے گا۔ دونوں کو ساتھ بیٹھنے کا موقع مل جائے گا۔

جب حیدر سو چکا تھا' تو اس نے آرام سے اس کا شیب بند کیا اور کیپل ٹھیک کرتے ہوئے اٹھنے ہی لگی تھی کہ اپنی انگلی کو حیدر کے ننھے ہاتھ کے حصار میں پایا۔ اس کا دل عجیب احساسات سے بھر گیا۔ یوں بغل مارے کہیں چھپی ممتا یک دم آنسو وار ہوئی.....!

وہ جھک کر' حیدر کا ماتھ چومنے لگی تھی کہ ایسے میں لائٹ آن ہوئی۔ مجتبیٰ کی نظریں اس پر پڑیں۔

"لائٹ آف کردیں' حیدر جاگ جائے گا۔"

وہ لڑکی' جو حیدر کے ساتھ دو دن گزر چکی تھی' وہ اس کو حیدر کے بارے میں بتا رہی تھی۔ وہ مسکرایا اور لائٹ آف کردی۔

"ہاں..... تم ٹھیک کہہ رہی ہوں' پلوشہ!" اس کا لہجہ مسکراتا ہوا تھا۔

دونوں اپنی جگہ کھڑے رہے' شام کی نیلگوں روشنیوں میں دو ہیولے نظر آرہے تھے۔ معاً ایک ہیولے اس کی اور بڑھا۔ دوسرا ہیولہ اپنی جگہ ساکت رہا۔ کلون کی خوشبو اس کی حواسوں پر چھائی' دم گھونٹنے لگی۔ مردانہ سانسوں کی خوشبو اور اس کا ہاتھ۔ پکڑتا مردانہ ہاتھ کی گرفت.....

چھناکے سے شیشہ ٹوٹا۔ کسی نے دیوار پر شیشے کا گلاس دے مارا۔ اس خاموش میں کئی شاموں کی گونج ابھری اور وحشت بے لگام گھوڑے کی مانند جو' سرپٹ بھاگنے لگا۔ کوئی چیخا تھا۔ وہی ایک جیسی آواز

کبیر کی غصے کی آواز۔

کوئی چیز ٹوٹنے کی آواز۔

کان میں گونجتے تھپڑ کی آواز۔

اس کی سانس چڑھنے لگی۔ وہ ہیولہ تیزی سے پیچھے ہوا۔ دفعتاً لائٹ آن ہوئی اور مجتبیٰ نے دیکھا کہ ایک ہی جگہ شل سی کھڑی پلوشہ' گہری سانس لیتی بے آواز رو رہی تھی۔

"پلوشہ..... پلوشہ.....!" وہ آگے بڑھا۔ آگے بڑھ کر اس کو جھنجھوڑ کر صوفے پر بٹھایا۔ پانی کا گلاس بھر کر اس کو دیا اور اس کے قدموں میں بیٹھ کر اس کو تشویش سے دیکھنے لگا۔

"آئی ایم سوری!"

پلوشہ پانی پی چکی' تو دھیمے لہجے میں بولی۔ گود میں دھرے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ مجتبیٰ نے اس کے کانپتے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھا۔

"ڈونٹ روی!"

اب کی بار' اس کے لمس پر وہ خوف زدہ نہیں ہوئی۔ یہ لمس بہت سکون دے رہا تھا یوں جیسے کسی مہربان دوست نے اس کی روح کو چھو لیا ہو..... ایک تحفظ کا احساس ہونے لگا.....

وہ حق رکھتا تھا اس پر' لیکن وہ اس کو کہہ رہا تھا کہ اس کے مرضی کے بغیر وہ اس کا ہاتھ نہیں پکڑے گا..... وہ اس کو جوتے کی نوک پر رکھ کر ٹھوکر مار سکتا تھا لیکن وہ الٹا اس کے قدموں میں بیٹھا تھا.....

ہر بار وہ کبیر کے پیار نے پر اس کو ناپتی اور ہر بار وہ پیمانے کو توڑ دیتا تھا۔

☆☆☆

شادی کے بعد' اس کے گھر کی طرف سے دعوت لیٹ کر دادی گئی تھی اور یہ دادی کا فیصلہ تھا۔

"میں چاہتی ہوں' زیتون بیٹا! کہ یہ دریہ دو تین ہفتے بعد کرلیتے ہیں۔ یہاں بچوں کو بھی تھوڑا وقت مل جائے۔ پہلے سوات سے پشاور تک سفر میں' پھر مہمانوں کے نرغے میں بیٹھنے سے ذرا جو ان میاں بیوی کو فرصت ملی ہو۔" دادی آخر میں ہنس

پڑیں۔

زیتون بی بی نے نہ اصرار کیا اور نہ ہی خفا ہو بیٹھیں۔ وہ تو اس بات پر خوش تھیں کہ اتنے پیار کرنے والے گھرانے میں ان کی بیٹی کی شادی ہوئی۔ پلوشہ کے لہجے کی بشاشت اور کھنک اس کے خوش ہونے کا عندیہ دیتی تھی اور زیتون بی بی کا دل پرسکون ہو جایا کرتا تھا۔

اور سچ تھا کہ پلوشہ انتہائی خوش تھی اور کبھی کبھی حیران بھی رہ جاتی تھی۔ شاید اس کی حیرانی کی اہم وجہ یہ بھی تھی کہ اس کے سامنے جو ہو رہا ہوتا تھا وہ بالکل اس کے ماضی سے الٹ تھا۔ وہاں اگر تائی، غیظ بھری بن کر انتہائی زہریلی تھی' یہاں دادی اور امی اس کے صدقے وارے جاتی تھیں..... تائی کے بالکل الٹ۔

یہاں کوئی بلاوجہ کا غصہ نہیں کرتا تھا' حفیظ بھائی شام کو آتے تو انہوں نے کبھی صدف بھابھی پر غصہ نہیں کیا جو چائے لاتے وقت اکثر دیر کر دیتی تھیں۔ وہ صبر سے بھابھی کا انتظار کرتے۔

ایک دن ارسلان بھائی نے شائستہ بھابھی پر غصہ کیا تھا۔ امی نے ارسلان بھائی کو تب تک معاف نہیں کیا' جب تک انہوں نے شائستہ بھابھی سے معافی نہیں مانگ لی۔

''مرد اور جانور کے بیچ کا فرق صرف ماں کی ہی طے کرتی ہے۔'' دادی کہتیں۔

اس کے لیے اپنے ہی ماضی کا حال سے موازنہ حیرت میں مبتلا کر دیتا تھا۔ ایک تائی کا گھر تھا' جہاں انہوں نے پہلے تایا کے غصے کو سہہ کر' اس کو تایا کا حق مان دیا اور پھر بھی اپنا جیسا بنایا۔ تائی نے تایا کو وہ سب کچھ کرنے دیا اور جو انہوں نے اپنی مردانگی کا حق مانا اور اس ماحول میں ان کے دونوں بیٹے تایا جیسے ہی پروان چڑھے..... جنہوں نے اپنی زندگی کے ساتھ' دوسروں کی زندگی بھی برباد کر ڈالی۔

رفتہ رفتہ وہ یہاں گھل مل گئی۔ ان کی چھٹیاں بھی ختم ہو جانے کو تھی' جس کے بعد دونوں نے اپنی پی ایچ ڈی مکمل کرنا تھا۔

☆☆☆

وہ دادی کے کسی رشتے دار کے ہاں دعوت پر جا رہی تھی۔ مجتبیٰ کا خاندان' ان کے مقابلے میں کافی بڑا تھا۔ شادی کے دو ہفتوں تک مسلسل کسی نہ کسی کی ہاں دعوت ہوتی۔

مجتبیٰ اپنے کپڑے نکال رہا تھا۔ شلوار دیکھی' تو ازار بند نہیں تھا۔

''لائیں' میں ڈالتی ہوں۔'' اس نے اپنا میک اپ چھوڑا اور اس سے کپڑے لینے لگی۔

''نہیں..... تم اپنا میک.....''

پلوشہ نے بنا کچھ کہے' اس سے شلوار لے لی۔ وہ شاور لینے اندر چلا گیا۔ ان کے درمیان ابھی تک روایتی میاں بیوی کے تعلقات نہیں تھے۔

وہ اس خوف سے کسی صورت چھٹکارا نہیں پا رہی تھی۔

اس کا دل چاہا' وہ مینو سے اپنی کشمکش کا اظہار کر دے' لیکن مینو نے فوراً ہی امی کو بتا دینا تھا..... لاکھ منع کرنے کے باوجود بھی.....

جب وہ دعوت سے لوٹے' تو مجتبیٰ بھی عین اسی وقت آیا۔

ارسلان بھائی کی گہری عقاب جیسی نظروں نے تیزی سے اپنے کمرے جاتے مجتبیٰ کی طرف دیکھ لیا۔

''میاں! قمیص الگ..... شلوار الگ.....'' ارسلان بھائی کا قہقہہ بڑا جان دار تھا۔

سب کی نظریں مجتبیٰ کی شلوار پر جا پڑیں اور مجتبیٰ کے قدم رکے' اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ سب ہنس رہے تھے۔ اس نے سامنے دیکھا' جہاں پلوشہ کا چہرہ ایک دم فق ہو چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ پلوشہ کے چہرے پر سب کی نظر پڑتی۔ اس نے فوراً کہا۔

''میں نے پلوشہ کو دو سوٹ نکالنے کا کہا تھا۔ میں نے بے دھیانی میں ایک کا شلوار پہنا اور ایک کی قمیص جب نوشہرہ پہنچا' تبھی کسی نے یوں مذاق اڑایا

تو دھیان گیا..... ویسے اتنا کوئی بڑا ایشو تھوڑی ہے' انسان ہے بھول چوک ہو ہی جاتی ہے۔"

"ہاں میاں' الٹی شلوار پہننے سے تو بہتر ہے پہن لی دوسری شلوار پہننا۔" دادی نے ارسلان بھائی کی ٹانگ کھینچی۔

"آپ کو ضرور مجتبیٰ کی وکالت کرنی ہوتی ہے' دادی!" ارسلان بھائی مصنوعی خفگی سے بولے۔ "وہ تو شائستہ....."

دادی نے فوراً اس کی بات کاٹی۔ "ہاں بھئی! اب سارا نزلہ بیگم پر اتار دو۔ خود آنکھوں کے بجائے بٹن لگے تھے۔"

"بس حادثہ تھا وہ ایک۔" ارسلان بھائی نے ہار مان لی۔

وہ سب ایک دوسرے کے ساتھ ہنسی مذاق کر رہے تھے اور پلوشہ یک ٹک مجتبیٰ کو دیکھے جا رہی تھی اس کا دل عجیب لے پر دھڑکنا جا رہا تھا۔ دل' جو کچھ دیر پہلے خوف سے لرزا تھا۔ اس شخص کے لیے دھڑک رہا تھا' جس نے سب کے سامنے اس کی غلطی کی پردہ پوشی کی تھی.....

مجتبیٰ نے اس کو دیکھا اور اس نے مجتبیٰ کو۔ مجتبیٰ اپنے کمرے کی اور بڑھ گیا۔ پلوشہ بھی اس کے پیچھے ہولی۔

"آئی ایم سوری!" وہ سر جھکائے کہہ رہی تھی۔ اس کی وجہ سے' مجتبیٰ نے کتنی شرمندگی جھیلی تھی۔ اس کا دل پگھل کر' آنکھوں کے رستے آنسو بہانے لگا۔ مجتبیٰ نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور فوراً اس کی اور بڑھا۔

"تم رو کیوں رہی ہو۔ اتنی بڑی بات تھوڑی تھی کہ میں غصہ کرتا۔ غلطی تو میری بھی تھی۔ میں نے بھی بنا دیکھے پہن لی تھی۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑے کہہ رہا تھا۔ ایسے میں پلوشہ نے نظریں اٹھائیں' اور مجتبیٰ نے فوراً اس کے ہاتھ چھوڑے تھے۔ وہ شرمندہ ہو گیا تھا۔

پلوشہ کو اس کے ہاتھ چھوٹنے کا درد لمحے کے ہزارویں حصے میں آ ہوا اور اس نے آگے بڑھ کر مجتبیٰ کا ہاتھ تھاما۔ خوف کی دیوار چھناکے سے ٹوٹی۔ مجتبیٰ نے آگے بڑھ کر اس کے گالوں پر بہتے آنسو صاف کیے۔

پلوشہ کا دل اس کے لمس سے پگھلنے لگا تھا۔

☆☆☆

"میاں بیوی کا رشتہ اتنا مضبوط ہونا چاہیے کہ ان کے درمیان بے رخی کی' غلط فہمی کی دیوار حائل ہونا جائے ..... وہ خود ہی زمیں بوس ہو..... کسی بھی تیسرے کی مدد یا مداخلت کے بغیر....." دادی کی آواز میں ماضی کے پرانے جھرنوں کی جھنکار سی تھی۔

حیدر کو ناشتہ کروا کر' وہ ابھی دادی کے ساتھ تخت پر بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ حیدر اور مجتبیٰ قریبی مال گئے تھے۔

ان کی بات پر وہ ہلکا سا مسکرائی۔ دادی ٹھیک ہی کہہ رہی تھیں۔ وہ جو خود مجتبیٰ کی قربت سے خوف زدہ تھی۔ اس کے چھوتے ہی ماضی کا اژدھا اس کے اعصاب پر سوار ہو جایا کرتا تھا۔ وہ دیوار خدا نے خود ہی دھڑام سے زمین بوس کر دی تھی۔

"تم مجھے اس لیے نہیں پیاری ہو پلوشہ، کہ تم مجتبیٰ کی بیوی ہو اور اس شادی کے لیے ہم نے بہت سی کوششیں کیں بلکہ اس لیے..... کہ تم میرا ماضی ہو..... میرا آئینہ ہو تم۔ میرا پہلا شوہر....." دادی کی نظریں چھت پر ٹکی تھیں۔ ان کی بات پر پلوشہ نے فوراً سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ "انتہائی شدت پسند پختون تھا۔ بات بات پر غصہ ہوتا تھا۔ نمک نہ ہونے پر مارتا تھا اور زیادہ ہونے پر بھی۔ میں سہہ لیا کرتی تھیں کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ اگر میں کچھ کہہ دوں تو مجھے طلاق دے دے گا اور میرا باپ شرم کے مارے کہاں کہاں منہ چھپاتا پھرے گا۔ پھر دنیا ایک دم سے بدل گئی' جب میں پیٹ سے ہو گئی۔ ایک دم سے الگ .....

میرے سوچنے کا نظریہ بدل گیا تھا۔ اندر بنتے وجود کی سوچیں ہمہ وقت ذہن میں چلتی تھیں۔ اور

تب میں نے خود کو مضبوط پایا کہ میرا بچہ ایک ایسے گھر میں نہیں پلے گا جہاں گالی دی جاتی ہو جہاں مار پیٹ کی جاتی ہو..... ایک ماں کیسے سہہ لے کہ اس کی اولاد کو اس کے سامنے پیٹا جائے؟..... پہلی بار میں نے اس کا ہاتھ روکا تھا۔ پورے خاندان میں' میری ساس نے مجھے نافرمان اور بدکردار مشہور کردیا۔ باپ نے بھی منہ موڑ لیا۔ مور جان نے خوب ہمت بندھائی۔

جس بچے کے لیے اتنا بڑا قدم اٹھایا' وہ جنم لیتے ہی مر گیا۔ پھر میری دوسری شادی کروادی گئی۔ اور تب سے میں نے یہ ٹھان لی تھی کہ میرے گھر میں کوئی بلاوجہ عورت پر ہاتھ نہیں اٹھائے گا' گالی نہیں دے گا۔ ایک دن مجتبیٰ کے باپ نے' اس کی ماں کو غصے میں کچھ کہا۔ اگرچہ غلطی اس کی بھی لیکن پھر بھی ..... میں نے اس کو معافی مانگنے پر مجبور کردیا۔ غلطی اس کی بھی یا نہیں' مرد کو اپنے دل میں معاف کردینے کی وسعت رکھنی چاہیے۔"

پلوشہ کے دل میں ان کی عظمت مزید بڑھ گئی۔ سر جھکا کر اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"میں آپ کی طرح بہادر نہ تھی۔ میں چپ چاپ ظلم سہتی رہی۔ اور سب سے بڑا ظلم ہی یہی ہے۔"

"جو ہوا وہ ماضی ہے۔ ماضی کو سبق کے لیے یاد رکھنا چاہیے' اس پر آنسو بہانے کے لیے نہیں۔ تم اپنی اس غلطی کو اپنی اولاد کی تربیت میں برابر کردو۔ ایک ماں ہی اپنی اولاد کی فطرت بناتی ہے۔ اب دیکھو' پورے خاندان میں میری اور میرے گھر کی مثالیں دی جاتی ہیں۔ اگر وہ عورت کے حقوق کے بارے میں ہو' یا خود آپس میں بھائی چارے کی..... الحمدللہ میرے گھر کی کوئی مثال نہیں۔"

اس نے پہلی بار سر اٹھا کر فخر سے انہیں دیکھا۔ وہ اس گھر میں ان کی تربیت میں پلنے والے انسان سے خوف کیسے کھا سکتی ہے۔

اسی وقت مجتبیٰ اور حیدر داخل ہوئے۔ ان کو دیکھتے ہی اس کے چہرے پر ایک بھرپور مسکراہٹ سج گئی۔

☆☆☆

"آپ لوگوں نے دعوت کو پینڈنگ میں ڈالا ہوا تھا کب سے....." "مینو اس سے فون پر گلہ کررہی تھی۔ "شکر ہے تمہاری دادی نے اب آنے کی نوید سنادی ہے۔ اچھا امی کہہ رہی ہیں' کہ دادی سے کہیے گا اس بار ہوٹل میں مت ٹھہریے گا۔ یہاں انتظام کیا ہوا ہے۔"

"اوکے..... مینو۔" وہ مسکرا کر بولی۔ "اچھا مجھے پیکنگ کرنی ہے۔ بعد میں فون کرتی ہوں۔"

اس نے یہ کہہ کر موبائل بند کیا اور پیکنگ کرنی لگی۔ اسے میں پیچھے سے ایک مردانہ ہاتھ نے اس کی کلائی پکڑی اور اس کو اپنی اور کھینچا۔

اس کا چہرہ یک دم سرخ گلال ہوگیا۔

"اتنی پھیکی کلائیاں.....؟" وہ خفگی سے بولا۔

"کلائیاں تو آپ کی بھی پھیکی ہیں۔" اس نے حساب برابر کرنے کے انداز میں ہنس کر کہا۔

"اب میں ان ہاتھوں پر مہندی لگاتے اچھا لگوں گا؟"

پلوشہ نے فوراً اپنے ہاتھ آگے کیے۔ "ان ہاتھوں پر تو لگاتے برے نہیں لگیں گے ناں....."

مجتبیٰ نے پھر سے اس کے ہاتھ پکڑے اور اپنی اور کھینچا۔ وہ شرارت سے کچھ کہنے والا تھا کہ وہ جلدی سے بولی۔ "حیدر!"

مجتبیٰ نے فوراً اس کا ہاتھ چھوڑا اور پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھے ہنس رہی تھی۔ مجتبیٰ نے مصنوعی خفگی سے منہ بسورا۔

"سارے رومانس کا بیڑہ غرق کردیا۔"

"اور آپ جو میرا وقت برباد کررہے ہیں' اس کا کیا؟" وہ واپس پیکنگ کرنے لگی۔ "اتنا نہ ہوا کہ ایک کپ چائے بنا کر لے آئیں، بیگم صبح سے لگی کام کررہی ہے۔"

مجتبیٰ نے اٹھ کر سیلوٹ کیا۔ "جو حکم' بیگم!"

وہ اس کی فرماں برداری پر مسکرادی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ چائے کے دو کپ لیے حاضر تھا۔ لیکن تب حیدر آچکا تھا اور اب پلوشہ کے ساتھ بیٹھا ہنسی مذاق کر رہا تھا۔

ایک گھنٹے بعد وہ سب اپنی اپنی گاڑیوں میں سوار سوات جانے کے لیے تیار تھے۔

☆☆☆

"کبیر نے دو شادیاں کیں۔ پہلے اپنی کسی کولیگ سے۔ اس نے دوسرے مہینے ہی طلاق لے لی تھی اور پھر تائی کی دور کی کسی بھانجی سے...... وہ شادی تین ماہ چلی۔ اس نے کبیر کو ٹیسٹس کروانے پر راضی کیا اور ساری کمی کبیر کی ہی تھی، وہ ہی ان فرٹائل تھا۔" مینو کے لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔

"تین ناکام شادیوں کے بعد اب کوئی راہ چلتا فقیر بھی اس کو اپنی بیٹی نہ دے۔" مینو برتن دھوتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ وہ جو برتن کو دیکھتی، ماضی میں کھوئی ہوئی تھی۔ ایک دم اس نے منہ پر ہاتھ رکھا اور بیسن کی اور جھکی...... اندر آئی امی کا چہرہ خوشی سے لبریز ہو گیا۔

مینو اس کو جوس پیش کر رہی تھی اور اس کی ساس کو خبر کر کے مجتبیٰ کو بلا چکی تھی۔ جب وہ نکلی تو سب صحن میں کھڑے تھے۔

"چلیں؟" مجتبیٰ امی سے پوچھ رہا تھا اور وہ حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

مینو نے ٹہوکا بھرا۔ ڈاکٹر کے پاس اور کہاں

مینو کی سرگوشی پر اس کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا۔ مجتبیٰ کی مسکراتی آنکھوں سے نظریں چرا رہی تھی۔ جب وہ لیڈی ڈاکٹر کے ہاں لوٹ کر آئے تو دادی اس کی ماں کے گلے لگ رہی تھیں۔

"زیتون بیٹی! تم نانی اور میں پردادی بننے والی ہوں۔ الحمدللہ!"

زیتون بی بی اسی وقت اللہ کے سامنے سربسجود ہو گئی تھیں۔ ایک یہی خوف تھا جو ان کو پلوشہ کی دوسری شادی کے بعد ستائے جا رہا تھا۔

☆☆☆

اس نے ہلکے گلابی رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ آج سیما باجی آئی تھیں اور حسب معمول حفیظ لالہ کے پورشن میں باربی کیو کا پروگرام تھا، جس کی ذمہ داری ساری مردوں کے سر تھی۔

"شکر ہے، اتنے عرصے بعد مجتبیٰ کا مسکراتا چہرہ دیکھ رہی ہوں۔" سیما باجی، مجتبیٰ کو خوشی سے دیکھتے ہوئے رہی تھیں۔ جو مرتضیٰ بھائی کے ساتھ گوشت کو مسالا لگا رہا تھا۔

وہ حیدر کو سوئیٹر پہنا کر اپنے ساتھ لے آئی۔ وہاں ہلکی پھلکی باتیں چل رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد جب وہ سب کھانا کھا چکے تو الاؤ کے گرد بیٹھ گئے۔

"مجتبیٰ! بہت عرصہ ہو گیا تم نے ہمیں کوئی گانا نہیں سنایا۔" صدف بھابھی نے فرمائش کی۔

"ہاں نا...... تمہارا گٹار بھی بے چارا تم سے ناراض ہو چکا ہوگا۔" سیما باجی بولیں۔

"نہیں۔ رہنے دیں۔" وہ ہنس کر سر نفی میں ہلا رہا تھا۔ سب شروع ہو گئے۔ "او کے فائن۔ بس ایک گانا۔"

سیما باجی کی بڑی بیٹی فوراً بھاگی اور اس کا گٹار اٹھا لائی۔ سب خاموشی سے اس کو سننے لگے۔ اس نے پلوشہ کو دیکھا۔

"یہ گانا میری پیاری بیوی کے لیے۔" اس نے محبت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ سب کی شرارتی آوازوں پر پلوشہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

اس نے گانا شروع کیا۔

گل دی پہ زلفوں باندی قطار دی
(پھول تمہارے بالوں میں سجے ہیں)
دوانڑہ چشمان دی، گل دہ انار دی......
(دونوں آنکھیں کھلتی ہوئی پھول جیسی ہیں)
توبہ...... توبہ......
گل دی پہ زلفوں ......

وہ محبت سے اس کو دیکھتا گا رہا تھا۔ اور پلوشہ اس کی محبت میں پور پور ڈوب چکی تھی۔

☆☆

صائمہ نور

مستبر

صبح سے چابک دستی کا مظاہرہ کرتے، متحرک اعصاب و عضلات، وین کی نرم سیٹ نیم وا اندھیرا اور اے سی کی ٹھنڈک ملتے ہی یک دم ڈھیلے سے پڑ گئے تھے۔ رافعہ نے نشست سے ٹیک لگاتے ہوئے — آنکھیں موندی تھیں۔ پتا نہیں کیوں لوگ کہتے ہیں کہ اسکول کی جاب، پارٹ ٹائم جاب کی طرح ہے۔ آدھا دن جاب کرو، آدھا دن گھر پر۔ کوئی یہ نہیں جانتا تھا کہ اس آدھے دن میں یہ اسکول والے انسان کو نچوڑ لیتے ہیں اور باقی آدھا دن کاپی چیکنگ اور اگلے دن، پڑھائے جانے والے اسباق کی تیاری میں ہی نکل جاتا ہے، کوئی کچھ بھی کہے رافعہ تو ٹیچنگ کو ہمیشہ فل ٹائم جاب ہی کہا کرتی تھی۔

تھکاوٹ سے چور، ذہن مختلف سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ اس نے سر جھٹکا۔ گھر آنے ہی والا تھا اس نے فکر سے وقت دیکھا۔ وہ گھر پہنچی اور پھرتی سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ صبح وہ مونگ مسور کی دال بھگو کر گئی تھی کہ بھیگی ہوئی دال پکانے میں مشکل سے بیس منٹ لگتے ہیں، ہاتھ منہ دھو کر سب سے پہلے دال چولہے پر رکھی، چاول بھگو کر ابالنے کے لیے پانی رکھا، اچار پیالے میں نکال کر میز پر رکھا۔ اب وہ شیلف سے پاپڑ کا پیکٹ نکال کر تل رہی تھی۔ دال چاول کے ساتھ تمام لوازمات لازم و ملزوم تھے۔ رافعہ نے پھر گھڑی دیکھی بس بچے اور خاور آنے ہی والے تھے۔ خاور کا آفس قریب تھا تو وہ لنچ گھر پر ہی کرتے تھے۔ وہ کھانے کی تمام تر تیاری مکمل کر کے اب میز پر برتن رکھنے لگی تھی۔

پلیٹیں ہاتھ میں تھیں جب سلیب پر رکھا فون تھرتھرایا۔ ایک ساتھ اتنے میسج..... ضرور احمد ہوگا وہی اکٹھے اتنے میسج کیا کرتا تھا۔

رافعہ نے پلیٹیں رکھیں اور موبائل ہاتھ میں لیا، احمد ہی تھا۔

"ہیلو آپی کیسی ہو؟ گھر پہنچ گئی ہو۔ کھانا لگا رہی ہو گی؟" احمد، رافعہ کے معمولات زندگی خوب جانتا تھا۔ رافعہ نے مسکرا کر سر جھٹکا۔

احمد کو وہ کچھ ہی دنوں سے جانتی تھی، وہ ایک مشہور اسکول میں پڑھاتی تھی، جس کی کئی شاخیں

pklibrary.com

''اچھا واقعی؟'' احمد نے سوال کیا ''مجھے کیا پتا، میں نے کون سا آپ کو دیکھا ہوا ہے کہ آپ کیسی دکھتی ہیں۔'' احمد کا انداز اکسانے والا تھا۔

وہ ہمیشہ رافعہ سے تصویر کا کہا کرتا۔

''آپی! اپنی تصویر تو دکھائیں۔''

رافعہ ہمیشہ ہنس کر ٹال دیتی کہ اسکول میٹنگ میں تو دیکھ ہی لو گے، تصویر کی کیا ضرورت ہے۔

پر آج رافعہ کو جیسے چیلنج کیا تھا احمد نے۔ ''اتنی عمر نہیں ہے میری، جتنی تم نے سمجھ لی ہے۔''

رافعہ نے کہنے کے ساتھ ہی اپنی ایک تصویر اپلوڈ کی تھی۔

اور احمد..... احمد نے دیکھتے ہی تصویر پر دل بنا ڈالا۔

''آپی! سچ آپ تو میرے تصور سے زیادہ جوان اور خوب صورت ہیں۔ کاش آپ مجھے پہلے ملی ہوتیں۔''

احمد نے ستائشی کلمات بھیجے۔ انداز تعریف ایسا تھا کہ رافعہ خود پر نازاں ہوئی اور بلا جھجک اچھی سی دو تصاویر مزید بھیج دیں۔ یہ سوچے بغیر کہ احمد ان کا غلط استعمال بھی کر سکتا تھا کہ آج کے ڈیجیٹل دور میں محض ایک کلک پر، بات کہیں سے کہیں پہنچ کر پورے خاندان کے لیے زندگی بھر کا وبال بھی بن سکتی تھی۔

''ارے جان لیں گی کیا؟'' احمد پٹڑی سے اترا تھا پر رافعہ کو احساس تک نہ ہوا۔

''بھئی مان گیا آپ بہت خوب صورت اور جوان ہیں۔'' احمد نے تیسری، چوتھی بار اعتراف کیا۔

''نہیں، اب ایسا بھی نہیں ہے۔ نہ میں اتنی خوب صورت ہوں نہ جوان بس یہ تو فلٹرز کا کمال ہے۔'' رافعہ نے سادگی سے سچائی بیان کی۔

''اچھا اب یہ جاننے کے لیے تو آپ سے ملنا ہی پڑے گا۔'' احمد نے مزید بات بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ہاں آجاؤ کسی دن ہماری برانچ۔'' رافعہ نے سادگی سے کہا۔

''چلیں دیکھتا ہوں کسی دن۔'' احمد نے جواب بھیجا۔

''اچھا فی الحال ایک فریش سیلفی تو بھیجیں اچھی سی..... تو پتا لگے بغیر فلٹر آپ کیسی دکھتی ہیں؟'' احمد نے ساتھ آنکھ دبانے والا ایموجی بھیجا۔

اب رافعہ کو تھوڑی الجھن سی محسوس ہوئی، اس نے فوراً ٹوک دیا۔

''اب تم زیادہ فری ہو گئے ہو۔ اپنا کام کرو اور مجھے بھی کرنے دو۔'' کہہ کر رافعہ نے فون سائلنٹ پر منتقل کر کے سائیڈ پر رکھا اور اپنی توجہ کاپیوں کی جانب مبذول کی۔

غلطی اور لاپروائی میں باریک سا فرق ہوتا ہے۔ غلطی نادانستگی میں ہوتی ہے اور لاپروائی آنکھوں کے سامنے سرزد ہوتی ہے۔ بعض دفعہ ہر بات روز روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے پھر بھی ہم بغیر سوچے سمجھے کوئی ایسا قدم اٹھا لیتے ہیں جو ہمارے لیے شرمندگی کا باعث بنتا ہے۔ اور پھر ہماری لاپروائی غلطی سے بھی زیادہ سنگین ثابت ہوتی ہے۔ یہی رافعہ کے ساتھ بھی ہوا۔ احمد اس سے عمر میں بہت چھوٹا تھا۔ تدریس کے شعبے سے وابستہ تھا اور سب سے بڑھ کر اس کا دل صاف تھا۔

ان سب باتوں کی وجہ سے اس نے از خود اخذ کر لیا تھا کہ وہ بھی اس کے لیے وہی سوچے گا جو وہ سوچتی ہے۔ تمام مذکورہ باتیں ہونے کے باوجود کہیں کسی کتاب میں درج نہ تھا کہ سامنے والا آپ کا استحصال نہیں کرے گا۔ وہ تو یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ احمد کے دل میں اس کے لیے کیا تھا!

وہ اس وقت چونکی جب احمد کی بے تکلفی بڑھنے لگی اور حد تو تب ہوئی جب احمد نے اس سے کئی بار سیلفی کی فرمائش کی۔ رافعہ نے سہولت سے انکار کیا تو احمد کا میسج رافعہ کے ہوش اڑا دینے کے لیے کافی تھا۔

''مجھے نہیں پتا، اسی وقت مجھے سیلفی بھیجو، مجھے تمہیں دیکھنا ہے۔''

رافعہ کے تو کانوں سے دھواں نکلنے لگا۔ پتا نہیں رافعہ کی کس بات نے احمد کو اس قدر مشتعل کر دیا تھا جو وہ یوں اس سے فرمائش کر رہا تھا۔ یا احمد ان مردوں میں سے تھا جو بے تکلف ہوتے ہی ہر حد سے تجاوز کرنا چاہتے ہیں۔

"یہ تم کس انداز سے مجھے حکم دے رہے ہو اور میرا نام یوں لے رہے ہو جیسے میں تمہارے ساتھ کی ہوں، خبردار جواب آپی کہے بغیر تم نے مجھے مخاطب کیا۔"

رافعہ نے بری طرح کپکپاتے ہاتھوں سے میسج ٹائپ کیا۔

اپنی طرف سے تو اس نے احمد کو دھمکا دیا تھا۔ پھر بھی احمد کی ڈھٹائی وہ اسے صبح شام گڈ مارننگ اور گڈ نائٹ کے میسج کرنا نہ بھولتا تھا۔ رافعہ نے سوچا تھا کچھ دنوں میں آہستہ آہستہ اس سے ترک تعلق کر کے نمبر بھی بلاک کر دے گی۔ اس کی نوبت آتی اس سے پہلے چاروں شاخوں کی میٹنگ ہیڈ کوارٹر میں منعقد ہوئی۔ وہیں احمد اور رافعہ کا سامنا ہوا۔

احمد رافعہ کو پہچانتا تھا، وہ اسے دیکھ کر خود آگے بڑھا سلام کے بعد اپنا تعارف کروایا۔

رافعہ سنجیدگی سے سلام کا جواب دینے کے بعد یکسر انجان بنی رہی۔ وہ میٹنگ سے پہلے اپنی پلانر پر کچھ کام کرنے میں مصروف تھی کہ اس کی سماعتوں نے وہ زہریلی باتیں سنیں۔

"تم تو کہہ رہے تھے مس رافعہ تم سے کافی بے تکلف ہیں۔ وہ تو تمہیں گھاس تک ڈالنے کی روادار نہیں۔ ملیں بھی سرسری جیسے تمہیں جانتی ہی نہیں؟"

احمد کے ایک ساتھی کیچر فراز نے اس سے دریافت کیا تھا۔ یعنی احمد نے فراز کو سب کچھ بتا رکھا تھا۔ میٹنگ ہال میں خاموشی ہونے کی وجہ سے رافعہ کچھ نشستوں کی دوری پر با سانی ان کی آواز سن سکتی تھی۔

"تو اس بدمعاش نے سب کو بتایا ہوا ہے۔" رافعہ کی حالت ایسی تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔

"ہاں ایسی ہی ہوتی ہیں اس قسم کی عورتیں ..... خود فلرٹ اور وقت گزاری کرنا پسند کرتی ہیں اور سب کے سامنے انجان بن کر نیک پروین بننے کی اداکاری کرنے لگتی ہیں۔" احمد نے مضحکہ اڑایا۔

رافعہ نے لرزتے ہاتھ کو بمشکل قابو کیا۔ وہ تو شادی شدہ دو بچوں کی ماں تھی۔ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایسے بھی ایسے مسائل کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ وہ تو سمجھتی تھی کہ شادی شدہ ہے تو معتبر ٹھہر گئی سب کی نظر میں۔ اب کوئی اس پر بری نظر نہیں ڈال سکتا۔ پھر اپنی طرف سے بھائی کہہ کر اس نے احمد پر ایک حد لگا دی تھی۔ لیکن سچ ہی ہے۔ آپی کہنے سے کیا ہوتا ہے؟ کہاں لکھا ہے آپی کہنے والا سگا بھائی بن گیا یا اس کی نیت سگے بھائیوں والی ہو گئی۔ کچھ بھی تھا احمد سے یوں بے تکلف ہونے کی غلطی رافعہ کی ہی تھی۔ سامنے والا چھوٹا ہو یا بڑا، اچھا ہو یا برا۔ بہن کہے یا نہیں، ہمیں دوسروں پر اندھا بھروسا کرنے کے بجائے اپنی حدود کی پاسداری خود کرنی چاہیے۔

رافعہ خود پر قابو پا کر پورے اعتماد سے اٹھی اور احمد کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔ احمد اسے یوں سامنے دیکھ کر ناسمجھی سے اسے دیکھنے لگا۔ رافعہ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ایک زوردار طمانچہ اسے رسید کیا۔

"امید ہے آئندہ تم کم از کم اس عورت پر بری نظر نہیں ڈالو گے جسے بہن کہتے ہو، جو تم پر بھروسا کرتی ہو۔ شکریہ مجھے سبق دینے کا، میں ہمیشہ یاد رکھوں گی۔"

رافعہ کہہ کر مضبوط قدم اٹھاتی دوبارہ اپنی سیٹ پر آ چکی تھی۔ ابھی میٹنگ میں کافی وقت تھا، ہال میں چند ٹیچرز ہی موجود تھے۔ احمد ہکا بکا شرمسار سا کھڑا تھا۔ کیونکہ رافعہ کی باتیں سب نے سنی تھیں۔

"توبہ آج کل کے لڑکے ....." ایک سرگوشی سنائی دی تھی۔ دیکھنے والے جو بھی سمجھے تھے رافعہ کو اب اس کی قطعی پروا نہ تھی۔

☆☆

ماہنامہ کرن

مارچ 2024ء سالگرہ نمبر کے شمارے کی ایک جھلک

- "خواتین کے عالمی دن اور ماہنامہ کرن سالگرہ کے حوالے سے شاہین رشید کا سروے،
- اداکار، "حمزہ خان" کہتے ہیں میری بھی سنیے،
- "تاش گھر" ایمل رضا کا سلسلہ وار ناول،
- "دامنِ سحاب" مہوش افتخار کے ناول کی آخری قسط،
- "مجھے تاوان کیا دو گے؟" نگہت سیما کا مکمل ناول،
- "ایک شام وہ اجنبی" آسیہ رئیس کا مکمل ناول،
- "سپاس گزار" میمونہ صدف کا ناولٹ،
- "زمینی خدا" ام اقصیٰ کا ناولٹ،
- نفیسہ سعید، نظیر فاطمہ، مریم شہزاد، نازنین فردوس کے افسانے اور مستقل سلسلے،

"کرن کتاب"

"رمضان اسپیشل"

مارچ 2024ء کا شمارہ شائع ہوگیا

pklibrary.com

نگہت سیما

ماہ الملوک

مکمل ناول

لاہور کے ذکی دروازے کی سمت بہت شان دار حویلیاں تھیں ان میں سے ایک مرزا جہاں زیب کے دادا مرزا ہمایوں بیگ نے بنوائی تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس میں جدید تقاضوں کے مطابق تبدیلیاں کی گئی تھیں۔

مرزا جہاں زیب اپنے والد کی اکلوتی اولاد تھے اللہ نے انہیں چار بیٹوں اور ایک بیٹی سے نوازا تھا۔

بیٹوں، بیٹی کی شادی ہو چکی تھی۔ اوپر والی منزل میں اورنگ زیب بیگ اور ارباب بیگ رہائش پذیر تھے جب کہ خود جہاں زیب بیگ گراؤنڈ فلور پر دونوں چھوٹے بیٹوں شازیب اور ظفریاب کے ساتھ رہتے تھے۔

اورنگ زیب کی دو بیٹیاں دو بیٹے تھے۔ ارباب بیگ کا ایک بیٹا اور دو بیٹیاں تھیں۔

ظفریاب کا ایک بیٹا آزین تھا اور شاہ زیب بیگ کی ایک بیٹی زمل تھی آزین اور زمل کا نکاح ہو چکا تھا۔

شاہ زیب بیوی کے مرنے کے بعد گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ ظفریاب کی کچھ سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے وہ گرفتار ہو گئے تھے، وہ بہت برا وقت تھا، نہ جانے کیا ہوا کہ ان کی بیوی نے ان کے واپس آنے کے بعد طلاق لے لی۔ ظفریاب دوسری شادی کر کے ملک سے باہر چلے گئے۔

چھٹی قسط

pklibrary.com

اس نے جگہ (کنویں کے پاس گھڑے رکھنے کے لیے جو جگہ ہوتی ہے) پر رکھے گھڑے کو ٹھیک کر کے رکھا اور ہاتھ میں پکڑے ڈول میں سے اس میں پانی ڈالنے لگی تھی کہ اسے اپنے پیچھے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ پگڈنڈی پر دھول اڑ رہی تھی۔ گھوڑے کے سموں سے اڑنے والی مٹی کے بادلوں سے وہ نمودار ہوا۔ سفید گھوڑے پر سوار کوئی ادھر ہی آ رہا تھا، وہ پیشانی پر ہاتھ رکھ کر دیکھنے لگی۔ پانی سے بھرا ڈول اس نے نیچے رکھ دیا تھا۔ کنویں سے کچھ دور سوار نے گھوڑے کی باگیں

Qlibrary.com

کھینچیں اور رکاب میں پاؤں رکھ کر نیچے کودا۔ وہ ساکت کھڑی اسے دیکھ رہی تھی اور وہ اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پھر وہ اس کے سامنے آ کر رک گیا وہ مبہوت سی اسے دیکھ رہی تھی۔

"پانی"

اجنبی کے لبوں سے صرف ایک لفظ نکلا تھا۔ اس نے چونک کر پاؤں کے قریب پڑے ڈول کو دیکھا اور پھر اس کی طرف نظریں ملنے پر وہ مسکرایا اور ہاتھوں کی اوک بنائی۔ بنا کچھ کہے اس نے ڈول اٹھایا اور اس کی اوک میں پانی ڈالنے لگی۔

وہ سر جھکائے پانی پی رہا تھا اور کچھ پانی اس کی انگلیوں سے نیچے گر رہا تھا۔

"بس" پانی پی کر اس نے سر اٹھایا۔

"مہربانی۔ شکریہ۔"

پھر چند قدم پیچھے ہٹ کر گھوڑے کی زین سے بندھی زنبیل سے مٹی کی چھاگل نکالی۔ اب وہ اس کے منہ پر لگا ڈھکن ہٹا کر اسے دیکھنے لگا تو اس نے بغیر کچھ کہے ڈول میں موجود پانی سے اس کی چھاگل بھر دی۔

"میں نے تمہارا پانی لے لیا، اب تمہیں پھر بھرنا پڑے گا۔" اس کے لبوں پر بڑی دلفریب مسکراہٹ تھی۔

"کوئی بات نہیں۔"

وہ بھی مسکرائی تھی، اس نے ڈول میں بچا پانی گڑھے میں ڈالا اور ڈول کو پھر کنوئیں میں ڈالنے کے لیے کنوئیں پر لگی چرخی کو گھمانے لگی۔ رسی آہستہ آہستہ کھلتی جا رہی تھی اور ڈول نیچے جا رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر اسے پیچھے ہٹا دیا۔ وہ پیچھے ہٹ گئی اور خاموشی سے اسے دیکھنے لگی۔

ڈول واپس کھینچ کر اس نے جگہ کے پاس رکھا اور اشتیاق سے اسے دیکھنے لگا۔

"کون ہو تم؟ آسمان سے اتری ہوئی کوئی حور یا پرستان سے آئی ہوئی کوئی مہربان پری۔"

"میں زیب النساء" اس نے اپنی طرف اشارہ کیا اور گھنی پلکیں گلابی رخساروں پر جھک گئیں۔

"اور میں۔" اس نے اپنی طرف اشارہ کیا۔

"شہزادہ سلیم بہت دور سے تمہیں ہی کھوجتا ہوا آیا ہوں۔"

"مجھے" وہ حیران ہوئی۔

"ہاں تمہیں میری شہزادی۔ میرے ساتھ چلوگی۔"

"کہاں" اس نے پوچھا۔

"جہاں بھی لے چلوں۔" وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکا تو اس کی پگڑی میں لگے قیمتی نگینے کی چمک ڈول میں پڑے پانی پر پڑی۔

"اور اگر میں نہ جاؤں تو۔" آنکھوں میں شرارت تھی اور لبوں کے گوشے میں مدھم سی مسکراہٹ۔

"تو" اجنبی نے کنوئیں میں جھانکا۔

"میری تلاش تو ختم ہو گئی ہے میری شہزادی! میں زندگی کا سفر بھی یہاں ہی تمام کر دوں گا۔" وہ کنوئیں کی طرف بڑھا تو بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا۔

"نہیں۔" اس نے مڑ کر اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تو اس نے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا، اس نے مضبوطی سے اس کا ہاتھ تھام لیا اور گھوڑے کی طرف بڑھا۔ اور اسے گھوڑے پر بیٹھنے میں مدد کی۔

ماسٹر عبدالعزیز کہتے تھے میری بیٹی کے لیے تو کوئی شہزادہ ہی آئے گا۔

"تو کیا یہ وہ ہی شہزادہ ہے۔" اس نے جگہ پر پڑے گھڑے کو اور اس کے پاس پڑے پانی کے ڈول کو دیکھا۔ اور شہزادے نے گھوڑے کو ایڑ لگا دی اور تیز دوڑتے گھوڑے نے یک دم ٹھوکر کھائی اور اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

"کیا۔ کیا ہوا زیب! کوئی برا خواب دیکھا ہے۔" استانی جی اپنی چارپائی پر اس کی طرف ہی رخ کیے سوئی ہوئی تھیں۔ اس کی چیخ سے ان کی آنکھ کھل گئی تھی۔

"شاید خواب میں ڈر گئی ہو۔ آیت الکرسی پڑھ کر خود پر پھونک لو۔ اور میں نے تمہیں کہا تھا نا کہ چاروں قل پڑھ کر سویا کرو۔"

"جی پڑھے تھے۔" اس نے تکیے کے پاس مغل

عہد کی تاریخ کو دیکھا جسے پڑھتے پڑھتے سوگئی تھی، وہ اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اتنے زور سے کہ وہ اس کی دھک دھک سنتی تھی۔ خواب برا تو نہیں تھا بلکہ اس کی آنکھوں کے سامنے اس شہزادے کی صورت آ گئی تھی۔ جس کی ریشمی پگڑی میں بڑا سا سرخ یاقوت تھا اور اس کے اردگرد سبز نگینے تھے، سب سے روشنی پھوٹتی تھی، وہ شہزادہ اسے کھوجتا ہوا مائی رکھی کے کنویں تک پہنچا تھا۔

"شہزادہ"

اس نے تصور میں اس کے ایک ایک نقش کو سوچا۔ بلا کی خوب صورت آنکھیں، کشادہ پیشانی اور پیشانی پر بکھرے سلکی بال، گداز بھرے بھرے ہونٹوں پر باریک مونچھیں۔

اور وہ چونکی۔ وہ تو۔ وہ شہزادہ تو اس نے گھبرا کر استانی جی کی طرف دیکھا انہوں نے دیوار کی طرف کروٹ لے لی تھی۔ اس نے دیوار سے ٹیک لگالی ماتھے اور چہرے پر آئے پسینے کو پونچھا۔ کھلی کھڑکی سے چاند کی روشنی اندر کمرے میں آ رہی تھی۔

"میں بہت دور سے تمہیں کھوجتا ہوا آیا ہوں میری شہزادی۔" اس کے کانوں میں جیسے کسی نے سرگوشی کی اس کے رخسار کسی انجانی حدت سے تپ اٹھے۔ اس نے اپنے ہاتھ اپنے رخساروں پر رکھ لیے اور سرگوشی کی طرح اس کے لبوں سے نکلا۔

"میری شہزادی" اور پھر یک دم گھبرا کر استانی جی کی طرف دیکھا وہ سو چکی تھیں۔ ان کے ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز آ رہی تھی۔ کیسا عجیب خواب تھا اور اس سے پہلے تو اس نے ایسا خواب کبھی نہیں دیکھا تھا۔ سفید گھوڑے پر سوار، دور دیس سے آنے والا شہزادہ جو اسے کھوجتا ہوا مائی رکھی کے کنویں تک آیا تھا اور وہ بالکل استانی جی کے بیمار مہمان جیسا تھا۔ بالکل ویسا ہی۔ بس اس کا لباس شاہانہ تھا اور گلے میں قیمتی موتیوں کی مالا تھی۔ ہاں یہ خواب والا شہزادہ تو وہی تھا، وہی استانی جی کا مہمان اور صبح کا منظر آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ کٹورے کی طرف بڑھتا ہاتھ اور اس کے لرزتے ہاتھوں میں پکڑے کٹورے سے چھلکتا پانی اور وارفتگی سے اس کی طرف دیکھتا وہ اجنبی۔ اس کے نوخیز دل میں ہلچل مچاتی اس کی نظریں۔ بس چند لمحوں کی بات تھی لیکن دل کی دنیا میں انوکھے، اور اچھوتے سے جذبے جاگ اٹھے تھے۔ اس نے بمشکل اس کے چہرے سے نظریں ہٹائی تھیں۔

"پانی" پیالہ اس کی طرف بڑھائے اب وہ اپنے پاؤں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ لیکن اجنبی کی نظریں اب بھی اس کے چہرے پر ٹکی تھیں اور ان نظروں کی حدت سے اس کے رخساروں پر سرخی پھوٹ رہی تھی۔

"آپ کون؟" اجنبی نے پیالہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔

"زیب النساء ماسٹر عبدالعزیز کی بیٹی۔" بے اختیار ہی لبوں سے نکلا تھا۔

"زیب النساء" اس نے بند لبوں سے دہرایا تھا اور پیالہ ہونٹوں سے لگالیا تھا، خالی پیالہ اس کو دیتے ہوئے وہ لڑکھڑایا تو بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا تھا "بسم اللہ سنبھل کر۔" اس نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

"شکریہ۔"

اور زیب النساء نے بمشکل اس کی سحر طاری کرتی آنکھوں سے اپنی نظریں ہٹائیں اور تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھی۔ لیکن وہ اس وقت تک چوکھٹ پر ہاتھ رکھے اسے دیکھتا رہا جب تک وہ نظر آتی رہی اسے اپنی پشت پر اس کی نظریں محسوس ہوتی رہیں لیکن اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا تھا اور کمرے میں جا کر اندر سے کنڈی لگالی تھی، جب تک استانی جی حکیم جی کو لے کر آئیں وہ باہر نہیں آئی تھیں۔

"استانی جی! آپ نے اتنی دیر کردی۔" استانی جی کے دستک دینے پر اس نے دروازہ کھولا تھا۔

"نہیں زیادہ دیر تو نہیں ہوئی بس وہ حکیم صاحب دو مریض دیکھ رہے تھے کہنے لگے۔ میں ساتھ ہی چلتا ہوں مریض کو دیکھ کر ہی دوا دوں گا۔ مریضوں کو فارغ کر کے آ گئے تھے۔"

''تو پھر کیا کہا۔ دوا دی۔'' اس نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

''ہاں کہہ رہے تھے ساری علامات ملیریا والی ہیں۔ دوا بھی دے دی ہے۔'' استانی جی نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے فوراً نظریں جھکالیں کہ کہیں استانی جی ،اس کی آنکھوں سے اس کے دل کا حال نہ جان لیں۔

''تم آجاؤ ادھر باورچی خانے میں ہی۔ میں دودھ گرم کرکے اسے دے آؤں۔ حکیم صاحب نے کہا ہے دودھ کے ساتھ ہی دوا دینی ہے۔ بخار کچھ کم ہوگیا تو پھر کھانے کے لیے کچھ دینا ہے۔ میں آتے ہوئے آپا صغراں سے کہہ آئی تھی، وہ گندم کا دلیہ دے جائے گی تو وہ بنالوں گی۔ اور تم دوپہر کے لیے روٹیاں پکالینا۔ آٹا تو صبح ہی میں نے گوندھ کر رکھ دیا تھا۔ دال بھی گلا کر رکھ دی تھی بس تڑکہ لگانا ہے۔''

استانی جی واپس باورچی خانے کی طرف جانے لگیں تو وہ بھی، کمرے سے نکل کر ان کے پیچھے ہی باورچی خانے میں آگئی۔

استانی جی کا باورچی خانہ ان کے باورچی خانے کے مقابلے میں بڑا اور کشادہ تھا۔ ایک طرف مٹی کے تیل والا چولہا پڑا تھا۔ ساتھ ہی لکڑیوں والا چولہا بھی سیمنٹ سے بنا ہوا تھا۔ اوپر چمنی تھی۔ دیواروں میں دو بڑی الماریاں تھیں جن میں برتن پڑے تھے۔ ایک طرف حمام تھا۔ حمام کا استعمال شدہ پانی باہر گلی میں جانے کے لیے کھرا تھا اور نالی بنی تھی۔ بائیں طرف والی دیوار کے ساتھ ان کے باورچی خانے کی طرح گدا بچھا تھا۔ چولہے کے پاس ہی دو پیڑھیاں پڑی تھیں۔ ایک چھوٹا سا نعمت خانہ بھی تھا۔ استانی جی نے نعمت خانے سے دودھ کی دیگچی نکالی اور تھوڑا سا دودھ ایک دوسری دیگچی میں ڈالا اور تیل والا چولہا جلا کر گرم کرنے کے لیے رکھ دیا وہ موڑھے پر بیٹھ کر استانی جی کی طرف دیکھنے لگی۔

''روٹی کب پکانی ہے۔''

''کچھ دیر تک پکالینا۔ ابھی تو بھوک نہیں ہے۔ ہاں اگر تمہیں لگ رہی ہو تو۔''

''نہیں۔ میں تو ویسے بھی ابا اسکول سے آجائیں تب کھاتی ہوں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''اچھا یہ اوپر ٹوکری میں تھوم (لہسن) پڑا ہے تڑکے کے لیے چھیل کر کاٹ دو۔ ہری مرچیں بھی ادھر ہی رکھی ہوں گی۔'' استانی جی نے دودھ گرم کرنے کے بعد کپ میں ڈالا اور لے کر چلی گئیں۔

اسے باورچی خانے میں بیٹھے بیٹھے، پتا نہیں کتنی دیر ہوگئی تھی اسے اندازہ ہی نہیں ہوا۔ اس نے دال گرم کرکے تڑکا لگالیا۔ دو چار برتن جو پڑے تھے دھولیے۔ ٹوکری میں پڑے برتن سمیٹ لیے۔ باورچی خانے میں بیٹھے بیٹھے اس نے کتنی ہی بار دروازے سے باہر جھانک کر دیکھا، یوں ہی بے خیالی میں شاید دل کے اندر کہیں خواہش چھپی تھی کہ وہ نظر آجائے کیا خبر وہ باہر آئے۔ لیکن وہ باہر نہیں آیا تھا۔ ہاں استانی جی آگئی تھیں۔

''ارے تم ابھی تک یہاں ہی بیٹھی ہو۔ کمرے میں چلی جاتیں۔ کوئی کتاب شتاب اٹھا کر پڑھ لیتیں ایسے ویلے (فارغ) بیٹھے بیٹھے تو بندہ تھک ہی جاتا ہے۔ بخار بہت تیز تھا بے چارے کو میں ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھتی رہی اب جا کر بخار ذرا کم ہوا تو دوا دے کر آئی ہوں۔ تم روٹیاں ڈال لو تو کھانا کھا کر ذرا آپا صغراں سے پتا کروں۔ دلیہ نہیں بھیجا ابھی تک اس نے۔''

اور پھر روٹیاں پکا کر اس نے وہیں استانی جی کے ساتھ، باورچی خانے میں ہی کھانا کھایا تھا اور چھوٹے چھوٹے لقمے لیتے ہوئے کئی بار اس کا جی چاہا وہ استانی جی سے پوچھے کہ حکیم جی نے کیا کہا ہے کہ بخار کب تک اترے گا۔ لیکن پھر جھجک گئی کہ استانی جی پتا نہیں کیا سوچیں۔ لیکن استانی جی کھانا کھاتے ہوئے خود ہی بتانے لگیں۔

''حکیم جی کہہ رہے تھے ملیریا ہے دو تین دن تو خوب زور دے کر چڑھے گا۔''

''اور اقبال بھائی کب آئیں گے شکار سے واپس۔'' وہ بے اختیار پوچھ بیٹھی۔

''پتا نہیں۔ کبھی تو دو تین دن بعد آجاتا ہے اور کبھی زیادہ دن بھی لگا دیتے ہیں۔ شکار کھیلنے والوں کی مرضی

ہوتی ہے کہ کتنے دن کیمپ میں رہیں گے۔ کیا خبر اس کے آنے سے پہلے ہی اس کا بخار اتر جائے تو چلا جائے واپس لیکن ابھی تو اس کی حالت نہیں ہے سفر کرنے کی۔ دو دن کے بخار میں بچہ کر رہ گیا ہے بچہ۔" استانی جی نے صافی سے ہاتھ پونچھے اور کھڑی ہو گئیں۔

"بچہ۔" اس نے سر جھکا کر اپنی مسکراہٹ چھپائی اور استانی جی کی طرف معصومیت سے دیکھا۔

"کیا اقبال بھائی بچوں کو بھی شکار پر لے کر جاتے ہیں۔"

"ارے نہیں بیٹی۔" استانی جی کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"ہماری عمر کے لوگوں کے لیے تو سب جوان جہان لڑکے لڑکیاں بچے ہی ہوتے ہیں۔ یہ بھی گھبرو جوان ہے اللہ اسے صحت و زندگی دے اور اس کے ماں باپ کی آنکھیں ٹھنڈی رکھے۔"

وارفتگی سے اسے دیکھتا۔ نظروں ہی نظروں میں اسے پیغام دیتا! وہ حسین چہرہ اس کے تصور میں لہرایا تو اس نے چور نظروں سے استانی جی کی طرف دیکھا لیکن وہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہی تھیں۔ بلکہ دال والی دیگچی اٹھا کر نعمت خانے میں رکھ رہی تھیں۔

"استانی جی، آپ رہنے دیں۔ میں کرلوں گی سب آپ جا کر دلیہ لے آئیں۔" اور استانی جی کے جانے کے بعد اس نے پلیٹیں دھوئیں۔ باورچی خانہ تو صاف ہی تھا۔ ایک دو چیزیں جو ادھر ادھر پڑی تھیں سنبھال کر دروازے سے جھانک کر دیکھا کہ شاید اسے پیاس لگی ہو اور پانی کے لیے دروازے پر کھڑا ہو۔ لیکن فاطمہ آپا کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ اور کتنا اچھا ہو کہ اسے پیاس لگ جائے اور وہ پانی مانگنے کے لیے دروازے تک آئے۔ دل کے اندر کہیں اس خواہش نے چٹکی لی اور اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا۔ کتنا اچھا ہے کہ کسی کو کسی دوسرے کے دل کا حال پتا نہیں چلتا تب ہی صحن کا دروازہ کھلا۔ استانی جی دلیہ لے کر آ گئی تھیں ساتھ ہی آپا صغراں کا گھر تھا۔ استانی جی نے آ کر دلیے والا پیالہ اسے پکڑایا۔

"الماری میں دیکھو کوئی خالی ڈبا ہے تو اس میں ڈال کر رکھ دو اس وقت آدھی پیالی ہی بناؤں گی۔ یوں تو کنک (گندم) گھر میں بھی تھی۔ تھوڑی سی بھون کر پیس کر بنا لیتی لیکن مجھے پتا تھا کہ آپا صغراں کے پاس بنا ہوا پڑا ہے۔"

"جی۔" اس نے پیالہ پکڑ لیا۔

"میں ذرا اسے دیکھ لوں پتا نہیں کس حال میں ہے پھر نماز پڑھ کر بنا لوں گی۔"

"میں بنا لوں گی استانی جی!" اس اجنبی کے لیے اپنے ہاتھوں سے کچھ پکانا اسے اچھا لگ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ لیکن پہلے نماز پڑھ لو تم بھی۔"

"جی استانی جی میں غسل خانے میں چلی جاؤں وضو کرنے۔" اس نے ان کی طرف دیکھا۔ ٹوائلٹ اور غسل خانہ صحن میں تھا اور استانی جی نے اسے صحن میں جانے سے منع کیا تھا۔ استانی جی ہنس پڑیں۔

"لو اور کہاں جاؤ گی۔ میں نے احتیاطاً منع کیا تھا کہ نامحرم ہے۔ باہر نہ نکلنا۔ اب ضرورت کے وقت تو جانا ہی ہوگا نا۔ اچھا شریف اور خاندانی لڑکا لگتا ہے۔ خاندانی نجابت جیسے پیشانی پر لکھی ہے۔ ارے اس بچے کی پریشانی میں خیال ہی نہیں رہا۔ تمہارے ابا ابھی تک آئے نہیں۔ خیر ہو۔ رات تو خیر دیر ہوگئی ہوگی لیکن اس وقت تک تو آ جانا چاہیے تھا۔"

"کیا خبر آتے ہی سیدھے اسکول چلے گئے ہوں۔ سویرے والی وین نہ ملی ہو۔ اور دیر ہو گئی ہو۔" اس نے خیال ظاہر کیا لیکن دل میں تھوڑی سی پریشان ہو گئی تھی۔ دل کو یقین تھا کہ ابا کتنی بھی دیر ہو جاتی پہلے اس کی طرف ہی آتے۔

"چلو اللہ خیر کرے گا۔ نماز پڑھ کر دعا کرنا۔ میں پڑوس سے کسی بچے کو تمہارے ابا کے اسکول بھیجتی ہوں۔" استانی جی اسے تسلی دے کر فاطمہ آپا کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں اور وہ صحن کی طرف۔ اور ابھی وہ نماز پڑھ کر دعا مانگ رہی تھی کہ ماسٹر عبدالعزیز آ گئے۔ وہ دعا مانگ کر باہر آئی تو وہ برآمدے میں

بیٹھے استانی جی سے کچھ کہہ رہے تھے۔
"ابا" وہ تیزی سے ان کی طرف بڑھی۔
"دیر کیوں لگادی۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔"
"ٹھیک ہوں۔" انہوں نے اسے لپٹا کر اس کے سر پر پیار کیا۔
"ای۔او صاحب نے میٹنگ کے لیے بلایا تھا۔ وہاں سے سیدھا ادھر ہی چلا گیا تھا۔ رات آنہ سکا صبح بھی پہلی وین نکل گئی تھی۔
اب سیدھا تمہاری طرف ہی آیا ہوں۔"
"تو پھر چلیں ابا۔"
اس نے فاطمہ آپا کے کمرے کی طرف دیکھا۔ صبح سے دل میں ایک ہی خواہش مچل رہی تھی کہ گھر جانے سے پہلے ایک بار پھر اسے دیکھ لے وہ سحر طاری کرتی اس کی بے حد خوب صورت آنکھیں۔ وارفتگی اور حیرانی لیے اسے تکتی۔ وہ ابھی تک ان آنکھوں کے سحر سے باہر ہی نہیں نکل پا رہی تھی۔
اس نے اپنا دوپٹا درست کیا اور ایک گہری افسردگی نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ماسٹر عبدالعزیز ابھی تک کھڑے تھے نگاہیں جھکائے۔ استانی جی بھی کسی گہری سوچ میں تھیں۔
"ابا، کیا ہوا ہے آپ کچھ پریشان ہیں۔"
"ہاں نہیں تو۔" ماسٹر عبدالعزیز نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
"بیٹھ جائیں ماسٹر جی، اور تم زیب جا کر چائے بنالو ماسٹر جی سفر کر کے آئے ہیں۔ بلکہ پتا نہیں کھانا بھی کھایا ہے یا نہیں۔ کھانا کھائیں گے آپ ماسٹر صاحب۔" استانی جی بھی جیسے گہری سوچ سے باہر آئی تھیں۔
"نہیں استانی جی! کچھ کھاؤں پیوں گا نہیں۔ پریشانی میں بھوک پیاس اڑ جاتی ہے میری۔"
"پریشانی کیسی ماسٹر جی۔ یہ بھی تو زیب کا اپنا ہی گھر ہے اس کے آجانے سے میرا وقت بھی اچھا گزر جاتا ہے۔ دس کام بھی کر دیتی ہے میرے۔"
"بہت شکریہ آپا جی! آپ کے سوا کسی پر اعتبار نہیں ہے مجھے۔" وہ بیٹھ گئے تھے۔
"میرا دل تو بیٹھا جاتا تھا کہ اکیلے گھر میں کیسے اتنے دنوں کے لیے چھوڑ کر جاؤں۔ پہلے کی بات اور تھی لیکن ماسی نور بھری اور اسلم کی دھمکی کے بعد اب خوف آتا ہے، اگرچہ چوہدری صاحب نے اچھی طرح سمجھا دیا تھا اسلم کو لیکن ابا مرحوم کہتے تھے کہ اپنی احتیاط اچھی ہوتی ہے۔ کوئی نقصان ہو جائے تو بعد میں واویلا کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔"
"صحیح کہتے تھے آپ کے ابا جی۔ آپ بے فکر ہو کر جائیں۔"
"کیا۔ کہاں جا رہے ہیں آپ۔ اور کیوں۔"
زیب النساء ہونق سی کھڑی باری باری دونوں کو دیکھ رہی تھی۔
"وہ دراصل ریفریشر کورس ہو رہے ہیں۔ اس کے لیے مجھے لاہور جانا ہے دس دن کے لیے تو میں نے استانی جی سے درخواست کی ہے کہ وہ تمہیں میری واپسی تک اپنے پاس رکھ لیں۔"
ماسٹر عبدالعزیز نے بتایا تو زیب النساء کے دل میں پھلجھڑی سی پھوٹی۔ اس کے دل نے تو بس اتنی ہی چاہ کی تھی کہ کاش ابا ایک روز اور اسے استانی جی کے پاس چھوڑ دیں اور وہ بس ایک بار اور اسے۔ اس ستمگر ادوں کی سی آن بان والے شخص کو دیکھے اور۔ دل کی چاہ پوری ہو گئی تھی، ابا اسے ایک دن کے لیے نہیں نو دس دنوں کے لیے استانی جی کے پاس چھوڑ کر جا رہے تھے لیکن اتنے سارے دن وہ ابا کے بغیر کیسے رہے گی۔ وہ تو آج تک کبھی ان سے اتنے زیادہ دنوں کے لیے جدا نہیں ہوئی تھی۔ وہ افسردہ ہو گئی تھی۔
"ایک بات آپ کو بتانا چاہتی ہوں کہ کہیں آپ کو اس پر اعتراض نہ ہو۔" استانی جی کہہ رہی تھیں۔ وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔
"میرے گھر میں ایک مہمان ہے۔ بیمار ہے۔" استانی جی ماسٹر عبدالعزیز کو تفصیل بتا رہی تھیں۔
"بخار اتر گیا تو چلا جائے گا۔ حکیم صاحب کہہ رہے تھے دو تین روز تک بخار اتر جائے گا اور اگر اقبال پہلے واپس آ گیا تو پہلے ہی چلا جائے گا۔ کسی

بہت اچھے خاندان کا لگتا ہے۔ آپ کو اس لیے بتایا ہے کہ بعد میں آپ کو اعتراض نہ ہو کہ گھر میں ایک اجنبی نامحرم مرد موجود تھا اور استانی جی نے زیب کو گھر میں رکھ لیا۔"

"نہیں آپا جی، مجھے بھلا کیا اعتراض ہوگا۔ مہمان تو اللہ کی رحمت ہوتے ہیں۔ اللہ آپ کو اس کی تیمارداری کا اجر دے گا۔ ہمارا آپ کے علاوہ اور کون ہے یہاں۔ میں کسی اور پر بھروسہ نہیں کرسکتا کہ دو تین دن کے لیے کہیں اور چھوڑ جاؤں۔ آپ ہوں گی تو مجھے کوئی فکر نہیں ہوگی۔ آپ۔" تب ہی فاطمہ آپا والے کمرے میں کچھ گرنے کی آواز آئی تو استانی جی گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"اللہ خیر۔" اور تیزی سے کمرے کی طرف بڑھیں۔ ماسٹر عبدالعزیز بھی ان کے پیچھے ہی گئے تھے۔ زیب النساء وہیں برآمدے میں پریشان سی کھڑی تھی۔ یا اللہ سب ٹھیک ہو۔ کہیں وہ تو نہیں گرا آواز سے تو ایسا ہی لگ رہا تھا۔ یا اللہ اسے گرنے سے کوئی چوٹ وغیرہ نہ آئی ہو۔ تب ہی استانی جی کمرے سے باہر آئیں۔

"زیب بیٹی، ذرا کمرے میں چلی جاؤ۔"

وہ یوں ہی پریشان سی کمرے میں چلی گئی تھی لیکن دروازے کی جھری سے دیکھنے لگی تھی۔ ابا اسے سہارا لے کر صحن کی طرف لے جا رہے تھے۔ کیا وہ واپس جا رہا ہے۔ دل زور سے دھڑکا لیکن پھر اسے ٹوائلٹ کی طرف جاتے دیکھ کر، وہ مطمئن سی ہو کر دروازے کے پاس سے ہٹ کر چارپائی پر بیٹھ گئی تھی۔ کچھ دیر بعد استانی جی نے کمرے کا دروازہ کھولا۔

"زیب بیٹی! آجاؤ تمہارے ابا انتظار کر رہے ہیں تمہارا۔" وہ دوپٹا اچھی طرح اپنے گرد لپیٹتی ہوئی باہر آگئی۔

"اچھا آپا جی! اب اجازت دیجیے۔ صبح جانے سے پہلے زیب کو چھوڑ جاؤں گا۔ اور ایک بار پھر آپ کا بہت شکریہ جب جب کوئی مشکل پڑتی ہے آپ ہمیشہ کام آتی ہیں۔ میں ہمیشہ آپ کے لیے فاطمہ بی کے لیے دعا کرتا ہوں۔ آپ کا احسان مند ہوں۔"

"آپ شرمندہ کر رہے ہیں ماسٹر صاحب! میں نے ایسا کیا کر دیا ہے، اللہ زیب بیٹی کا نصیب اچھا کرے اور آپ کا سایہ اس کے سر پر سلامت رکھے۔ مجھے فاطمہ کی طرح ہی پیاری ہے۔"

استانی جی نے اسے ساتھ لگا کر پیار کیا اور وہ انہیں خدا حافظ کہہ کر صحن کی طرف بڑھی لیکن صحن عبور کرتے ہوئے اس نے غیر ارادی طور پر پیچھے مڑ کر دیکھا شاید وہ دروازے میں کھڑا ادھر ہی تکتا ہو۔ لیکن دروازہ نیم وا تھا اور وہ وہاں نہیں تھا۔ استانی جی باورچی خانے کی طرف جا رہی تھیں۔

گھر آ کر اس نے جلدی سے آٹا گوندھ کر ابا کے لیے روٹی پکائی آلو گھر میں پڑے تھے تو آلو کی بھجیا بنالی۔ ماسٹر عبدالعزیز نے راستے سے دودھ اور انڈے لے لیے تھے۔ اس نے روٹی پکا کر چائے کے لیے پانی رکھ دیا تھا۔

"ابا، میں اتنے دن آپ کے بغیر کیسے رہوں گی۔ بہت یاد آئیں گے آپ نہ جائیں نا۔ کیا ضروری ہے جانا۔" ان کے سامنے کھانا رکھتے ہوئے اس کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔

"مجبوری نہ ہوتی تو کبھی نہ جاتا بیٹی! پچھلے سال بھی نہیں جا سکا تھا۔ ایجوکیشن آفیسر صاحب نے کہا کہ حساب کے اساتذہ کے لیے ہی یہ کورسز شروع کیے ہیں تو آپ کو جانا ہی ہوگا۔ بس تم اپنا بہت خیال رکھنا۔ مجھے تم پر اور استانی جی پر بہت بھروسہ ہے۔ جہاں تک اس بچے کی بات ہے۔ اس حالت میں اس کے لیے سفر کرنا آسان نہیں ہے۔ ابھی بھی غسل خانے میں جانے کے لیے اٹھا تو چکر آیا اور گر گیا۔ کافی کمزوری ہے اسے۔ جانے کب سے بخار ہے۔ لیکن تم گھبراؤ مت، استانی جی کے ہوتے تمہیں کوئی ڈر نہیں۔ بس خود بھی محتاط رہنا۔ دو تین روز میں بخار اتر جائے گا اور کمزوری بھی جاتی رہے گی تو چلا جائے گا۔"

انہوں نے سمجھا کہ وہ استانی جی کے گھر اس اجنبی کی موجودگی سے پریشان ہو رہی ہے۔ کیونکہ وہ

خود بھی کچھ دیر کے لیے پریشان ہو گئے تھے لیکن پھر انہوں نے خود کو تسلی دے لی تھی کہ استانی جی زمانہ شناس اور سمجھ دار خاتون ہیں۔ کوئی دوسرا آپشن بھی تو نہیں تھا۔ زیب النساء نے رات کو اپنا اور ابا کا بیگ تیار کر دیا تھا۔

"دیکھو اپنی ضرورت کا سارا سامان بیگ میں رکھ لو، تاکہ پھر گھر آنے کی ضرورت نہ پڑے۔ پھر بھی اگر آنا پڑا تو اکیلی مت آنا استانی جی کو ساتھ لے کر آنا۔"

یہ کیسا خوف سا بیٹھ گیا تھا دل میں ورنہ پہلے کب یوں خوف زدہ ہوئے تھے۔ گاؤں میں تو سب ہی ایک دوسرے کا خیال رکھتے تھے۔ دن کے وقت کبھی کسی نے گھر کے اندر سے دروازوں کو کنڈی نہیں لگائی تھی۔

"بیمار ہے دو تین دن میں چلا جائے گا۔ کون سا اس نے یہاں ہی ڈیرہ ڈال کر بیٹھ جانا ہے۔" انہوں نے اپنے متذبذب دل کو سمجھالیا تھا۔ اور زیب النساء کو بھی سمجھایا تھا اور اسے استانی جی کے گھر چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ لیکن اس اجنبی کا بخار تو اتر ہی نہیں رہا تھا۔ صبح کے وقت کم ہو جاتا دن کو زور دے کر چڑھ جاتا۔ شام میں پھر ذرا کم ہوتا اور رات کو پھر ہو جاتا۔

"معیادی بخار ہے۔ ٹائیفائیڈ" حکیم صاحب نے چار روز بعد جب بخار نہیں اترا تو کہا۔

"ملیریا ہوتا تو اس دوا سے اتر جاتا۔ اب پتا نہیں کتنے دن کا ہے نو دن کا بھی ہو سکتا ہے اکیس کا بھی۔ پرہیز بہت ضروری ہے۔ روٹی وغیرہ بالکل نہیں دینی نہیں تو آنتوں میں زخم ہو جائیں گے صرف دودھ اور ساگودانہ دیں۔ یہ عرق وغیرہ پلاتی رہیں۔"

استانی جی بہت پریشان تھیں۔ اقبال بھی نہیں آ رہا تھا کہ اسے لے جاتا اور شہر میں کسی ڈاکٹر کو دکھا لیتا۔ وہاں تو خون چیک کر کے تصدیق بھی ہو جاتی۔ پتا نہیں کب سے ہلکا بخار ہو رہا تھا اس نے پروا ہی نہیں کی اور بگڑ گیا۔ اسی لیے اتنی نقاہت ہے۔

پانچویں دن اقبال آیا تو لیکن بہت عجلت میں تھا۔

"مجھے ایک اور گروپ کو لے کر جانا ہے۔ وہ صادق آباد کے قریب ہی میرا انتظار کر رہے ہیں۔ اور اسے تو اس قدر کمزوری ہے کہ چند قدم چلنا محال ہے اس کے لیے۔ آپ کو تو پتا ہے نا خالہ، یہ ہی کمائی کا وقت ہے میرے لیے۔ ورنہ میں خود اسے رحیم یار خان چھوڑ آتا وہاں اس کا دوست ہے، میں صادق آباد جا کر اسے فون کر کے یہاں کا سمجھا دوں گا وہ گاڑی میں لے جائے گا اور پھر اس کے گھر والوں سے رابطہ کر لے گا۔ میں تو بس کھڑے کھڑے اس کا پتا کرنے آیا تھا کہ اگر طبیعت ٹھیک ہے تو ساتھ لے جاؤں شکار کے لیے۔"

استانی جی اس کی اتنی لمبی بات سن کر خاموش ہو گئی تھیں۔ وہ کمزور تو بہت تھا پھر بخار ابھی تک اسی طرح تھا اور ان پانچ دنوں میں انہیں اس سے انسیت سی بھی ہو گئی تھی۔ اس کے ہونے سے کوئی مسئلہ بھی نہیں ہوا تھا۔ زیب النساء زیادہ تر کمرے اور باورچی خانے میں ہی ہوتی تھی۔ اسے غسل خانے وغیرہ میں جانا ہوتا تو استانی جی کو آواز دیتا تھا اور پھر دیوار کا سہارا لیتا ہوا صحن تک جاتا، صحن سے غسل خانے تک جاتے کئی بار لڑکھڑا جاتا تھا۔

"ٹھیک ہے اقبال یار! اسے فون کر دینا اس کے دوست کو۔ اس لیے نہیں کہہ رہی کہ اس کی تیمارداری میرے لیے بار ہے۔ ثواب ہے کسی مریض کی دیکھ بھال کرنا اور کسی مسافر کا خیال رکھنا لیکن بیٹا، اس کا گھر ہوگا ماں باپ ہوں گے۔ وہاں زیادہ بہتر طریقے سے اس کا علاج اور دیکھ بھال ہو سکے گی۔ یہاں گاؤں میں اب حکیم جی ہی ہیں اور جوان کے بس میں ہے کر رہے ہیں۔" انہوں نے اقبال کو تاکید کی۔

"ٹھیک ہے خالہ، جاتے ہی پہلے فون کر دوں گا۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا اور عین اسی وقت زیب النساء باورچی خانے سے کمرے میں جانے کے لیے نکلی تو اقبال کی نظریں بے اختیار اس کی طرف اٹھی تھیں اور پھر باورچی خانے سے نکل کر کمرے تک اس کی نظروں نے اس کا تعاقب کیا تھا۔

"اقبال بیٹا! دوسروں کی بہو بیٹیوں کو اس طرح

pklibrary.com

دیدے پھاڑ کر نہیں دیکھتے۔" استانی جی نے اسے تنبیہ کی۔

"ویسے یہ ہے کون خالہ۔" اقبال کو جیسے ان کی تنبیہ کی پرواہی نہیں تھی۔

"ماسٹر عبدالعزیز کی بیٹی ہے۔"

"ارے یہ زیبو ہے اتنی بڑی ہوگئی ہے۔"

لڑکپن میں کئی بار اس نے زیب النساء کو فاطمہ کے پاس دیکھا تھا۔ جب بھی وہ یہاں آتا تھا اور اسے زیبو زیبو کہہ کر بلاتا تو وہ بہت چڑھتی تھی۔

"اقبال بھائی، میرا نام زیب النساء ہے زیبو نہیں۔" اس کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"بچپن میں بھی یہ بہت خوب صورت ہوتی تھی اب تو غضب ہی ڈھا رہی ہے۔"

"اقبال" استانی جی نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

"چلو اب سدھارو۔ اور اس کے دوست کو پیغام دینا نہ بھولنا۔" اقبال کے جانے کے بعد انہوں نے زیب النساء کو بھی سمجھایا تھا۔

"اب جب اقبال آئے تو باہر نہ نکلنا نہ تم اب چھوٹی بچی ہو اور نہ اقبال تیرہ چودہ سال کا لڑکا ہے۔ نا محرم ہے تمہارا۔"

انہیں اقبال کا اس طرح زیب النساء کو دیکھنا اور پھر بے باکی سے اس کی تعریف کرنا پسند نہیں آیا تھا۔ لیکن یہ سوچ کر کچھ کہتے کہتے رہ گئی تھیں کہ عقل ہی اتنی ہے۔ ماں نے بھی کچھ تہذیب نہیں سکھائی تھی۔

واپسی پر اقبال صرف چند منٹ کے لیے آیا تھا یہ بتانے کہ خود تو اس کی بات نہیں ہوسکی، اس کے دوست سے لیکن وہ ایک جاننے والے کو کہہ آیا ہے کہ اس کے دوست کو پیغام دے دے سارا اتا پتا بھی سمجھا دیا ہے۔

اور وہ دوست چار دن بعد آیا تھا کہ اسے پیغام ہی دیر سے ملا تھا کہ وہ کسی دوسرے شہر میں گیا ہوا تھا۔ استانی جی جہاں خوش تھیں وہاں وہ بے حد افسردہ تھی۔ لیکن اسے تو جانا ہی تھا۔ مسافر تھا ساری عمر تو یہاں نہیں رہ سکتا تھا۔ لیکن یہ دن اس کے دل کے پنوں پر رقم ہوگئے تھے کبھی نہ مٹنے کے لیے۔ آتے جاتے دن میں ایک آدھ بار سامنا ہو ہی جاتا تھا۔ وہ زبان سے کچھ نہ کہتا تھا لیکن اس کی نظریں باتیں کرتی تھیں ان نظروں میں اسلم کی نظروں جیسی بے حیائی نہ تھی نہ ہی اقبال کی نظروں والی بے باکی تھی۔ ان نظروں میں تو وارفتگی تھی پاکیزگی تھی۔ شفاف بے ریا آنکھوں میں ہوس نہیں تھی۔

استانی جی کسی کام سے باہر جاتیں تو وہ کمرے سے باہر نہیں نکلتی تھی لیکن ایک روز، وہ اپنے کمرے کا دروازہ ذرا سا کھولے اسے صحن کی طرف جاتے دیکھ رہی تھی۔ کہ وہ اسے دیکھتی تھی کبھی کمرے کے دروازے کی جھری سے اور کبھی باورچی خانے کی کھڑکی سے جو صحن کی طرف کھلتی تھی۔ اس روز بھی وہ اسے دیکھ رہی تھی جب اس نے برآمدے سے باہر صحن میں قدم رکھا تو یکا یک، اس نے دونوں بازو پھیلائے تھے شاید چکر آ گیا تھا اسے اور پھر وہ سنبھل نہیں سکا۔ برآمدہ صحن سے ذرا سا اونچا تھا۔ وہ بے اختیار دروازہ کھول کر اس کی طرف لپکی تھی۔

"آپ استانی جی کا انتظار کر لیتے۔ یہ باڑے سے دودھ لینے گئی ہیں۔" اس نے بازو سے پکڑ کر اسے اٹھنے میں مدد دی تھی۔

"شکریہ" نظریں ملیں اور پھر جیسے ارد گرد سب غائب ہوگیا۔ کتنے ہی لمحے گزر گئے وہ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ صحن کی دیوار سے بلی نے چھلانگ لگائی تو دونوں چونکے۔ زیب النساء کی نظریں جھک گئیں رخساروں پر شفق کی سرخی بکھر گئی۔ لانبی مڑی ہوئی پلکوں کی لرزش کو ابھی اب بھی دلچسپی اور وارفتگی سے دیکھ رہا تھا۔ وہ مڑی تو اس نے بے اختیار آواز دی۔

"سنو" اس نے برآمدے میں قدم رکھتے ہوئے مڑ کر اسے دیکھا۔

"تم بہت اچھی ہو زیب النساء۔"

استانی جی نے کئی بار اسے کسی کام کے لیے آواز دی تھی تو تب ہی اسے اس کا نام معلوم ہوا تھا۔

pklibrary.com

زیب النساء کے رخساروں پر بکھری شفق گہری ہوئی اور لبوں میں ہلکی سی لرزش تھی۔

"میں اپنے ان چکروں سے سخت تنگ تھا کہ زمین آسمان سب جیسے الٹ پلٹ ہو جاتے تھے لیکن آج ان کا شکر گزار ہوں کہ وہ جو چھپ چھپ کر مجھے دیکھتی تھی آج روبرو دیکھ لیا پورے ہوش و حواس میں۔"

"نہیں۔ میں۔" اور کچھ کہنے کی کوشش میں اس کے ہونٹ لرز کر رہ گئے تو اجنبی کے لبوں پر شریر سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"کیوں۔ کیا تم مجھے چھپ چھپ کر نہیں تکتی ہو۔" وہ گھبرا گئی۔ پیشانی پر پسینے کی بوندیں نمودار ہوئیں۔

"میں بھی تمہیں چھپ چھپ کر دیکھنا چاہتا تھا لیکن تم دکھتی ہی نہیں تھیں۔" اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی تھی۔

"میرا بخار پوری طرح اترا نہیں رہا تھا۔ کمزوری بھی تھی اور یہ چکروں کی مصیبت بھی تھی لیکن پھر بھی اب اس قابل تھا کہ یہاں سے رحیم یار خان چلا جاتا۔ لیکن نہیں گیا۔ جانتی ہو کیوں۔ تمہیں ایک بار پورا مکمل دیکھنا چاہتا تھا۔ کبھی جو ایک جھلک نظر آتی تھی اس سے تشنگی بڑھتی تھی۔ اب چلا جاؤں گا۔ لیکن پھر آؤں گا۔ بہت جلد۔"

اور زیب النساء کا دل اتنی زور سے دھڑک رہا تھا کہ اسے لگتا تھا جیسے ابھی سینے کی چار دیواری توڑ کر باہر آ گرے گا۔ ایک بھرپور نظر اس پر ڈال کر اس نے صحن کی طرف رخ کیا اور فوراً ہی سر تھام کر رک گیا۔

"سنبھل کر۔" بے اختیار اس نے ایک قدم اٹھایا تو اجنبی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔

"میں چلا جاؤں گا۔ تم اب جاؤ۔ استانی جی گھر پر نہیں ہیں اور اگر کوئی آ گیا تو میں نہیں چاہتا کہ کسی کی انگلی تمہاری طرف اٹھے اور استانی جی کو اپنی اس نیکی پر شرمندگی ہو۔"

وہ تیز تیز چلتی ہوئی کمرے میں آ گئی تھی۔ دل اسی طرح دھڑک رہا تھا۔ اس اجنبی کے لیے دل میں جو محبت کا احساس پیدا ہوا تھا اس میں عقیدت بھی شامل ہو گئی تھی۔

پھر دو دن بعد اس کا دوست گاڑی لے کر اسے لینے آ گیا تھا۔ جانے سے پہلے اس نے استانی جی سے جانے کیا کہا تھا کہ وہ اسے کھوجتی نظروں سے دیکھتیں۔ یوں جیسے اس کے اندر تک کا حال جان لینا چاہتی ہوں۔ لیکن وہ نظریں جھکا لیتی۔ یوں ہی کوئی بات چھیڑ دیتی تاکہ استانی جی کا دھیان اس کی طرف سے ہٹ جائے، اجنبی کے جانے کے تین دن بعد ماسٹر عبدالعزیز آ گئے تھے اور استانی جی کا شکریہ ادا کر کے اسے گھر لے گئے تھے۔

وہ اجنبی نو دن استانی جی کے گھر رہا تھا۔ اور زیب النساء آٹھ دن۔ ان آٹھ دنوں میں وہ چھپ چھپ کر اسے دیکھتی ہی رہی تھی۔ اور بس دو بار آمنا سامنا ہوا جب وہ اسے پانی دینے گئی تھی اور جب وہ صحن میں گرا تھا اور وہ اسے سہارا دے کر اٹھانے کے لیے گئی تھی، بس اس دوسری بار میں چند جملے۔ وہ ان چند جملوں کو سینکڑوں بار دہرا چکی تھی۔ نہ کوئی عہد و پیمان ہوئے تھے نہ محبتوں کا دعویٰ کیا گیا تھا پھر بھی وہ ہتھیلیوں پر انتظار کی شمع جلائے بیٹھی تھی۔

"میں پھر آؤں گا بہت جلد۔" بس یہ چند لفظ تھے جو اس کی زبان سے ادا ہوئے تھے اور دل میں امید کی شمع جلا گئے تھے۔ اس کا خوش گمان دل کہتا تھا کہ وہ آئے گا۔ اس پل صرف وہ ہی نہیں۔ وہ بھی اسیر ہوا تھا۔ وہ سوچتی ابا کہتے تھے اماں سے کہ میری بیٹی کے لیے تو کوئی شہزادہ آئے گا۔ اور کیا یہ وہی شہزادہ ہے۔ جو میرے لیے یہاں آیا تھا اور اسے انتظار کی شمع تھما کر چلا گیا تھا اور اسے اپنا خواب یاد آ جاتا، سفید گھوڑے پر سوار وہ شہزادہ سلیم۔

وہ جو بالکل اس اجنبی کی طرح تھا۔

اس کا شہزادہ سلیم۔ لیکن وہ اس کی انارکلی نہیں تھی۔ وہ تو اس کی نور جہاں تھی۔ اس کی ملکہ راج کرنے والی۔ اس کے دل پر اور اس کی ریاست پر

اسے نادرہ نہیں بننا تھا، ناکام نامراد اسے تو مہر النساء ہونا تھا بامراد کامیاب لیکن کیا وہ واقعی کامیاب اور بامراد ہوسکتی ہے۔ اس نے سینکڑوں بار سوچا تھا۔ ایک جملہ تھا بس ایک چھوٹا سا جملہ۔ ”میں پھر آؤں گا بہت جلد۔ چھ لفظوں پر مشتمل یہ چھوٹا سا جملہ دل میں امید کی شمع جلائے ہوئے تھا لیکن کبھی کبھی وسوسوں کی تیز ہوا سے یہ شمع بجھ سکنے لگتی۔ اور اسے لگنے لگتا کہ وہ نہیں آئے گا وہ شاید کبھی نہیں آئے گا، لیکن وہ آ گیا تھا استانی جی کے پاس۔ اور وہ بے خبر تھی۔

”میں نے جانے سے پہلے آپ سے کہا تھا کہ میں پھر آؤں گا آپ سے کچھ مانگنے تو میں آ گیا ہوں استانی جی، میں زیب النساء سے شادی کرنا چاہتا ہوں مجھے نہیں علم کہ اس کا آپ سے کیا رشتہ ہے۔ ایک اتفاقی نظر اس پر پڑی تھی ہمیشہ سے میرے ذہن میں اپنی بیوی کے لیے ایسا ہی ایک تصور تھا، ایک ایسی لڑکی جس کی آنکھوں میں حیا ہو چہرے پر پاکیزگی ہو اور آپ کی زیب النساء ایسی ہی ہے۔“

استانی جی نے اس کی باتوں کو تحمل سے سنا تھا۔ اور اسے ماسٹر عبدالعزیز اور زیب النساء کے متعلق بتایا۔

”تم سے بہتر زیب النساء کے لیے میری نظر میں کوئی اور رشتہ نہیں ہے لیکن بیٹا، رشتہ لینے کا یہ طریقہ نہیں ہوتا کہ لڑکا خود ہی منہ اٹھا کر چلا آئے رشتہ مانگنے۔ کیا تمہارے کوئی بزرگ نہیں ہیں کسی بڑے کو لاؤ رشتے کے لیے تو میں ماسٹر صاحب سے بات کرتی ہوں۔“ اور وہ شرمندہ ہو گیا تھا۔

”ٹھیک ہے استانی جی، میں جلد ہی کسی بڑے کو لے کر آؤں گا۔ مجھے بس یہ اطمینان چاہیے تھا کہ اس کا رشتہ ابھی تک نہیں ہوا آپ ماسٹر جی کے کانوں میں یہ بات ڈال دیں کہ میں بھی زیب النساء سے شادی کرنا چاہتا ہوں، ایسا نہ ہو کہ میرے آنے سے پہلے وہ کسی اور کو ہاں کر دیں۔“ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسے اور کن لفظوں میں اپنا مدعا بیان کرے۔ استانی جی اس کی بوکھلاہٹ پر مسکرائی تھیں۔

”لیکن دیر نہ کرنا بیٹا ماسٹر جی اس کی جلد از جلد شادی کرنا چاہتے ہیں۔“ اور وہ چلا گیا تھا پھر جلدی آنے کے لیے۔

اور ابھی استانی جی نے ماسٹر صاحب سے کوئی بات کی ہی نہیں تھی کہ اقبال آ گیا۔ ہمیشہ کی طرح استانی جی اسے دیکھ کر خوش ہو گئی تھیں۔

”کیا آج بھی شکاریوں کے ساتھ آئے ہو۔“

”نہیں خالہ، آج تو صرف آپ سے ملنے کے لیے آیا ہوں۔“

”جیتے رہو۔“

”خالہ۔“ کھانا وغیرہ کھا کر اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

”میں شادی کرنا چاہتا ہوں خالہ۔ بہن بھائیوں کو تو میرا کوئی خیال نہیں سب اپنی اپنی زندگیوں میں مگن ہیں۔ ماں باپ ہوتے تو میرا سوچتے، اب آپ ہی میری بڑی ہیں بزرگ ہیں۔ آپ نے ہی میرے لیے کچھ کرنا ہے۔ سچ بتاؤں تو تنہا گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔ گھر جانے کو جی ہی نہیں چاہتا۔“ وہ ان کے گھٹنے ہی پکڑ کر بیٹھ گیا تھا۔

”میں دیکھوں گی تمہارے لیے کوئی لڑکی۔ فاطمہ سے بھی کہوں گی لیکن اقبال بیٹا، کوئی مستقل کام تو کرو پہلے۔ یہ تو ہوائی روزی ہے تمہاری۔ لڑکی والے کم سے کم اتنی ڈیمانڈ تو کرتے ہیں کہ لڑکا کام کرتا ہو۔ دس جماعتیں پڑھ رکھی ہیں کہیں کسی دفتر میں ہی کلرک وغیرہ کی نوکری دیکھ لو۔ فارغ ہوتے ہو تو ٹائپنگ وغیرہ سیکھ لو تو نوکری ملنے میں آسانی ہو جائے گی۔“

”ٹھیک ہے خالہ، میں جلد ہی کوئی مستقل کام کرلوں گا۔ یوں بھی ایک بندے نے وعدہ کیا ہے مجھ سے کہ باہر بھجوا دے گا مجھے، تو بس پھر نوٹ ہی نوٹ ہوں گے۔۔ عیش کرے گی میری بیوی۔“

استانی جی کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہو کر معدوم ہو گئی، وہ پچھلے کئی سالوں سے اس طرح

کی اس کی باتیں سنتی آرہی تھیں۔

اور خالہ، لڑکی ڈھونڈنے کی کیا ضرورت ہے۔" اس نے استانی جی کا گھٹنا دبایا۔

"وہ ہے نا ماسٹر جی کی بیٹی زیب النساء۔ اس کے لیے ماسٹر جی سے بات کریں نا۔ وہ آپ کی بات نہیں ٹالیں گے۔"

استانی جی چند لمحوں کے لیے خاموش ہوگئی تھیں پھر نرمی سے اس کے ہاتھ اپنے گھٹنوں سے ہٹائے۔

"ٹھیک ہے میں ماسٹر صاحب سے بات کروں گی، آگے ان کی مرضی" اور اس روز جب ماسٹر صاحب زیب النساء کو اسکول جاتے ہوئے چھوڑنے آئے تو استانی جی نے دونوں رشتے ان کے سامنے رکھ دیے۔

"آپ نے کہا تھا ماسٹر صاحب، کہ زیب بیٹی کے لیے کوئی رشتہ ہو تو آپ کو بتاؤں۔ آپ کو یاد ہے وہ لڑکا جو بیمار ہو کر کچھ دن میرے گھر رہا تھا۔ اس نے باتوں باتوں میں یوں ہی ذکر کیا کہ وہ کسی باحیا اور سادہ سی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے تو میرے ذہن میں اپنی زیب کا خیال آ گیا تو میں نے اس سے کہا کہ ایک لڑکی ہے تو میری نظر میں وہ اپنے والدین کو لے کر آجائے تو پھر بات کرتی ہوں۔ لڑکے نے سی۔ایس۔ایس کا امتحان دے رکھا ہے۔ اچھا خاندان پڑھی لکھی فیملی۔ اگر یہ رشتہ ہو جائے تو ہماری زیب کا نصیب کھل جائے۔"

استانی جی نے بڑے سبھاؤ سے بات کی تھی وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ماسٹر صاحب کو لڑکے کی پسندیدگی کا گماں ہو کہ وہ زیب النساء کو ان کے حوالے کر کے گئے تھے اور انہیں خیال گزرے کہ زیب النساء لڑکے کے سامنے آتی جاتی رہی ہے۔

"لڑکا اتنا پڑھا لکھا ہے اور اتنے اچھے خاندان کا ہے وہ بھلا ہم غریبوں کے ہاں کیوں اپنے والدین کو رشتے کے لیے لائے گا۔"

انہیں لگا تھا کہ استانی جی اپنی سادگی میں یوں ہی خوش گماں ہو رہی ہیں۔

"اچھی امید رکھنی چاہیے ماسٹر صاحب، جوڑ تو اللہ ہی ملاتا ہے۔ ہم نے تو بس ایک کوشش ہی کرنی ہے۔ اقبال کو تو آپ جانتے ہیں۔ وہ بھی خواہش مند ہے۔ لیکن وہ جبر کر کوئی کام کاج نہیں کرتا۔ گھر بھی ہے اپنا۔ پیسہ وغیرہ بھی جمع کر رکھا ہے اور کوئی برائی بھی نہیں ہے۔

میں نے اس سے کہا ہے کہ پہلے کوئی نوکری کرو۔ اور کچھ نہیں تو چھوٹی موٹی دکان ہی بنالو پھر بات کروں گی۔"

"بہت شکریہ آپا جی۔ آپ سے زیادہ زیب النساء کا کون خیر خواہ ہو سکتا ہے۔ دعا کیا کریں میری زیب کے لیے کہ اپنی زندگی میں اسے اپنے گھر کا کر دوں۔ میں چوہدری عبدالمالک صاحب سے بھی مشورہ کروں گا۔ اگر وہ بچہ اپنے والدین کو رشتے کے لیے لایا تو، اقبال سے بھی آپ نے ٹھیک کہا پہلے کوئی کام کاج کر لے تو سوچوں گا اس کے متعلق۔" انہوں نے استانی جی سے تو کہہ دیا تھا لیکن انہیں امید نہیں تھی وہ اپنے والدین کے ساتھ رشتہ مانگنے آجائے گا۔ اسی لیے انہوں نے چوہدری عبدالمالک سے بات نہیں کی تھی۔ اور ٹھیک دس دن بعد وہ آ گیا تھا لیکن اپنے والدین کے ساتھ نہیں بلکہ اپنے کسی دوست کے والدین کے ساتھ ماسٹر عبدالعزیز پریشان سے ہو گئے تھے۔

"آپ کے والدین کیا اس رشتے کے لیے رضامند نہیں ہیں بیٹا!"

"میں نے دراصل ابھی گھر میں بات ہی نہیں کی۔ مجھ سے بڑے تین بھائی ہیں میرے۔ ابھی بڑے بھائی کی شادی ہونے والی ہے اور کچھ پریشانی بھی ہے ان دنوں گھر میں تو۔ میرے والدین پڑھے لکھے ہیں زبردستی کے قائل نہیں ہیں۔ اس لیے جب بھی میں نے بات کی وہ انکار نہیں کریں گے۔"

"تو ٹھیک ہے بیٹا، جب آپ کے بھائیوں کی شادیاں ہو جائیں اور آپ — اپنے والدین سے بات کرلیں تو انہیں ساتھ لے کر آیئے گا۔" ماسٹر عبدالعزیز

کا دل نہیں مانا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کا رشتہ ایسے کسی لڑکے کے ساتھ کردیں جس کے والدین کی رضامندی نہ ہو۔

''لیکن کیا آپ انتظار کرلیں گے۔'' اس کے ساتھ آئی خاتون نے پوچھا تھا۔

''ہاں مجھے بھی کوئی جلدی نہیں۔ ابھی میری بیٹی نے ایف۔ اے کا امتحان دینا ہے۔ پھر میں اسے بی۔ اے کے لیے کالج میں داخل کروادوں گا۔'' انہیں وہ بہت اچھا لگا تھا۔ سمجھ دار اور تعلیم یافتہ اور خاندانی اپنی زیب کے لیے وہ ایسے ہی کسی شہزادے کا خواب دیکھتے تھے۔ لیکن اب ایسا بھی نہیں تھا کہ بغیر سوچے سمجھے وہ اسے اپنی بیٹی کا ہاتھ تھمادیتے۔ تاہم انہوں نے سوچ لیا تھا کہ وہ اس کے والدین کا انتظار کریں گے لیکن اگر، اس دوران کوئی اچھا رشتہ آ گیا تو وہ زیادہ انتظار نہ کرسکیں گے۔ یہ بات انہوں نے آنے والوں کو بھی بتادی تھی اور اس وقت اس لڑکے کی آنکھوں کی چمک ذرا سی دیر کو ماند ہوگئی تھی۔

''ان شاء اللہ بڑے بھائی کی شادی کے بعد میں گھر میں بات کروں گا۔''

وہ واپس چلے گئے تھے لیکن زیب النساء کے دل میں ماند ہوتی امید کی روشنی پھر سے بڑھ گئی تھی۔ وہ آ گیا تھا تو وہ پھر ضرور آئے گا۔ اسے یقین تھا اور ماسٹر عبدالعزیز نے بھی کئی روز تک استانی جی کی طرح اسے کھوجتی نظروں سے دیکھا تھا اور پھر ایک روز تجسس کے ہاتھوں مجبور ہوکر پوچھ بیٹھے تھے۔

''زیب! ایک بات پوچھوں بیٹی۔''

''جی ابا۔'' وہ نظریں جھکائے ان کے سامنے بیٹھی تھی۔

''استانی جی کے مہمان کی بھی تم پر نظر پڑی تھی۔''

''جی ابا۔'' اس کا سر جھک گیا وہ ابا سے جھوٹ نہیں بول سکتی تھی۔

''استانی جی گھر پر نہیں تھیں اور وہ صحن میں گر گیا تھا میں بے اختیار بالکل غیر ارادی طور پر اس کی مدد کرنے کے لیے صحن میں آ گئی تھی۔'' اس کی پلکیں لرز رہی تھیں اور رخساروں پر سرخی تھی۔

''میں نے استانی جی کو نہیں بتایا تھا کہ وہ ناراض ہوں گی کہ میں کمرے سے باہر کیوں نکلی۔ یہ غیر اختیاری طور پر ہوا تھا ابا، کیا آپ ناراض ہیں مجھ سے۔'' اس نے نظریں اٹھائیں تو ان میں آنسو چمک رہے تھے۔

''نہیں۔'' انہوں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔

''میں نے تو بس یوں ہی پوچھ لیا تھا گمان گزرا تھا کہ اس نے تمہیں دیکھا ہوگا تب ہی تو تمہارا رشتہ لے کر آیا ہے۔'' وہ مسکرائے تھے اور اس نے سکون بھرا گہرا سانس لیا تھا۔ اور نم آنکھوں میں جگنو سے چمکے تھے اور ماسٹر عبدالعزیز نے بے اختیار دعا کی تھی۔

''یا اللہ اسے میری بچی کا نصیب بنادے۔''

اور کوئی لمحہ ہوتا ہے ایسا جب دل سے نکلنے والی دعا رد نہیں ہوتی۔ اور ان کی دعا بھی رد نہیں ہونے والی تھی۔

☆☆☆

نومبر کا آغاز تھا۔ فضا میں ہلکی خنکی تھی۔ لیکن صحن میں دھوپ پھیلی تھی، جس کی تپش برآمدے تک آ رہی تھی کہ برآمدے کے فرش پر بھی دھوپ کہیں کہیں پھیلی ہوئی تھی۔ زمل دیوار سے ٹیک لگائے تخت پر بیٹھی صحن میں پھدکتی چڑیوں کو دیکھ رہی تھی۔ تخت پر دھوپ نہیں پڑ رہی تھی لیکن دھوپ کی حدت محسوس ہو رہی تھی جو اچھی لگ رہی تھی۔ پاس ہی بی بی اماں بیٹھی اون اور سلائیوں سے الجھ رہی تھیں۔ زمل گاہے گاہے ان کی طرف بھی دیکھ لیتی تھی۔ بہت سارے تھکا دینے والوں دنوں کے بعد آج وہ ذرا ریلیکس ہوئی تھی تو بی بی اماں کے پاس آ کر بیٹھ گئی تھی۔

''بی بی اماں! آج کل ہاتھ کے بنے ہوئے سوئیٹر کون پہنتا ہے۔ آپ خوامخواہ تھکتی رہتی ہیں۔''

''ارے سارا دن مجھ سے فل بازو والی کوئی نہیں

پہنی جاتی۔ یہ ہاف بازو والا سوئیٹر بناؤں گی۔" انہوں نے شاپر سے اون کا گچھا نکالا۔

"ہاف بھی تو بازار سے مل جاتا ہوگا۔ مجھے ثنا اور آنٹی کے لیے گفٹ لینے جانا ہے تو لے آؤں گی آپ کے لیے۔"

ثنا ظفر یاب کی بیٹی تھی۔ ظفر یاب اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ شادی میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ اور دو تین روز میں واپس جانے والے تھے۔ اکتوبر کے دوسرے ہفتے میں وہ شادیوں سے تو فارغ ہو گئے تھے لیکن پھر دعوتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ خود ان کے ہاں شانزہ کے سسرال سمیت سب کی دعوت چند دن پہلے ہی ہوئی تھی۔ سو اس مصروفیت میں وہ مارکیٹ جا ہی نہیں سکی تھی کہ ان کے لیے گفٹ خرید سکے۔ دادا جان نے بھی ان کے لیے سوٹ خریدنے کو کہا تھا۔

"نہ۔ مجھے تم اون لا دینا بس اپنا بنا کر تمہارے لیے اسکارف بناؤں گی۔ دل لگا رہتا ہے میرا بھی ان اون سلائیوں میں۔" بی بی اماں کو فارغ بیٹھنا پسند نہ تھا گرمیوں میں دوپٹوں پر کڑھائی کرتیں۔ کروشیئے سے لیس بناتیں اور سردیوں میں بھی جو فارغ وقت ملتا۔ سب کے سوئیٹر بنائی رہتیں۔ کبھی کسی کے لیے کبھی کسی کے لیے۔

"ٹھیک ہے بی بی اماں! اون لے آؤں گی۔" زیل پھر صحن کی طرف دیکھنے لگی تھی جہاں اب چڑیاں موجود نہیں تھیں۔

"یہ شانزہ مجھے خوش نہیں لگتی زیل!" بی بی اماں لچھے کو گھٹنوں پر چڑھائے گولا بنا رہی تھیں۔ "اس کے چہرے پر نئی نویلی دلہنوں والی رونق اور خوشی نہیں ہے تم نے غور کیا تھا ہمارے ہاں کی دعوت میں بھی کتنی چپ چپ لگ رہی تھی اور پھر کتنی سادا سی تھی نہ کوئی زیور نہ کام والے کپڑے، بس کان میں وہ ذرا ذرا سے ٹاپس تھے۔"

"دراصل عقیل بھائی کو یہ اس طرح کے چمک دمک والے کپڑے اور تام جھام پسند نہیں ہے بی بی اماں! سحرش بتا رہی تھی کہ عقیل بھائی نے تو پہلے روز گھر پہنچتے ہی کپڑے تبدیل کرنے اور منہ ہاتھ دھونے کو کہہ دیا تھا۔" زیل نے بتایا تو وہ حیران ہوئیں۔

"تم نے پہلے تو ذکر نہیں کیا۔" اور پھر لمحہ بھر بعد سر ہلایا۔

"چلو بھڑکیلے چمکیلے کپڑے پسند نہیں عقیل میاں کو نہ سہی کئی مردوں کو نہیں پسند ہوتے پر ایسا بھی کیا کہ چار دن بھی پہنا نہ چلے کہ نئی نویلی دلہن ہے۔ چہرے پر تھوڑی خوشی کی کوئی رمق نہ تھی اللہ خوش رکھے اپنی ماہ وش کو کیسی دیکھ رہی تھی، خوشی۔ اس کے پورے وجود سے پھوٹتی تھی۔" بی بی اماں بھلے اور برے والوں سے ان کے مزاج و عادات کی وجہ سے چڑتی تھیں لیکن سب سے انسیت اور محبت بھی۔ سب کی خوشیوں اور اچھے نصیب کے لیے دعا گو رہتی تھیں۔

"شانے اجنبی لوگوں اور اجنبی ماحول میں گئی ہے جبکہ ماہا اپنے ہی گھر میں ہے تو شاید اس لیے۔ کچھ وقت لگے گا شانے کو وہاں ایڈجسٹ ہونے میں تو ہو جائے گی ان شاء اللہ۔"

زیل بھی کبھی کبھی شانزہ کو شانے اور ماہ وش کو ماہا کہہ کر بلاتی تھی۔

"اللہ کرے ایسا ہی ہو پر سچی بات ہے مونا اور رخسانہ نے صرف دولت ہی دیکھی یوں تو بہت سیانی بنتی ہیں لیکن صرف پیسہ، گڈیاں (گاڑیاں) اور بنگلے ہی دیکھے ہیں۔ شکل کا بھی ایسا شہزادہ نہیں تھا کہ مرتی ہماری شانزہ لاکھوں میں ایک ہے۔ شہزادی لگتی ہے۔ چلو مرد کی شکل وصورت کوئی نہیں دیکھتا لیکن کوئی اور گن بھی تو ہوں۔ ایسا بدمزاج سا کہ ہمارے ہاں کی دعوت میں سارا وقت تیوریاں چڑھائے بیٹھا رہا عمر کتنا اچھا تھا اور رقیہ کی بھی کتنی خواہش تھی۔ پڑھا لکھا تھا۔ چند سالوں میں گاڑی بھی لے لیتا پھر ایسے غریب بھی نہ تھے۔ اپنا گھر۔ رقیہ ملی تھی شادی میں، کہہ رہی تھی بہت اچھی نوکری مل گئی ہے اسے۔ مجھے تو پہلے روز سے ہی چھچھورے لگے تھے نو دو لیتے۔ خاندانی لوگوں والے طور طریقے نہیں تھے ان

کے۔" بی بی اماں کو عمر کے لیے رشتے سے انکار کا بھی ابھی دکھ تھا۔

"پتا ہے وہ وہ ولیمے میں بھی آپا کی پڑوسن بلی تھی اس نے سب آگا پیچھا بتا دیا مجھے کہہ رہی تھی۔ عقیل کے پڑدادا کی وہاں قصور میں چھوٹی سی پرچون کی دکان ہوتی تھی۔ عقیل کا دادا کسی پارٹی سے منسلک ہوا تو پارٹی کی مدد سے بلدیاتی الیکشن میں کامیاب ہوگیا۔ اور پھر بیٹا یعنی عقیل کا باپ صوبائی اسمبلی تک پہنچ گیا۔ بس پھر تو باپ بیٹا نوٹ چھاپنے لگے۔ حرام کی کمائی سے مل بھی لگالی۔ سوتر بنتا ہے وہاں۔ بتا رہی تھی اس کی بھانجی کو بلدیہ کے اسکول میں نوکری دلوانے کے لیے دو لاکھ رشوت مانگ لی تھی عقیل کے باپ نے۔ عقیل تو سب بہن بھائیوں سے چھوٹا ہے مجھ منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوا ہے۔

زیادہ پڑھا لکھا نہیں ہے۔ شاید بارہ یا چودہ جماعتیں پاس ہے۔ بڑے بہن بھائی تو کافی پڑھے لکھے ہیں۔ پارٹی والے بڑا سپورٹ کرتے ہیں انہیں۔

وہ ایک وزیر بھی تو آیا ہوا تھا ولیمے میں۔ ایک ہمارے ظفریاب تھے مصیبت پڑی تو پارٹی والوں نے پوچھا تک نہیں۔ یہ تو صبوحی اتنی بھاگ دوڑ نہ کرتی تو ہمیں کہاں پتا چلنا تھا ظفریاب کا۔ پارٹی والوں نے عقیل کو کوئی بڑا ٹھیکہ دلوایا ہے۔ جانے کس چیز کا۔ یہ اسے علم نہ تھا۔ ارے باتوں باتوں میں غلط بین دیا سارا۔" وہ چونک کر بنے ہوئے حصے کو دیکھنے لگیں۔

"یہ جو اتنی دیر سے آپ کر رہی ہیں بی بی اماں، کیا یہ غیبت میں شمار نہیں ہوگا۔" زمل نے انہیں دیکھا جواب بنے ہوئے حصے کو ادھیڑ رہی تھیں۔

"اللہ مجھے معاف کرے۔" انہوں نے فوراً ہی کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"پر کیا کروں میری آنکھوں کے سامنے سے شانزے کا چہرہ ہی نہیں جاتا ویران روکھا پھیکا سا۔ سچی بات ہے جب سے وہ ہمارے ہاں کی دعوت سے گئی ہے میں تو اسی کے متعلق سوچ، سوچ کر پریشان ہوئی رہتی ہوں کیسی سہمی سہمی اور کھوئی کھوئی سی تھی۔ پر تیری تائی کی آنکھوں کے آگے تو دولت کی پٹی بندھی ہے۔ بیٹی کا اجاڑ چہرہ نظر ہی نہیں آرہا تھا بس سمدھن کے آگے بچھی جا رہی تھی۔" وہ اب ایک ایک خانہ سلائی پر اٹھا رہی تھیں۔ سب خانے اٹھا کر انہوں نے ایک تنقیدی نظر اس پر ڈالی اور اون سلائیاں شاپر میں رکھیں۔

"اس وقت دماغ کام نہیں کر رہا ہے بعد میں بتاؤں گی۔"

سنو تو اب کے شانزہ آئے تو پوچھنا تو سہی کہ کہیں مار پیٹ تو نہیں کرتا وہ کیا کہتے ہیں آج کل ذہنی مریض تو نہیں ہے۔

"اللہ نہ کرے بی بی اماں، آپ تو مجھے بھی ڈرا رہی ہیں۔ مونا تائی بتا رہی تھیں بہت خوش ہے اپنے گھر میں۔ ابھی گھومنے کے لیے جا رہے ہیں دبئی وغیرہ۔" زمل کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

"اللہ اسے خوش رکھے۔" بی بی اماں نے دعا دی اور تخت پر پڑا اپنا بکھرا ہوا سامان سمیٹنے لگیں۔ جو اون کے گچھوں اور گولوں پر مشتمل تھا۔

"سارے جہان کے کام کرنے اور انہیں سمجھانے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ تم نے تو اس زین کو کیوں نہیں سمجھائی ہو۔"

"کیا۔ کیا سمجھاؤں بی بی اماں۔" وہ حیران سی ہو کر انہیں دیکھنے لگی۔

"یہ ہی کہ اب باپ سے ناراضی ختم کرے۔ تقریباً دو ماہ رہ کر جا رہے ہیں ظفریاب، کبھی جو باپ سے جڑ کر بیٹھا ہو۔ سود کھ سکھ کہنے والے ہوتے ہیں۔ اکلوتا بیٹا ہے۔ ایسا کیا گناہ کر دیا ظفریاب نے شادی کر کے، نہ کرتا شادی تو وہی حال ہوتا جو تیرے ابا کا ہے۔ چپ لگ جاتی اسے بھی یہ تو عارفہ نے سنبھال لیا اسے۔ ورنہ جینے کی امنگ ختم کر بیٹھا تھا۔ کہتا تھا۔ بی بی اماں صبوحی کے جانے کے بعد اب جینے کو جی نہیں چاہتا۔ یہ ظفریاب بھی بس جلسوں جلوسوں میں ہی

تقریریں کرسکتا تھا یہ نہیں کہ ایک تھپڑ لگا کر گلے سے لگالے اور پوچھے کان پکڑ کر کہ صاحبزادے کیا ناقابل معافی قصور سرزرد ہوگیا ہے مجھ سے کہ ابھی تک اینٹھے ہوئے ہو۔"

بی بی اماں کبھی جب بولنے پر آتی تھیں، تو ایسے ہی بولتی چلی جاتی تھیں کہ انہیں اس گھر کے ہر فرد سے بہت محبت تھی۔ ظفریاب کو اداس اور حسرت سے آزین کی طرف دیکھتے پاکر، ان کا دل ان کے لیے کڑھتا تھا۔

"کتنا شوخ، پرجوش اور غصیلا ہوتا تھا ظفریاب اب سارا دن باپ کے کمرے میں چپ بیٹھا رہتا ہے۔ مجھے تو تب سے طرح طرح کے وہم ستارہے ہیں۔ جب سے ظفریاب نے بڑے صاحب سے کہا ہے کہ جانے سے پہلے وہ مکان میں اور مارکیٹ میں اپنا حصہ آذین کے نام کرنا چاہتا ہے۔ زندگی کا کیا بھروسہ۔ لندن والا گھر بیوی اور بیٹی کے نام کردیں گے۔ اور یہاں کی جائیداد زین کے کہ یو کے جانے سے تو اس نے انکار کردیا تو میرے جانے سے پہلے کاغذی کارروائی ہوجائے تو اچھا ہے۔ یہ زندگی کے میلے میں زمل! کیا خبر پھر کبھی ملاقات ہو نہ ہو۔ اسے سمجھاؤ کہ جیتے جی باپ کے گلے لگ جائے۔"

"اللہ نہ کرے کہ کسی کو کچھ ہو۔ ایسا تو نہ کہیں بی بی اماں۔" زمل نے تڑپ کر انہیں دیکھا۔

"اللہ ظفر چاچو کو لمبی زندگی دے۔" وہ پہلے ظفریاب کو تایا کہہ کر بلاتی تھی لیکن اس بار وہ انہیں چاچو کہنے لگی تھی۔

"خدانخواستہ میرا کچھ ایسا مطلب نہیں تھا اللہ ظفریاب کو لمبی حیاتی دے۔ میں نے تو یونہی کہا دل کی بات کی ہے۔" وہ اپنا شاپر اٹھا کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ظفریاب کی بیوی ماڑی (بری) نہیں ہے۔ بہن بھی آگے پیچھے ہی پھرتی رہتی ہے زین کے۔"

"یہ تو ہے بی بی اماں! عارفہ آنٹی بہت اچھی ہیں اور ثناء تو بہت محبت کرتی ہے زین سے۔ لیکن بی بی اماں آپ ہی بتائیں کیسے سمجھاؤں زین کو۔ کچھ کہوں گی تو مجھ سے ہی خفا ہوجائے گا۔ کئی دن تک بات ہی نہیں کرے گا۔ جانتی ہیں آپ اسے۔ آج کل تو ویسے ہی موڈ خراب رہتا ہے اس کا۔" زمل کو ڈر تھا کہ وہ کوئی بات کرے گی زین سے، تو وہ خفا ہوجائے گا۔

"ارے جانتی ہوں سب، کیوں ہر وقت تیوریاں چڑھائے رکھتا ہے۔ چلا جائے گا ظفریاب بھی تین چار دن میں پھر خود ہی موڈ ٹھیک ہوجائے گا۔" بی بی اماں کو زین پر بہت غصہ تھا بلکہ وہ دل ہی دل میں اس سے کچھ خفا سی تھیں۔

یہ ولیمے کے چند دن بعد کی بات تھی سب لوگ جہاں زیب بیگ کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اختر بانو اور امان کو صبح واپس جانا تھا۔ ثوبان شاہ ریحان اور نعمان اور شایان کے ساتھ ولیمے اٹینڈ کرکے چلے گئے تھے، جبکہ سب کے اصرار پر اختر بانو اور امان کو چند دنوں کے لیے چھوڑ گئے تھے۔ انہوں نے کمرے میں آج کل اضافی کرسیاں رکھوادی تھیں کہ فارغ ہوکر سب جہاں زیب بیگ کے کمرے میں ہی بیٹھتے تھے۔ وہ قہوہ لے کر آئی تھی تو انہوں نے سنا جہاں زیب بیگ ظفریاب سے کہہ رہے تھے۔

"میرا ارادہ ہے کہ جیسے ہی زمل کے پیپر ختم ہوتے ہیں میں زمل اور آزین کی شادی کردوں کیا تمہارے لیے دوبارہ چند ماہ بعد آنا ممکن ہوگا۔"

"کیوں نہیں ابا جان، ہم آجائیں گے۔" ظفریاب نے اختر بانو کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھے آزین کی طرف دیکھا تھا، جو نگاہیں گود میں رکھے اخبار پر جمائے بیٹھا تھا۔

"سچ دادا جان! بھائی کی شادی ہوگی، میں مہندی پر ویسا ہی ڈریس بنواؤں گی جیسا سحرش آپا اور مہرین آپی نے پہنا تھا۔" ثنا بے حد خوش ہوئی تھی اور آزین کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"کیوں نہیں۔" جہاں زیب بیگ مسکرائے تھے۔

''جیسا دل چاہے بھائی کی شادی میں کپڑے بنوانا۔''

''لیکن ابا جان! جون میں تو بہت گرمی ہوگی۔'' اختر بانو کو پتا تھا کہ زنل جون تک فارغ ہوگی۔

''آگے پیچھے کہیں کرلیں، ستمبر اکتوبر یا پھر مارچ اپریل میں موسم اچھا ہوگا تب اور اگر مارچ اپریل میں بھی ہوجائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ پیپر دیتی رہے گی۔ شادی کے بعد۔ کون سا زنل نے نہیں اور جانا ہے۔ اسی گھر میں تو ہوگی۔''

''لیکن دادا جان! میں ابھی سال دو سال تک شادی نہیں کرنا چاہتا۔''

آزین نے اخبار سے سر اٹھایا تھا۔

''لیکن کیوں۔'' جہاں زیب بیگ ہی نہیں بی بی اماں بھی حیران ہوئی تھیں، جن کے سامنے رحمتی کی رٹ لگائے رکھتا تھا۔

''میری ابھی جاب اسٹارٹ ہوئی ہے اور مجھے ابھی سیٹل میں ہونے میں وقت لگے گا۔ اس سے پہلے میں شادی نہیں کرنا چاہتا۔''

''لیکن تمہارے سیٹل ہونے تک ہم نہ رہے تو۔'' جہاں زیب بیگ افسردہ ہوگئے تھے۔

''تم میرے ساتھ چلو زین! وہاں تمہیں اچھی جاب مل جائے گی اور اگر جاب نہ کرنا چاہو تو میرا اسٹور سنبھال لو۔ تمہارے پاس برٹش پاسپورٹ ہے۔''

ظفریاب امید بھری نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ صبوحی کے ہوتے ہی اس کا برٹش پاسپورٹ بن چکا تھا کہ صبوحی خود برٹش نیشنل تھی اس کی پیدائش یو کے کی تھی۔ وہ جہاں زیب کے اصرار پر پاسپورٹ رینیو کرواتا رہتا تھا، اس کے لیے وہاں جانا کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن وہ جانا ہی نہیں چاہتا تھا سو انکار کردیا۔

''تھینک یو، مجھے یو کے جانے اور آپ کا اسٹور سنبھالنے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور نہ ہی مجھے کسی قسم کی آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ جب میں سمجھوں گا کہ بیوی بچوں کا بوجھ خود اٹھا سکتا ہوں تو رخصتی کروالوں گا۔''

ظفریاب کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔ آنکھیں دھندلی سی ہوگئی تھیں اور تب سے ہی بی بی اماں کو آزین پر تپ چڑھی ہوئی تھی۔

''کیا سوچتے ہوں گے ظفر کہ یہ تربیت کی ہے بی بی اماں نے ان کے بیٹے کی اور یہ سکھلایا ہے جسے جاتے ہوئے وہ ان کے سپرد کرکے گئے تھے۔''

''آپ نے بتایا نہیں بی بی اماں! کیسے سمجھاؤں۔'' زنل نے پوچھا تو انہوں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''کیا بتاؤں۔'' ان کے لہجے میں تھکن سی اتر آئی تھی۔ ''پتا نہیں کتنا غصہ ہے اس کے اندر جو ختم ہی نہیں ہو رہا۔ لڑکیوں کو اتنی ادائیں آتی ہیں۔ منکوحہ ہو اس کی۔ اپنی ایک بات تک نہیں منوا سکتی بس اپنی اماں کی طرح ہی رہیں بدھو اور سادا۔''

اور زنل کو ہنسی آگئی۔

''آپ بھی نا بی بی اماں! کیسی باتیں کرتی ہیں۔''

''ارے غلط نہیں کرتی بات۔ خیر بڑے صاحب کی چائے کا وقت ہوچلا ہے تمہارے لیے بھی بنادوں۔'' انہوں نے ہاتھ میں پکڑا اشار واپس تخت پر رکھ دیا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ تب ہی صحن کا دروازہ کھلا، سحرش اور مرتضیٰ اندر داخل ہوئے۔ مرتضیٰ آج کل ڈیوڑھی والی سیڑھیوں کے بجائے اوپر نیچے آنے جانے کے لیے، صحن والی سیڑھیاں ہی استعمال کرتا تھا۔ سحرش سیڑھیوں کی طرف جانے کے بجائے برآمدے کی طرف بڑھی تھی۔ مرتضیٰ ارباب نے پہلے پوڑے پر قدم رکھتے ہوئے مڑ کر اسے دیکھا۔

''تو وہ بائیک پر زین ہی تھا نا۔''

''جی زین بھائی ہی تھے۔'' سحرش اس کی بات سن کر حیران ہوئی تھی۔

''اور وہ اس کے پیچھے بیٹھی لڑکی، کیا تم اسے جانتی ہو۔ میں تو پہچان نہیں سکا ایک تو اس نے چادر

وہ اپنی کسی غلط یا صحیح بات پر کبھی شرمندہ نہیں ہوتی تھی، بس جو اس کے دل میں آتا تھا کہہ دیتی تھی، اسے پروا نہیں ہوتی تھی کہ اس کی بات کا ردعمل دوسرے پر کیا ہوا ہے بقول مہرین کے وہ اپنی قسم کا واحد پیس تھی، جو ارباب بیگ کے ہاں وارد ہوا تھا۔

"تم تو اپنی دوست کے گھر گئی تھیں۔ اتنی جلدی واپس آ گئیں۔"

زمل کو سحرش پر پیار آ رہا تھا کئی بار اس نے نوٹ کیا تھا کہ یہ لاابالی سی سحرش، کوشش کرتی ہے کہ وہ زین سے بدگمان نہ ہو۔ بھلے اس کے لیے اسے جھوٹ ہی کیوں نہ بولنا پڑے۔ اس کی ان چھوٹی چھوٹی بے ضرر کوششوں نے زمل کے دل میں اس کے لیے ایک خاص جگہ بنا دی تھی۔ یہ الگ بات تھی کہ اس کی یہ ساری کوششیں زمل کے لیے نہیں مہرین کے لیے تھیں۔

"وہ گھر پر نہیں تھی، اپنی نانو کے گھر گئی ہوئی تھی۔ غلطی میری تھی میں جانے سے پہلے فون کر کے پوچھ لیتی۔ اتنے دنوں سے بلا رہی تھی کہ گپ شپ لگائیں گے اور مجھے اس کی منگنی کی تصویریں بھی دیکھنی تھیں۔ خیر۔" وہ کندھے اچکا کر سیڑھیوں کی طرف دیکھنے لگی پھر جیسے اچانک اسے ماہ وش کا خیال آیا۔

"یہ ماہ وش بیگم کو کیا ہوا تھا کہ صبح صبح کس فروٹ کاٹن کاٹنے بیٹھ گئیں۔ اتنا ٹھونس کر تو ناشتہ کیا تھا۔"

"شاید کوئی ڈیزرٹ بنانا تھا اسے۔ رات کو شانزہ اور عقیل بھائی آ رہے ہیں، کل یا پرسوں انہیں دبئی جانا ہے تو تائی جان کہہ رہی تھیں کہ اب آئیں گے تو کھانا کھا کر ہی جائیں گے۔ ایسے تھوڑے ہی جانے دیں گے۔" زمل نے بتایا۔

"ہاں اگر وہ سڑیل مزاج عقیل بھائی راضی ہو گئے کھانے کے لیے رکنے پر تو۔ ویسے ایک سر درد کی گولی ہے تو دے دینا رات کو ضرورت پڑ سکتی ہے۔" سحرش نے برا سا منہ بنایا۔

"کیا اب مستقبل کی خبر بھی ہونے لگی ہے تمہیں۔" زمل مسکرائی۔

"ارے کبھی سنی ہوں نا تم نے ان کی لن ترانیاں۔ دو دو گولیاں کھانی پڑیں۔ قسم سے سر پھٹنے لگتا ہے درد سے۔ آہ میری نازک احساسات رکھنے والی آرٹسٹ مائنڈڈ، ادب کی دلدادہ بے چاری کزن کہاں پھنس گئی۔ زہر لگتا ہے مجھے وہ کھڑوس سا۔" جب کوئی بندہ ایسے پسند نہیں آتا تھا تو وہ ادب آداب سب بھول جاتی تھی۔

"دعا کرو زمل! وہ شوخا، گپ باز کھانے تک نہ رکے۔ ایسی عجیب نظروں سے دیکھتا ہے جیسے نظروں ہی نظروں میں ایکسرے کر رہا ہو سب کے۔ خاص کر لڑکیوں کے۔ اور یوں اکڑ کر بیٹھتا ہے جیسے فرعون بیٹھتا ہوگا۔ اس روز شاہ رخ بھائی نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو دو انگلیوں سے پکڑ کر چھوڑ دیا جیسے سب غلام ہوں اس کے ویسے، آپس کی بات ہے یہ عقیل کی صورت میں فرعون نے ہی تو دوبارا جنم نہیں لیا۔" وہ ہولے سے ہنسی تو زمل بھی مسکرا دی۔

"ویسے یہ تمہارے والے اینگری ینگ مین کا منہ کیوں سوجا ہوا ہے۔ آج کل کیا ظفر چاچو اور آنٹی کی وجہ سے۔ ویسے مجھے تو شانا اور آنٹی بہت اچھی لگی ہیں۔ اور میں نے دل ہی دل میں پروگرام بھی بنا لیا ہے کہ رخسانہ خالہ سے کہتی ہوں کہ بلال کے لیے چاچو سے بات کر لیں۔ دو دو فائدے، ایک تو اتنی پیاری لڑکی مل جائے گی کہ انوسنٹ سی اور جھونگے میں برٹش پاسپورٹ بھی مل ہی جائے گا۔ تم نے دیکھا نہیں تھا۔ دور نزدیک کے رشتہ دار لڑکے سب ثناء کے ارد گرد ہی گھوم رہے تھے کہ شاید دال گل جائے۔ لیکن یہ بلال بے وقوف گدھا اسے ذرا بھی عقل نہیں کہ اپنا تانکا بھی لگا لے بس پھر بھلا کس کو کیا اعتراض ہوتا میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی۔ ثنا بھی بس بونگی سی ہے۔" وہ ایسے ہی بے لاگ تبصرے کرتی تھی۔

"ویسے ملی! ایک بات تو بتاؤ یہ انگلینڈ اور امریکہ پلٹ بچے اتنے بے وقوف اور سادا سے کیوں ہوتے ہیں، ہمارے جیسی چالاکیاں

اور ہوشیاریاں انہیں کیوں نہیں آتیں۔ میری طرح بچے کھرے۔'' اس نے گردن اکڑائی تو زمل کو ہنسی آ گئی۔

''پتا نہیں لیکن سب ایسے نہیں ہوتے۔ ویسے تم بڑی لکی ہو ہر لحاظ سے سادا اور معصوم سی ایک نند جو ابھی سے صدقے واری ہو رہی ہے۔ بھولی بھالی سی اللہ میاں کی گائے ساس، ہاں زین تھوڑا سا کڑوا ہے لیکن جہاں اتنی مٹھاس ہو وہاں تھوڑی سی کڑواہٹ برداشت کر لینی چاہیے بیلنس رہتا ہے۔''

تب ہی صحن کا دروازہ کھلا اور زین کے ساتھ ماہ وش اندر آئی۔ سحرش یک دم کھڑی ہو گئی۔

''کیا زخم زیادہ گہرا تو نہیں تھا اسٹچز لگے۔''

''ہاں دو اسٹچز لگے ہیں۔'' ماہ وش کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ اسے ابھی بھی تکلیف ہو رہی ہے۔

''ہاں اب تم اپنا ہاتھ لے کر بیٹھ جانا ظاہر ہے اس زخمی ہاتھ کے ساتھ تم سے کام تو نہیں ہوگا۔ سب مجھے اور مہرو کو ہی کرنا پڑے گا۔ یہ ہی ہتھکنڈے ہوتے ہیں بھابیوں کے، نندوں نے گھر آنا ہو تو یوں ہی کسی نہ کسی بہانے سے کام سے جان چھڑا لیتی ہیں۔'' اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

''یکومت۔'' ماہ وش نے اسے گھورا۔

''میں تو اماں کی بات سننے لگی تھی بے دھیانی میں کٹے ہوئے حصے پر ہاتھ لگ گیا۔''

''مجھے بتا دینا کوئی کام ہو تو۔'' زمل نے آفر کی تو سحرش کھل اٹھی۔

''نیکی اور پوچھ پوچھ۔ اماں سے پوچھ کر بتاؤں گی کہ کیا مدد چاہیے۔'' وہ مسکراتی ہوئی ماہ وش کے ساتھ سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی تو زمل نے خاموش کھڑے آزین کی طرف دیکھا۔

''کیا سوچ رہے ہو زین! بیٹھ جاؤ نا۔ کتنے سارے دن ہو گئے ہیں سکون اور فراغت سے بیٹھ کر بات کیے ہوئے۔''

''نہیں پہلے تم خدمت خلق کر لو پھر بات کر لیں گے ہم بھی۔'' وہ ناراض ناراض سا کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

''اتنے خفا اور ناراض مت رہا کرو زین! پتا تو ہے تمہیں، شادی، مہمان نوازی، دعوتیں۔ اتنی مصروفیات تھیں کہ فراغت ہی نہیں ملتی تھی۔ پھر یونی ورسٹی جانا، آنا۔ ٹھیک سے پڑھائی بھی نہیں ہو پا رہی تھی تم بتاؤ تمہاری جاب کیسی جا رہی ہے۔''

''اچھی ہے۔ سیلری بھی اچھی ہے لوگ بھی اچھے ہیں۔'' وہ یوں ہی ناراض ناراض سا بولا تھا۔

''آج کیا آفس نہیں جانا تھا۔ چھٹی ہے۔''

زمل اس سے بات کرنا چاہتی تھی اسے لگتا تھا جیسے ان بے حد مصروف شب و روز میں ان کے درمیان اجنبیت سی در آئی تھی۔

''نہیں خود چھٹی لی ہے چچا جان کو سیشن کے لیے لے کر جانا ہے۔ شیخو بابا تو آج تایا جان کے ساتھ فیصل آباد گئے ہوئے ہیں۔ دادا جان نے شاید ان سے بات کی تھی کہ شیخو بابا کو کارخانے میں لگا لیں اور کام سیکھ جائیں تو اچھی اور مناسب تنخواہ دیں انہیں۔''

''یہ تو اچھی بات ہے زین۔'' وہ خوش ہو گئی تھی۔

''ہاں شاید دادا جان نے ظفر چاچو سے بھی بات کی ہے، تب ہی انہوں نے ان سے کہا ہے کہ واپس جا کر وہ رقم بھجوائیں گے تو دکانوں کے اوپر فلیٹ بنوالیں شیخو بابا کے لیے۔ دادا جان میری بات کبھی نہیں بھولتے۔''

''ہوں۔'' وہ سپاٹ چہرہ لیے تخت پر پڑی اس کی کتابوں کو دیکھ رہا تھا۔ ظفر یاب کے ذکر پر اس کے تاثرات یوں ہی سپاٹ ہو جاتے تھے۔

''زین! تم ظفر چاچو سے اپنی ناراضی ختم کر دو اب۔'' زمل کو یاد تھا کہ بی بی اماں نے اسے زین کو سمجھانے کے لیے کہا تھا۔

''میں ناراض نہیں ہوں ان سے۔'' وہ جوتے کی نوک آہستہ آہستہ زمین پر مار رہا تھا۔

''تو پھر ان کے پاس بیٹھتے کیوں نہیں ہو بات

کیوں نہیں کرتے ان سے۔"

"کیا بات کروں میں ان سے ہمارے درمیان ایسا کچھ نہیں ہے جس پر بات کروں۔" وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"بی بی اماں کہتی ہیں سود کھ سکھ ہوتے ہیں کہنے والے۔" زمل نے اس کی طرف دیکھا۔

"ہمارے درمیان دکھ سکھ کہنے والا رشتہ بنا ہی نہیں ملی۔" وہ بے حد افسردہ سا تھا۔

"میں جب ان کے سینے میں سر چھپا کر رونا چاہتا تھا تو وہ میرے پاس نہیں تھے۔ جب میں اسکول میں کوئی انعام جیتنے پر کلاس میں فرسٹ آنے پر اپنی خوشی ان سے شیئر کرنا چاہتا تھا تو وہ نہیں تھے۔ بس مریم چاچی تھیں، دادا جان تھے اور بی بی اماں۔ میں اپنی خوشیاں اور دکھ اپنے اندر ہی دفن کرتا آیا ہوں تو اب کیا کہوں ان سے۔"

زمل چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئی تھی۔

"پھر بھی تم ان کے پاس بیٹھا کرو۔ کوئی نہ کوئی بات نکل ہی آئے گی کرنے کے لیے۔ اکلوتے بیٹے ہو ان کے جی چاہتا ہوگا ان کا کہ تم ان کے پاس بیٹھو باتیں کرو۔ پھر ثنا تمہاری بہن ہے کیا وہ بھی اچھی نہیں لگتی تمہیں۔ بہنیں تو بھائیوں کو بہت پیاری ہوتی ہیں۔ بھائی بہنوں کا مان ہوتے ہیں۔" زمل نے سوچا تھا کہ وہ آج زین کا دل نرم کرنے کی پوری کوشش کرے گی۔

"وہ جتنی دیر میرے پاس بیٹھتی ہے تمہارے متعلق ہی باتیں کرتی رہتی ہے۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ تم سے ڈھیروں باتیں کرے گی اور اپنی دلچسپیاں شوق تمہیں بتائے گی تم سے تمہارے شوق، دلچسپیاں پوچھے گی۔ لیکن تم اتنے سنجیدہ اور خاموش رہتے ہو کہ اس کی ہمت ہی نہیں ہوتی تم سے بات کرنے کی۔ حالانکہ اس کا دل چاہتا ہے کہ وہ تم سے فرمائشیں کرے تم اس کے لاڈ اٹھاؤ۔ تم اس کے بھائی ہو اس کے لیے وہ خود کو کہتی ہے۔"

"وہ مجھے بری کیوں لگے گی زمل! میری بہن ہے۔ اچھی لگتی ہے مجھے بھی۔ لیکن ہم دو سری بار ملے ہیں۔ پہلی بار جب وہ آئی تھی تو چھوٹی سی تھی تو ہمارے درمیان بے تکلفی کیسے ہو سکتی ہے۔" آزین نے اس کی بات دھیان سے سنی تھی، زمل کو خوشی ہوئی تھی۔

"پتا ہے زین! ثنا مجھ سے تمہارے متعلق پوچھتی ہے کہ تم کیسے ہو۔ خوش اخلاق نرم دل ..... سخت مزاج۔"

"اور تم نے کیا بتایا کہ میں کیسا ہوں۔" وہ جو ڈل سا بیٹھا تھا یک دم اس کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوئی۔

"ظاہر ہے جیسے ہو ویسا ہی بتایا۔" زمل کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"مجھے نہیں پتا کہ میں کیسا ہوں تم بتاؤ نا، میں کیسا ہوں۔ کیا کہا تھا تم نے ثنا سے۔" وہ اب بے حد دلچسپی سے پوچھ رہا تھا۔

"میں نے کہا بہت اچھا، نرم دل، ہمدرد سب کا خیال رکھنے والا اور محبت کرنے والا اس جیسا اور کوئی نہیں۔" زمل کی مسکراہٹ گہری ہوئی تھی۔ زین کو صحن میں پھیلی اور برآمدے میں بکھری دھوپ جو کچھ دیر پہلے آنکھوں میں چبھ رہی تھی، اچھی لگنے لگی تھی۔ فضا میں اسے ایک خوش گوار سا احساس بکھرا ہوا محسوس ہوا تھا۔

"کیا واقعی تم نے ثنا سے یہ کہا۔"

"ہاں تو بھلا اس میں جھوٹ کیا ہے۔ تم واقعی بہت اچھے ہو زین۔ سب کا احساس کرنے والے سب سے محبت کرنے والے۔"

"اچھا۔" وہ یک دم چونکا۔

"ذرا میری طرف تو دیکھو۔ یہ سبق تمہیں سحرش نے تو نہیں پڑھایا کہ کبھی کبھی اپنے ہونے والے شوہر محترم کی تعریف کر دیا کرو۔"

"نہیں بھلا وہ مجھے کیوں کچھ سکھائے گی، کیا میں تمہیں نہیں جانتی کہ تم کیسے ہو۔ بلکہ میں تو تمہیں تم سے زیادہ جانتی ہوں۔" وہ حیران ہوئی تھی۔

"دراصل چند دن پہلے وہ مجھے کہہ رہی تھی کہ کبھی کبھی ہونے والی بیوی کو دو چار لفظ اظہار کے بھی دان کر دیا کریں کہ اپنے مرد کے منہ سے نکلے ہوئے یہ چند لفظ I love you (آئی لو یو) اسے مہینوں شانت رکھتے ہیں۔"

"ضرور اس نے یہ کسی کہانی سے پڑھا ہوگا۔" مدھم سی مسکراہٹ زمل کے لبوں پر نمودار ہوئی۔

"اس نے مجھے اس طرح کی کوئی نصیحت نہیں کی لیکن اپنی ڈائری سے ایک اقتباس پڑھ کر سنایا تھا مجھے کہ کبھی بھی ایک دوسرے کو آئی لو یو کہہ کر تجدید کرتے رہنا چاہیے۔"

"ہاں تو پھر کرو نا تجدید۔ آئی لو یو..... کہہ کر۔" آزین کی آنکھوں میں شوخی تھی۔

"کیا ہمیں یہ کہنے کی ضرورت ہے زین۔" زمل لمحہ بھر کو سنجیدہ ہوئی۔

"کیا ہم نہیں جانتے۔"

"ہاں، لیکن وہ سحرش تو کہتی ہے نا تجدید بہت ضروری ہے ورنہ محبت میں دراڑ پیدا ہو جاتی ہے۔" وہ اس طرح شوخی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"یہ سحرش بھی نا۔" زمل بے اختیار ہنس دی۔ اس کے خوب صورت ہونٹوں اور چمک دار دانتوں نے روشنی سی بکھیر دی تھی وہ مبہوت سا ہو کر اسے دیکھنے لگا۔

"تمہاری ہنسی بہت خوب صورت ہے۔ میں نے آج تک ایسی ہنسی کسی کی نہیں دیکھی جو روشنی سی بکھیر دے اور کانوں میں جلترنگ سا بجنے لگے۔ کیا ہنسی کی تعریف کی تجدید کرنے کو بھی سحرش نے کہا تھا۔"

زمل کے ہونٹ ابھی بھی کھلے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں حیا کے رنگوں کی جھلمل سی تھی اور ان رنگوں کا عکس جیسے اس کے رخساروں پر بھی پڑتا تھا کہ وہاں بھی شفق سی بکھری تھی۔

"نہیں یہ میرا دل کہتا ہے کہ جب بھی تم یوں بے اختیار ہو کر ہنستی ہو تو میں اعتراف کروں تمہاری ہنسی بہت خوب صورت ہے۔"

وہ کرسی کی پشت پر کہنی ٹکائے تھوڑا سا اس کی طرف جھکا۔ زمل کی پلکیں جھک گئیں۔ اس نے کئی بار اس کی ہنسی کی تعریف کی تھی۔ آنکھوں میں بے حد اشتیاق لیے وہ کتنے دنوں بعد یوں اس طرح جذب سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی ہیزل براؤن آنکھیں محبت کی کرنوں سے لبریز تھیں۔ برف پگھل رہی تھی۔

"تو کیا صرف میری ہنسی خوب صورت ہے۔ میں نہیں۔" زمل نے ذرا کی ذرا نگاہیں اٹھا کر شرارت سے اسے دیکھا۔

"صرف تمہاری ہنسی نہیں زمل، تمہاری ذات کے سارے موسم، تمہارا بولنا سب کے کام آنا، ہر ایک کا خیال رکھنا۔ تمہارا چلنا، تمہاری پلکوں کا اٹھنا اور گرنا، تمہاری مسکراہٹ، تمہارے چہرے پر بکھری یہ رنگوں کی برسات میں سب کا دیوانہ ہوں اور خاص طور پر تمہارا۔ یہ خوب صورت انمول، نایاب دل جس میں سب کے لیے احساس، محبت اور خلوص ہے۔" اس طرح کا اظہار تو اس نے آج سے پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔ زمل کا دل معمول سے زیادہ تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

"پتا ہے ملی، ان گزرے دنوں میں جب تم ضرورت سے زیادہ مصروف تھیں تو کبھی کبھی مجھے لگنے لگتا تھا جیسے ہم ایک دوسرے کو جانتے تک نہیں ہیں۔ جیسے میں تمہارے لیے اہم نہیں بس تمہارے کام تمہارے لیے اہم ہیں۔"

"ایسا کچھ نہیں تھا زین! یہ تمہارے اپنے وہم تھے۔ مصروفیت ہی بے تحاشا تھی۔ شکر ہے شانزے کے سسرال والوں کی دعوت بھی ہو گئی۔ چاچو بھی دو دن تک چلے جائیں گے تو پھر ساری مصروفیت ختم ہو جائے گی لیکن میرا دل تو ابھی سے اداس ہو رہا ہے۔ چاچو اور ثناء وغیرہ کی وجہ سے کتنی رونق ہے۔ گھر بھرا بھرا سا لگتا ہے۔ اب چلے جائیں گے تو کیسی بے رونقی سی ہو جائے گی نا زین۔" آزین کچھ نہیں بولا تو لمحہ بھر بعد زمل نے پوچھا۔

"زین تم چاچو کو ایئرپورٹ چھوڑنے جاؤ گے نا۔"

"میں کیا کروں گا جا کر۔" اس کی سوالیہ نظریں زمل کی طرف اٹھیں۔

"بھنگڑا ڈالنا جا کر۔" وہ جل کر بولی تو وہ ہنس دیا۔

"ٹھیک ہے تم کہتی ہو تو بھنگڑا ڈالنے چلا جاؤں گا ایئرپورٹ پر۔"

"تم انہیں سی آف کرنے جاؤ گے تو وہ خوش ہو جائیں گے۔ تم انہیں لینے بھی تو نہیں گئے تھے تو۔ اب چلے جانا۔" وہ سنجیدہ تھی۔

"کیا انہوں نے کبھی میری خوشی کا خیال کیا، جو میں ان کی خوشی کے لیے احمقوں کی طرح رخصت کرنے چلا جاؤں۔ بچے تو نہیں ہیں نا ٹیکسی پر چلے جائیں گے۔" وہ یوں ہی اچانک تلخ ہو جاتا تھا۔ زمل نے تاسف سے اسے دیکھا۔

"اچھا چلا جاؤں گا، نا اب اس طرح تو نہ دیکھو۔"

اسے احساس ہوا تھا کہ زمل کو اس کی بات سے دکھ ہوا ہے۔

"اب ان کی سزا ختم کر دو زین!" زمل کو پھر خیال آیا تھا کہ بی بی اماں نے اسے زین کو سمجھانے کے لیے کہا تھا۔

"کیسی سزا زمل! انہیں بیوی مل گئی ہے۔ شاید پہلی بیوی سے زیادہ خوب صورت اور اچھی۔ لیکن مجھے تو مان نہیں ملی۔ سزا تو میں کاٹ رہا ہوں ملی۔" وہ بے حد افسردہ سا تھا۔ اس نے ماتھے پر آئے سلکی بالوں کو دائیں ہاتھ سے پیچھے کیا۔

وہ سمجھ رہا تھا کہ زمل چاہتی ہے کہ اس کے اور ظفریاب کے درمیان جو سرد مہری ہے وہ ختم ہو جائے۔ وہ خود بھی اجنبیت کی اس دیوار کو گرا دینا چاہتا تھا لیکن کوئی تکلیف دہ احساس اسے ان کی طرف بڑھنے سے روک دیتا تھا۔ زمل افسردہ سی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ آزین کی ایسی باتیں اسے ہمیشہ دکھی کر دیتی تھیں۔ وہ اداس ہو جاتی تھی اور وہ دل ہی دل میں عہد کرتا تھا کہ اب کبھی زمل کے سامنے، ایسی بات نہیں کرے گا لیکن پھر کچھ نہ کچھ کہہ بیٹھتا۔

"زمل۔" وہ ابھی تک کرسی کی ہتھی پر کہنی ٹکائے تھوڑا سا آگے کو جھکا ہوا تھا۔

"میں تمہاری محبت، دوستی اور خلوص پر نازاں ہوں۔ تم کیسے میری ذات کے گرد چھائے اداسی کے بادلوں کو ہٹا دیتی ہو۔ تم میرے آسمان پر چمکنے والا سب سے روشن ستارہ ہو زمل آئی لو یو۔ اب تم بھی تو کہہ دو لگتا ہے سحرش کی نصیحت کا تم پر کوئی اثر نہیں ہوا۔"

وہ مسکرایا۔ "آئی لو یو زین۔" وہ مسکرائی۔ وہ جانتی تھی ایسا کہنا ضروری نہیں لیکن پھر بھی وہ چاہتا تھا وہ کہے تو اس نے کہہ دیا تھا۔

"تھینک یو زمل۔" وہ سیدھا ہو گیا۔ لیکن نگاہیں اب بھی اس پر تھیں۔ محبت لٹاتی نثار ہوتی نگاہیں۔

"زین۔" اس کے اس طرح دیکھنے سے گھبرا کر زمل نے اسے مخاطب کیا۔

"تمہیں پتا ہے نا میں نے آج مارکیٹ جانے کے لیے چھٹی کی ہے۔ تو تم بھی گھر ہو تو بی بی اماں کے بجائے تم ساتھ چلے چلنا۔ مجھے ثنا اور آنٹی کے لیے گفٹ خریدنا ہے۔ ویسے تو تمہیں بھی کچھ گفٹ لینا چاہیے چھوٹی بہن کے لیے۔"

"او کے میم..... جو حکم۔" اس نے سر خم کیا۔ اس کی آنکھوں میں اب وہی نرمی اور خلوص کی جگمگاہٹ تھی جو ہمیشہ ہوتی تھی۔ سرد مہری کی برف پگھل گئی تھی۔

"میں ڈاکٹر ارسلان کی طرف سے واپس آتا ہوں تو چلتے ہیں تم تیار رہنا بلکہ مجھے پہلی تنخواہ ملی ہے کل تو سب کے لیے گفٹ لینے ہیں مجھے۔"

تب ہی جہاں زیب اپنے کمرے سے باہر نکل کر ان کی طرف آئے۔

"زیبی کو آج ڈاکٹر کی طرف جانا تھا تو کب تک جانا ہے۔"

"بس دادا جان! آدھے پونے گھنٹے تک نکل جاتا ہوں۔" اس نے کلائی موڑ کر وقت دیکھا اور کھڑا ہو گیا۔

"میں دیکھوں چچا جان جاگ گئے ہوں تو انہیں جانے کا بتاؤں۔"

شاہ زیب اب ضد نہیں کرتے تھے خاموشی سے جانے کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔ زیادہ تر شیخو بابا کے ساتھ جاتے تھے اور کبھی کبھار زین لے جاتا تھا۔ وہ پہلے سے کچھ بہتر تھے۔ تھوڑا بہت کھا پی بھی لیتے تھے۔ شادی کے ہنگامے کی وجہ سے کچھ ڈسٹرب رہے تھے لیکن پھر ڈاکٹر ارسلان نے کچھ دواؤں کی ڈوز بڑھا دی تھی کچھ کم کر دی تھیں تو اب پرسکون تھے۔

"ظفریاب کب تک واپس آئیں گے زمل! کچھ بتا کر گئے ہیں۔" ظفریاب ناشتے کے بعد عارفہ اور ثناء کے ساتھ اپنے سسرال گئے ہوئے تھے۔

"عارفہ آنٹی کہہ رہی تھیں کہ لنچ کر کے آئیں گے۔ بیٹھیں دادا جان، یہاں دھوپ کی ہلکی تپش ہے اچھی لگ رہی ہے۔ آپ کے کمرے میں تو ٹھنڈ ہے بہت۔" اس نے اپنی کتابیں سمیٹ کر ان کے بیٹھنے کے لیے جگہ بنائی۔

"پڑھائی ہو رہی تھی۔" وہ پاس ہی بیٹھ گئے تھے۔

"نہیں..... بس ارادہ تو تھا پڑھنے کا لیکن پھر دل ہی نہیں چاہا۔ ایسے ہی سکون سے بیٹھنا اچھا لگ رہا تھا۔ اور دادا جان! مجھے آج زین کے ساتھ مارکیٹ جانا ہے آپ مجھے بتا دیجیے گا کیا کیا لانا ہے۔"

"بس تینوں کے لیے سوٹ ہی لانے ہیں اچھے سے ریڈی میڈ ہی لینا۔ وہاں کہاں سے سلوائیں گے۔ زین اور ظفریاب کا ناپ ایک ہی ہے۔" وہ عید سے پہلے ظفریاب کے لیے یہاں سے ہی کپڑے بھجواتے تھے۔

"ثنا اور عارفہ سے پوچھ لیا تھا ناپ وغیرہ۔"

"جی۔"

"ظفریاب کے لیے کچھ کتابیں بھی میں نے منتخب کر رکھی تھیں۔ اگر وقت مل گیا تو وہ بھی لیتے آنا۔ میں نے فہرست بنا دی تھی۔"

چاروں بھائیوں میں سے صرف ظفر ہی ایسے تھے، جنہیں جہاں زیب بیگ کی طرح کتابوں سے محبت تھی۔ بہت اعلیٰ ادبی ذوق رکھتے تھے۔ وہ۔

"جی دادا جان! ہمیں مال پر بھی جانا ہے وہاں سنگ میل سے جو مل گئیں وہ لے لیں گے۔"

"وقت بھی اتنی جلدی گزر جاتا ہے کہ پتا ہی نہیں چلتا۔ لگتا ہے جیسے ابھی کل ہی ظفریاب آئے تھے اور اب جانے کا وقت بھی آ گیا۔" وہ بے حد دل گرفتہ اور افسردہ لگ رہے تھے۔

"تو دادا جان! آپ ان سے کہیں نا وہ یہاں ہی رہ جائیں۔ کتنی رونق سی ہو گئی ہے نا ان کے آنے سے۔" اس نے جہاں زیب بیگ کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

"کیسے کہوں میں نے ہی تو اسے کہا تھا جانے کے لیے کہ موقع مل رہا ہے تو چلا جائے۔ وہ کب جانا چاہتا تھا۔ عارفہ کا بھائی تو اس کی شادی کے بعد سے ہی کہہ رہا تھا کہ وہ لوگ وہاں چلے آئیں۔" پہلی بار جہاں زیب بیگ بتا رہے تھے۔

"صبوحی کے جانے کے بعد کچھ سیاسی پارٹیاں اسے پھر اپروچ کرنے لگی تھیں پارٹیوں کی ضرورت ہوتے ہیں اس طرح کے جذباتی لوگ، جنہیں وہ قربانی کا بکرا بنا سکیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ہم پھر کسی ایسی صورت حال سے دوچار ہوں اور پھر ان دنوں میں نے کچھ مشکوک طرح کے لوگ اپنے گھر کے آس پاس دیکھے تھے۔ وہ ظفریاب کے متعلق پوچھ رہے تھے تو بس پھر میں نے اسے مجبور کیا کہ وہ یو۔ کے جا کر سیٹل ہو جائے۔ عارفہ کے بھائی نے اسے وہاں سیٹ ہونے میں مدد دی تھی۔"

"آپ نے زین کو کبھی بتایا کہ چچا جان سے آپ نے کہا تھا جانے کو۔" وہ کبھی انہیں چچا جان اور کبھی چاچو کہنے لگی تھی کہ اکثر کنفیوژن سا ہو جاتا تھا کہ

وہ کس کی بات کر رہی ہے ارباب تایا کی یا ظفریاب کی کہ وہ دونوں کو ہی چھوٹے تایا کہتی تھی۔ بی بی اماں نے ٹوکا بھی تھا کہ ظفر تمہارے تایا ہیں۔ تایا کہا کرو لیکن اسے چاچو یا چچا جان کہنا اچھا لگنے لگا تھا۔

"بتایا تھا لیکن شاید اس نے یقین نہیں کیا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ میں باپ کی طرف سے اس کا دل صاف کرنے کے لیے کہہ رہا ہوں۔" وہ کچن کی طرف دیکھنے لگے جدھر سے بی بی اماں چائے کے دو کپ چھوٹی ٹرے میں رکھے باہر نکلی تھیں اور پھر انہیں وہاں ہی بیٹھا دیکھ کر پوچھ رہی تھیں کہ وہ چائے ادھر ہی لے آئیں انہوں نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"مجھے لگتا ہے دادا جان، زین کے دل پر جمی ناراضی کی برف پگھلنے لگی ہے۔ چچا جان بھی تو سالوں بعد آتے ہیں اگر ہر سال چھٹیوں میں وہ آیا کرتے تو یہ سرد مہری کی برف کب کی پگھل چکی ہوتی۔" زمل نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو زمل! لیکن جب وہ پچھلی بار آیا تھا تو بہت مایوس ہو کر گیا تھا۔ زین خفا تھا بھائیوں کے پاس وقت نہیں تھا۔ یہ وہی بھائی تھے ظفریاب جن پر جان چھڑکتا تھا۔ اب بھی یہ ہی حال ہے۔ ظفر نے کتنی بار کہا ارباب سے کہ کسی روز جلدی کارخانے سے آجائیں تو گپ شپ لگائیں گے پرانے دوستوں سے اکٹھے ملنے جائیں گے۔ ظفر اور ارباب اوپر تلے کے تھے تو بہت دوستی تھی ان کی۔ لیکن اب دو دن رہ گئے ہیں اس کے جانے میں اور ارباب کارخانے سے آتا ہے تو تھکا ہوا ہوتا ہے۔ سلام کر کے اوپر چلا جاتا ہے۔ کون جانے دوبارا زندگی میں ملاقات ہو یا نہ ہو۔" آنکھوں میں نمی پھیل گئی جسے انہوں نے ہاتھوں کی پشت سے صاف کیا۔

"ایسا ہی ہوتا ہے بڑے صاحب!" بی بی اماں نے ٹرے تخت پر زمل اور جہاں زیب بیگ کے درمیان رکھا۔

"ماں کے چولھے پر جب سب بہن بھائی اکٹھے ہوتے ہیں تو بہت محبتیں ہوتی ہیں۔ ایک دوسرے کی ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھتے ہیں لیکن جب چولھے الگ ہوتے ہیں تو محبتیں بھی تقسیم ہو جاتی ہیں، یہ ہی دستور زمانہ ہے محبتیں تقسیم ہوتی ہیں ختم نہیں ہوتیں بڑے صاحب، ارباب صبح جاتے ہوئے ظفریاب سے کہہ گئے تھے کہ آج وہ جلدی آنے کی پوری کوشش کریں گے۔"

"پتا نہیں۔" جہاں زیب بیگ نے چائے کا کپ اٹھایا۔

"ایسا وعدہ تو کئی دنوں سے کر رہا ہے وہ۔" انہیں یقین نہیں تھا لیکن وہ شاہ رخ کو سارا کام سمجھا کر عصر سے کچھ پہلے ہی آ گئے تھے۔ اور عصر کی نماز کے بعد سے ہی سب ہی دادا جان کے کمرے میں بیٹھے تھے۔ زمل اور ثنا کارپٹ پر فلور کشن پر بیٹھی تھیں جو ثنا ڈرائنگ روم سے اٹھا لائی تھی۔ ظفریاب جہاں زیب بیگ کے پاس ہی ان کے بیڈ پر بیٹھے تھے۔ آزین، مرتضیٰ اور ارباب کرسیوں پر تھے۔ درمیانی ٹیبل پر کچھ دیر پہلے ہی بی بی اماں نے دوسری بار آ کر چائے رکھی تھی۔ ارباب اپنی اور ظفریاب کی مشترکہ شرارتوں کے قصے سنا رہے تھے۔ زمل نے پہلی بار ارباب تایا کو یوں ہنستے ہوئے دیکھا تھا۔

"یہ ظفر تو شروع دن سے ہی انقلابی تھا نئی نئی باتیں سوچتی تھیں اسے۔"

انہوں نے محبت سے ظفر کی طرف دیکھا۔

"جب میں فرسٹ ایئر میں تھا اور یہ میٹرک میں تو ایک بار اس نے تھرل کے لیے فلم کا آخری شو دیکھنے کا پروگرام بنایا۔ اماں جان کو اس نے اپنی سازش میں شامل کر لیا تھا کہ سونے سے پہلے وہ مجھ اور ڈیوڑھی کے دروازے کی کنڈی اندر سے کھول دیں گی۔ اب اماں جان کو بھی اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ بارہ بجے کے بعد واپسی ہو گی کہ آخری شو نو بجے سے بارہ تک تھا اور ابا جان کا حکم تھا کہ مغرب کے بعد کوئی گھر سے باہر نہیں رہے گا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

نورین زہرہ

چند لقموں کی خاطر

بات تو بڑی حیران کن بلکہ پریشان کن تھی کہ اباجان نے ناشتہ کی میز پر اذلان کو ایک زوردار تھپڑ رسید کر دیا اور وہ پانچ سالہ معصوم بچہ حیرت کے مارے رو بھی نہ سکا۔ صدمے کی شدت سے اس بے چارے کی آواز کہیں گلے میں ہی گھٹ کر رہ گئی تھی کہ اس کے پیارے دادا جان جنہوں نے کبھی ان سے اونچی آواز میں بات تک نہیں کی تھی وہ جوانی پیاری اور اکلوتی بہو سے ان دونوں بچوں کو ڈانٹنے کی وجہ سے دو دو دن تک بات نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے سختی سے سب کو حکم دیا ہوا تھا کہ یہ دونوں بچے جب بھی کوئی شرارت کریں تو ان کے دادا جان کو بتا دیا جائے، وہ خود ہی ان بچوں کو سمجھا لیں گے لیکن ان کو مارنا نہیں ہے اور آج انہوں نے اپنے پیارے پوتے کو تھپڑ رسید کر دیا، جبکہ اس سے چھوٹا تین سالہ عبداللہ حیران کن نظروں سے کبھی اپنے دادا کو دیکھتا اور کبھی اپنے روتے ہوئے بھائی کو۔

اس کو تھپڑ لگا کر وہ ایک دم ناشتے کی میز سے اٹھے اور تیز قدموں سے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ ان کا بیٹا آفس کے لیے تیار ہوتا ہوا بڑے مصروف انداز میں اپنے کف لنکس بند کرتا ہوا ناشتے کی میز کی طرف آ رہا تھا۔ اباجان کو اس طرح تیزی سے اپنے کمرے میں جاتا دیکھ کر حیرانی سے وہیں کھڑا رہ گیا۔ اس کی بیوی چائے کپوں میں انڈیلتی ہوئی، وہیں کی وہیں رک گئی اور اماں جان اپنے گال پر ہاتھ رکھ کر حیرت سے بیٹھی ہوئی تھیں، ایسا لگتا تھا کہ پورا گھر جیسے حیرت سے منجمد ہو گیا۔

پھر کچھ دیر میں اماں جان نے روتے ہوئے بچے کو چپ کروایا اور سب کی توجہ ناشتہ کی طرف مبذول کرائی۔ جب سب نے ناشتہ کر لیا اور ان کا بیٹا دفتر اور اذلان اسکول روانہ ہو گئے تو ان کی بہو اباجان کی ناشتہ کی ٹرے تیار کر کے، اباجان کے کمرے میں لے جانے لگی۔ اماں جان نے اس کے ہاتھ سے ٹرے لے لی اور کمرے میں لا کر میز پر رکھی۔

اباجان آرام دہ کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے اور کمرے کی کھلی کھڑکی سے ان کی نظریں آسمان پر اڑتے ہوئے پرندوں پر لگی ہوئی تھیں۔ ناشتہ کے برتن میز پر رکھنے کی آواز پر بھی وہ متوجہ نہ ہو سکے تو آخر اماں جان نے اس خاموشی کو توڑا۔

”میں پوچھتی ہوں کہ اتنی سی بات پر آپ نے بچے کو کیوں مارا۔“ وہ اپنے شوہر سے مخاطب اباجان آسمان پر نا جانے تلاش کرتے ہوئے سالوں پہلے کے ایک منظر میں کھو گئے۔

نومبر کے مہینے میں آسمان غبار آلود سا لگ رہا تھا۔

کپاس کے چاروں طرف پھیلے ہوئے سرسبز کھیتوں میں نظر آتے ہوئے پودوں میں، کپاس برف کے گالوں کی طرح نظر آتی تھی۔ بہت سی عورتیں مخصوص انداز میں کپاس چننے کا کپڑا باندھے نہایت مصروف انداز میں، کپاس چننے میں لگی ہوئی تھیں۔ ان کے ہاتھ تیزی سے کپاس چننے میں لگے ہوئے تھے، وہ تیزی سے ایک بوٹے کی طرف آتیں اور کھینچنے کے سے انداز میں کپاس نکالتیں اور آگے بڑھ جاتیں۔

اکرام علی عرف اکو بھی اسکول کی چھٹی کے بعد

تیزی سے گھر کی طرف قدم اُٹھاتا جا رہا تھا۔ کچی سڑک کے ساتھ ہی کپاس کے کھیت میں اسے اپنی ماں کپاس چنتی ہوئے نظر آ گئی وہ جو صبح سے اپنی بڑھتی ہوئی بھوک کو تھپک تھپک کر سلا رہا تھا، وہ بھوک ماں کو مزدوری کرتے دیکھ کر جاگ اٹھی۔

صبح بھی وہ پتلی پانی جیسی چائے اور رات کی بچی ہوئی روٹی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا کھا کر اسکول گیا تھا۔ اس دفعہ بھی ہر سال کی طرح ان کی گندم سردیوں کے آغاز میں ہی ختم ہو گئی تھی۔ اب ان کو دوسری ضروریات کی چیزوں کے ساتھ ساتھ آٹا بھی خریدنا پڑتا اور ابھی بھی اس کے معصوم دل میں روٹی ملنے کی امید دم توڑ رہی تھی کہ ماں کو مزدوری کرتے دیکھ کر وہ امید ایک دم جاگ اٹھی تھی۔

تفریح کے وقت اس کا دوست نبیل، آلو سے روٹی کھا رہا تھا تو اس کو بھی تھوڑی سی روٹی اور آلو کا سالن کھلا دیا تھا، جس کا ذائقہ ابھی تک وہ اپنی زبان پر محسوس کر رہا تھا۔ یہ غریبوں کا علاقہ اور غریبوں کا اسکول تھا جس میں تفریح کے وقت، زیادہ تر گھر سے لائی روٹی کھاتے یا پھر ایک آنے کے آلو چھولے اور ریوڑیاں کھاتے۔ وہ بھی پہلے ایسے ہی اسکول روٹی لے جاتا یا پھر کبھی کبھار ایک آنہ لیکن جب سے ابا کی فیصل آباد میں مزدوری کے دوران اونچائی سے گر کر ٹانگ ٹوٹی تھی اور ابا گھر بیٹھ گیا تھا تو اس وقت سے گھر میں روٹیوں کے لالے پڑ گئے تھے۔

اس نے اپنی سات سالہ زندگی میں اپنے گھر میں روٹی سے ہی ہر خوشی ہر غم منسوب دیکھا تھا اس لیے اسے بچپن سے ہی روٹی کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو گیا تھا۔

ان ہی سوچوں میں گم وہ ماں کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا، ماں نے اسے پیار سے گلے لگا کر کہا۔

”بھک (بھوک) لگی اے پتر!“ اس کے جواں عمری میں ہی بڑھاپے کی طرف ڈھلتے چہرے پر مامتا کا نور پھیلا ہوا تھا۔

کچھ دیر میں وہ اور اس کی ماں خوشی خوشی کھیت سے پیسے لے کر بازار کی طرف جا رہے تھے۔

چکی سے آٹا اور دکان سے گھی لے کر وہ دونوں تیز قدموں سے گھر پہنچے، راستے میں ماں نے اسے ایک پھیری والے سے پتیسا بھی لے کر کھلایا تھا۔

گھر پہنچے تو ڈھلتی ہوئی شام میں، آگ والی کوٹھری میں اکو کی تینوں بڑی بہنیں چولہے کے گرد خاموش بیٹھی ہوئی تھیں اور ابا کسی گہری سوچ میں گم حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ ان کی نگاہیں بجھتی ہوئی آگ کے انگاروں پر جمی ہوئی تھیں۔ انہوں نے نزدیکی کھیت سے ساگ توڑ کر پکا لیا تھا لیکن تڑکہ لگانے کو گھی نہیں تھا۔

جب اکو اور ماں گھر پہنچے تو سب ایسے اپنی جگہ سے حرکت میں آ گئے، جیسے کسی نے جادو کی چھڑی سے سوئے ہوئے محل کو جگا دیا ہو۔ کوئی پھکنی سے آگ کو پھونکیں مارنے لگا، کوئی بہن آٹا گوندھنے لگی اور کوئی ساگ کو تڑکہ لگانے کے لیے لہسن چھیلنا شروع ہو گئی اسی وقت اس کے سب سے بڑے بھائی

pklibrary.com

نے گھر میں آ کر سائیکل کھڑی کی کھانے کی تیاری کے سلسلے میں ہونے والی چہل پہل سے اس کے تھکے ماندے چہرے پر بھی رونق چھا گئی تھی۔

ننھے سے اکو کے دل میں بس یہ ہی بات آئی کہ سب کے چہروں پر مسکراہٹ اور خوشی روٹی کی وجہ سے ہے۔

وہ اکثر سوچتا رہتا کہ روٹی کے یہ چند لقمے انسان سے کیا کیا کام کرواتے ہیں اور غریب تو جیتا اور مرتا بھی ان چند لقموں کی خاطر ہے۔

جیسے اکو کا بڑا بھائی زاہد ان چند لقموں کی خاطر پردیس جا رہا تھا۔ زاہد گاؤں کے اسکول سے مڈل تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد زمین دار کے پاس اس کے منشی کے مددگار کی حیثیت سے نوکری کرنے لگا تھا۔ اس کو کام پر لگے ابھی تین مہینے ہی گزرے تھے کہ زمین دار کا بیٹا لندن سے واپس آ گیا۔ اس کو گھوڑوں کی ریس کا بہت زیادہ شوق تھا، اس کے پاس بہت سے گھوڑے تھے زاہد کو بھی بچپن سے ہی گھوڑوں کی دیکھ بھال میں بہت دلچسپی تھی۔

ابا کو بھی کسی وقت میں گھوڑے رکھنے کا شوق تھا۔ بچپن میں زاہد زیادہ تر وقت ابا کے گھوڑے کے ساتھ ہی گزارتا تھا۔

زاہد جب بھی کام سے فارغ ہوتا تو زیادہ تر وقت، محسن صاحب کے گھوڑوں کے ساتھ گزارتا جبکہ ان کے اسپیشل ریس والے گھوڑے، جس کا نام محسن صاحب نے جیکی رکھا ہوا تھا زاہد کو محبت ہو گئی تھی۔ وہ جیکی کو تیز رفتاری سے بھگانے کے لیے، منہ سے ہیجان انگیز آوازیں نکالتا اور اچھل اچھل کر اس کو اور تیز بھاگنے کی ترغیب دلاتا۔

محسن صاحب کو اس کی جیکی سے محبت، مسکرانے پر مجبور کر دیتی۔ عام زمین داروں کی طرح وہ ظالم اور سخت نہیں تھے، شاید اس کی وجہ یہ بھی کہ انہوں نے اپنی زندگی کا زیادہ عرصہ ملک سے باہر گزارا تھا اور وہ اس جاگیردارانہ نظام سے دور رہے تھے۔ باہر سے واپسی پر ان کے ساتھ ان کی انگریز بیگم مریم بھی، جس کا پہلے نام لیزا ہوا کرتا تھا اور ان کا دو سال کا بیٹا بخت آور تھا۔

ایک دن محسن صاحب، زاہد کو گھوڑوں کی ریس میں لاہور لے گئے، جب جیکی میدان میں بھاگنے کے لیے آیا تو زاہد نے اس کی محبت سے پیٹھ تھپتھپائی اور جب ریس شروع ہوئی تو اس نے کوئی مخصوص آواز نکالی جس کو سننے کے بعد جیکی نے تیزی سے بھاگنا شروع کر دیا، محسن صاحب ایک سولہ سالہ نوجوان کی ایک گھوڑے سے محبت دیکھ کر حیران رہ گئے پھر وہ ہوا جس کی امید نہیں تھی، یعنی کہ جیکی جس پر محسن صاحب نے بہت محنت کی تھی، بھاری فیس پر کئی ٹرینرز سے اس کی ٹریننگ کروائی تھی لیکن جیکی کبھی اول نمبر پر نہیں آ سکا تھا، آج ایک ناتجربہ کار نوجوان کی توجہ اور پیار کی وجہ سے اول انعام حاصل کر گیا تھا۔

اس کے بعد محسن صاحب کی زاہد پر خاص نظر کرم ہو گئی تھی، انہوں نے اچھی خاصی رقم تنخواہ کی مد میں زاہد کو دینی شروع کر دی تھی، گھر میں خوش حالی آنے لگی تھی اس کے بعد محسن صاحب نے مزید گھوڑے ریس میں دوڑنے کے لیے خریدے اور ان گھوڑوں کو زاہد ہی سدھانے لگا تھا۔ محسن صاحب ملک بھر میں مشہور ہو گئے تھے پھر انہوں نے واپس لندن جانے کا ارادہ کیا۔ وہ اپنے بیٹے کو وہیں سے تعلیم حاصل کروانا چاہتے تھے اور اپنا گھوڑوں کی ریس کا کاروبار بھی وہیں جمانا چاہتے تھے۔ زمینوں کو دیکھ بھال کے لیے ان کا اکلوتا چھوٹا بھائی موجود تھا۔ وہ زاہد کو بھی ساتھ لے گئے۔

پھر اس کے بعد حالات نے پلٹا کھایا زاہد مستقل طور پر لندن میں سیٹ ہو گیا اور شادی بھی وہیں ایک مسلمان لڑکی سے کر لی، بس کبھی کبھی سال دو سال کے بعد پاکستان چکر لگا لیتا، ہاں پیسوں کی بھاری سی گڈی باقاعدگی سے بھجتا رہتا وہاں جا کر وہ کچھ عرصہ تک محسن صاحب کے ساتھ کام کرتا رہا پھر

ایک دوست کے ساتھ مل کر ایک کاٹی شاپ بنالی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی قسمت کا ستارہ چمک اٹھا۔ اور اس کے کاروبار نے بہت ترقی کرلی ساتھ ہی یہاں پاکستان میں اس کے گھر والوں نے بھی کچھ سالوں میں لاہور میں ایک عالی شان مکان بنا لیا تھا۔ اب ابا کو کوئی فرید آرائیں نہیں کہتا تھا بلکہ اب لوگ چوہدری غلام فرید کہتے تھے۔ بیٹیوں کی اچھی جگہ پر شادیاں کرنے کے بعد بہت شان و شوکت سے رہتا اور یہ شان و شوکت اس دن اور بھی بڑھ گئی۔ جس دن اس کے گھر کے صدر دروازے پر اس کے چھوٹے بیٹے کے نام کی بیرسٹر چوہدری اکرام والی تختی لگی۔

وہ ننھا کو جو اسکول میں تفریح کے اوقات میں بھی جماعت میں بیٹھ کر پڑھتا رہتا تھا وہ اعلا تعلیم حاصل کرنے کے بعد اونچے مقام پر پہنچ چکا تھا۔ دنیاوی طور پر بھی اور دینی طور پر بھی غریبوں کی مدد کرنا اللہ کا شکر ادا کرنا اور زندگی کے ہر معاملے میں خدا کے خوف کو مدنظر رکھنا یہ اس گھرانہ کی کامیابی کی کنجی تھی۔

سب سے بڑھ کر رزق کا احترام کرنا اور قدر کرنا۔ اگر زمین پر کوئی روٹی کا ٹکڑا یا کھانے کی کوئی چیز گرے ہوئے دیکھتا تو اس کو ایک طرف رکھ دینا کہ پیروں میں نہ آئے، غریبی کے دنوں میں چند لقموں کی خاطر تکلیف اٹھانے کی وجہ سے اس میں رزق کی قدر آگئی تھی اور رزق کی قدر ہی ان کے لیے رزق کی کشادگی کا راستہ کھول گئی تھی۔

پھر وقت بہت آگے بڑھ گیا اماں اور ابا جی آگے پیچھے دنیا سے رخصت ہوگئے۔ مرنے سے پہلے ان کی سب سے بڑی خواہش فریضہ حج کی اللہ تعالیٰ نے پوری کردی تھی، پھر ان ہی دنوں زاہد کے بیمار ہونے کی خبر ملی وہ گردوں کے عارضے میں مبتلا ہو گیا تھا۔

اکرام نے لاکھ اس کو پاکستان واپس آنے کا کہا لیکن اس کے دونوں بیٹے اور ایک بیٹی سمیت اس کی بیوی، اس بات کے لیے راضی نہ ہوئے، ان کا کہنا تھا کہ ان کے والد کا یہاں زیادہ بہتر علاج ہو رہا ہے۔

پھر ایک ویران شام کو زاہد کی موت کی خبر اس تک پہنچی، چند لقموں کی خاطر پردیس جانے والے زاہد کو اپنے وطن کی قبر کی مٹی بھی نصیب نہ ہو سکی تھی۔ ان لقموں کی قیمت کل کے اکو اور آج کے دادا جان سے زیادہ کون جان سکتا ہے۔ بہرام ان کا اکلوتا بیٹا، جو شادی کے چودھویں برس پیدا ہوا تھا، اس وقت جبکہ روبینہ جو ان کے دوست کی بہن اور ان کی محبت تھی۔ بچوں کی طرف سے ناامید ہو چکے تھے پھر بہرام نام کا پھول ان کے سونے آنگن میں کھلا۔

بہرام ان دونوں کو دل و جان سے پیارا تھا ایک تو وہ سالوں بعد پیدا ہوا تھا اور دوسرا اس کے بعد کوئی اور اولاد نہیں ہوئی۔ پھر کہتے ہیں ناں کہ اصل سے سود پیارا ہوتا ہے۔ سو دادا جان بھی ان دونوں پوتوں کو جان سے بڑھ کر عزیز رکھتے، کبھی ان سے اونچی آواز سے بات تک نہیں کی لیکن جب آج اس پیارے پوتے نے اپنے سامنے رکھی ہوئی پراٹھے کی پلیٹ غصے میں آکر زمین پر دے ماری تو وہ نا جانے کیوں اپنے آپ کو کنٹرول نہ کر سکے اور بچے پر ہاتھ اٹھا دیا کہ ان چند لقموں کی خاطر، انسان سو تکلیفوں کا سامنا کرتا ہے اور اسی کی بے قدری کرے یہ کیسے ممکن ہے۔

رزق کی یہ بے ادبی دیکھ کر ان کو غصہ آگیا تھا اور اب دل دکھ رہا تھا کہ اس معصوم بچہ پر ہاتھ کیوں اٹھایا، اچانک وہ ایک نئے عزم سے اٹھے اپنے پوتے کو آغوش شفقت میں بھرنے کے لیے کہ اب ان کو پیار سے رزق کی قدر و قیمت کے بارے میں بتانا ہے، کمرے سے باہر جاتے ہوئے دادی نے ان کو مسکرا کر دیکھا۔

☆☆

مریم عزیز

دستورِ وفا

گیٹ کھول کر انہوں نے طائرانہ نظر صحن میں ڈالی اور دھیرے دھیرے قدم لاؤنج کی طرف بڑھائے۔ دروازہ کھلتے ہی گہری خاموشی نے ان کا استقبال کیا تھا جو انہیں کسی تماشے کا پیش خیمہ لگی کیونکہ عام حالات میں یہاں محفل جمی رہتی تھی۔ انہوں نے بے اختیار گہرا سانس لے کر دروازہ بند کیا اور اسی خاموشی کے ساتھ سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے۔

اندر داخل ہوتے ہی ان کی پہلی نظر صوفے پر سکڑی سمٹی انابیہ پر پڑی اس کا سرخ چہرہ اور سوجی آنکھیں دیکھ کر ان کے چہرے کا رنگ تیزی سے بدلا تھا۔ انہیں دیکھ کر وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پر لا کر انہیں دیکھا۔

"کھانا لاؤں آپ کے لیے؟" انہوں نے بغور اس کا چہرہ دیکھا جو مسکرا کر اپنی تکلیف چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"کچھ ہوا ہے؟" ان کے سوال پر نہ صرف اس کی مسکراہٹ سمٹی تھی بلکہ اس نے آنکھیں جھکا کر چہرہ بھی موڑ دیا۔ وہ کتنی ہی دیر خاموش رہی جیسے لفظوں کو ترتیب دے رہی ہو اور جب وہ بولی تو بہت کوشش کے باوجود بھی اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

"میں کالج سے آئی بھوک لگی تھی میں نیچے کھانا گرم کرنے گئی تھی، مجھے معلوم نہیں تھا کوئی خاص مہمان آئے ہیں ورنہ میں کبھی نیچے نہ جاتی، میں واپس اوپر آ رہی تھی انہوں نے دیکھ کر مجھے اندر بلایا میں اگر اندر نہ جاتی تو آنٹی کو لگتا میں نے ان کے مہمانوں سے بدتمیزی کی ہے میں صرف دو منٹ وہاں رکی تھی اور پھر واپس آ گئی لیکن آنٹی؟"

کہہ کر اس نے ہونٹ بھینچ کر ضبط کرنا چاہا لیکن آنسو اس کے گالوں پر بہنے لگے تھے۔ انہوں نے اس کے آنسو صاف کرنے کے لیے ہاتھ بڑھانا چاہا لیکن اس کے چہرے پر انگلیوں کے نشان دیکھ کر ان کا ہاتھ وہی رک گیا۔ اپنی بے بسی نے انہیں نظر چرانے پر مجبور کر دیا تھا۔ تب ہی دروازہ جھٹکے سے کھلا تھا اور ندا اندر داخل ہوئی۔

"آپ کو امی پاپا نیچے بلا رہے ہیں۔" بے مروت انداز میں انہیں مخاطب کرنے کے بعد اس نے ایک خونخوار نظر انابیہ پر ڈالی اور اسی جھٹکے سے دروازہ بند کر کے چلی گئی۔

سعید صاحب نے گہرا سانس لے کر اسے دیکھا جواب بھی رو رہی تھی۔ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا وہ اس کے علاوہ اور کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی انہیں دونوں کے بگڑے موڈ کا اندازہ ہو گیا تھا اب وہ ان کے سامنے بیٹھے ان کے بولنے کے منتظر تھے۔ فوزیہ کچھ دیر تو خاموش بیٹھے شوہر کے بولنے کا انتظار کرتی رہیں لیکن جب خاموشی طویل ہو گئی تو انہوں نے ٹھوکا دے کر انہیں بولنے کا سگنل دیا۔

پہلے انہوں نے ہڑبڑا کر بیوی کو اور پھر گلا کھنکھار کر باپ کو دیکھا۔

"ابا جی! ابھی تک جیسا آپ نے چاہا ویسے ہی ہو رہا ہے لیکن میں مزید انابیہ کی وجہ سے اپنے گھر کا ماحول خراب نہیں کر سکتا۔" سعید صاحب نے کچھ حیرت سے اپنے صاحبزادے کا سوجا ہوا منہ دیکھا۔

"ایسا کیا کر دیا انابیہ نے جس سے تمہارے گھر

مکمل ناول

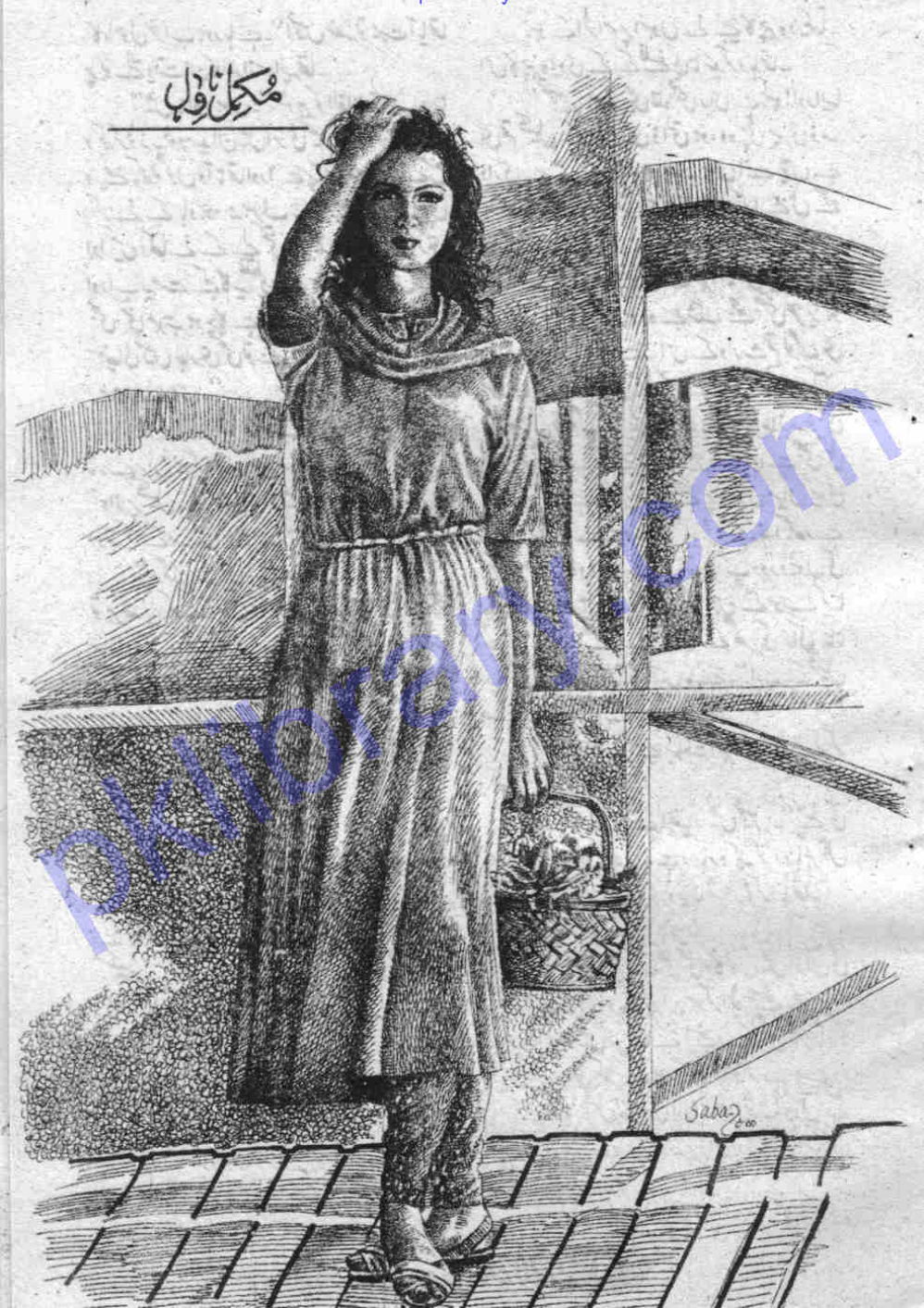

pklibrary.com

کا ماحول خراب ہو رہا ہے۔'' انہیں غصہ تو بہت آیا تھا پر بولتے وقت ان کا انداز سوالیہ تھا۔

''میں بتاتی ہوں۔'' شوہر کو الفاظ ترتیب دیتا دیکھ کر فوزیہ خود میدان میں اتری تھیں۔ ''آج شائنہ کو دیکھنے کچھ لوگوں کو آنا تھا اور اسے پتا تھا لیکن میرے منع کرنے کے باوجود نہ صرف یہ سامنے آئی بلکہ اپنی ادائیں دکھانے کے لیے کتنی دیر تک وہیں بیٹھی رہی اور اب یہ مت کہیے گا یہ غلطی سے ہوا، یہ آج نہیں پہلے بھی کئی مرتبہ ہو چکا ہے۔ اسے کہیں اگر اپنی جوانی سنبھالی نہیں جا رہی تھی تو مجھے بتائے اس کا علاج بھی ہے میرے پاس۔''

''بہو!'' سعید صاحب کا چہرہ اشتعال کے مارے سرخ ہو گیا تھا۔ سعید صاحب کی غصیلی ناراض آواز پر شکیل نے تنبیہی انداز میں بیوی کو دیکھا لیکن وہ ہونہہ کر کے منہ میں بڑبڑانے لگیں۔

''بدگمانی کی بھی ایک حد ہوتی ہے بہو! لیکن تم تو ہر حد پار کرنے پر تلی ہو، وہ بے ضرر سی بچی ہے جو سارا وقت تو تمہارے ڈر سے ایک کمرے میں بند رہتی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا تمہیں اس یتیم مسکین بچی سے بیر کس بات کا ہے؟''

سعید صاحب کی بات پر وہ ایسے اچھلی تھیں جیسے کسی نے ان کی دم پر پاؤں رکھ دیا۔

''بے ضرر، یتیم مسکین'' انہوں نے چبا چبا کر وہ الفاظ استعمال کیے۔ ''اس بے ضرر لڑکی کی وجہ سے میری دونوں بیٹیاں گھر بیٹھی ہیں اس بے ضرر لڑکی کی وجہ سے میرا بھائی میرے خلاف ہو گیا ہے اور وہ یتیم مسکین آپ کو بے ضرر لگتی ہے۔'' ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اوپر جا کر انابیہ کی گردن مروڑ دیں۔

''بہو کوئی کسی کا نصیب نہیں چھین سکتا اپنی اولاد کے نصیب کو اس بچی کی خطا میں شامل نہ کرو۔''

''بات کیا ہے ابا جی! آپ کو ہمیشہ اپنوں سے زیادہ غیروں کی پروا رہی ہے۔ پہلے اس لڑکی کی ماں آپ کو اپنے بیٹے سے زیادہ عزیز رہی اور اب یہ لڑکی آپ کو اپنی پوتیوں سے زیادہ پیاری ہے۔''

بہو کے الزام پر انہوں نے بیٹے کا چہرہ دیکھا۔ اس کا چہرہ بیوی کے کے فلسفے کی تائید کر رہا تھا۔

''تمہیں ہمیشہ یہی غلط فہمی رہی ہے بہو! اور ایسا ہی تم شکیل کے دل میں ڈالتی ہو، وہ بچی میری ذمہ داری ہے میں اس کا سرپرست ہوں اسے یوں بے یار و مددگار نہیں چھوڑ سکتا جس دن اس کے اپنے مل گئے وہ چلی جائے گی۔''

کہنے کے بعد انہوں نے گہرا سانس لیا۔

''اور بے فکر رہو وہ بے شک مجھے جتنی عزیز ہو میری جتنی جمع پونجی ہے۔ اس کے وارث تم لوگ ہی ہو۔ وہ بس ذمہ داری ہے جس سے میں مکر نہیں سکتا۔ دو روٹیاں تو لوگ گھر میں کام کرنے والی ملازمہ کو بھی خوشی خوشی دے دیتے ہیں، تمہیں وہ اس سے بھی گئی گزری لگتی ہے۔'' ان کے کہنے پر دونوں میاں بیوی نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ ''ابا جی آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ فوزیہ کا وہ مطلب نہیں تھا۔ آپ دو روٹیوں کی بات کر رہے ہیں وہ تو سارا گھر اس کے حوالے کرنا چاہتی ہے۔ اسے اپنے بھائی کے گھر کی رانی بنانا چاہتی ہے لیکن آپ ہی نہیں مانتے۔'' اب کے شکیل صاحب نے نرمی سے باپ سے کہا۔

سعید صاحب بے ساختہ گہرا سانس لے کر کھڑے ہو گئے۔

''وہ فیصلہ میرے اختیار میں نہیں۔'' پہلے کی بہت دفعہ دہرائی ہوئی بات دوبارہ کہہ کر وہ باہر نکل گئے۔ پیچھے فوزیہ نے دوبارہ چیخنا شروع کر دیا تھا۔

☆☆☆

ان کی آنکھ اچانک کھلی تھی، کانوں میں اذان کی آواز پڑتے ہی وہ کچھ حیران ہو کر اٹھ بیٹھے کچھ دیر وہ پر سوچ انداز میں سر جھکائے بیٹھے رہے لیکن پھر نماز کا خیال آتے ہی کھڑے ہو گئے۔ وضو کر کے جب وہ باہر آئے تو باہر مکمل خاموشی اور اندھیرا تھا۔ انہوں نے ایک نظر انابیہ کے بند کمرے پر ڈالی اور پھر گہرا سانس لے کر نیچے اتر گئے۔

نماز پڑھ کر جب وہ واپس آئے تب بھی دروازہ

بند تھا۔ ان کے قدم بے ساختہ اس کے کمرے کی طرف بڑھے۔ دوبار دستک دینے کے بعد وہ دروازہ کھول کر اندر آگئے تھے۔ دروازہ کھلنے پر اس نے چونک کر سامنے دیکھا اور انہیں دیکھ کر وہ نا صرف مسکرائی بلکہ کھڑی ہوگئی۔

"آج تم مجھے نماز کے لیے اٹھانے نہیں آئیں اور دروازہ بھی بند تھا۔ میں سمجھا تم اٹھیں نہیں" انہوں نے بغور اس کی سوجی ہوئی آنکھیں دیکھیں۔

"آج تھوڑی دیر ہوگئی تھی میں آپ کو اٹھانے آئی لیکن آپ مسجد جا چکے تھے۔"

"ہوں۔" انہوں نے ہنکارا بھر کر ٹیبل کی طرف دیکھا کل رات کھانے کی ٹرے جیسے وہ رکھ کر گئے تھے ویسے ہی پڑی تھی۔

"تم نے کھانا نہیں کھایا؟" انہوں نے خفگی سے اسے دیکھا۔

"مجھے بھوک نہیں تھی۔"

"یہاں بیٹھو۔" اسے بیڈ پر بیٹھنے کا کہہ کر وہ خود اس کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گئے۔ "بیٹا ایسا پہلی بار تو نہیں ہوا۔ فوزیہ کی عادت ہے بغیر سوچے سمجھے کچھ بھی بول دیتی ہے تو کیا ہر بار تم یونہی خود کو تکلیف دو گی۔" ان کے کہنے پر کرب سے ضبط کیے اس کے آنسو بہہ نکلے تھے۔

"میں تھک گئی ہوں بابا! میری سمجھ میں نہیں آتا۔ آنٹی کو مجھ سے اتنی نفرت کیوں ہے۔ میں تو ہر ممکن کوشش کرتی ہوں ان کو خوش رکھنے کی لیکن پھر بھی۔" وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر آنسو بہانے لگی۔

"اس عورت کی فطرت ہی ایسی ہے وہ کبھی کسی سے خوش نہیں ہو سکتی۔" فوزیہ کی باتیں یاد آتے ہی وہ تلخی سے بولے۔

"تم کیوں اس کی باتیں دل سے لگاتی ہو ایک کان سے سنو دوسرے سے نکال دو۔ تم نے کون سا یہاں رہنا ہے جو دل برا کرتی ہو۔ آج نہیں تو کل تم اپنے گھر چلی جاؤ گی جہاں تم راج کرو گی؟"

ان کے کہنے پر اس نے جھٹکے سے نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں نظر آتے شکوے کو محسوس کر کے وہ بے ساختہ نظریں چرا کر رہ گئے۔

"کتنے سالوں سے آپ یہی کہہ کر مجھے بہلا رہے ہیں۔ تب بچی تھی بابا بہل جاتی تھی اب میں بچی نہیں رہی۔ حالات نے مجھے عمر سے زیادہ سمجھدار بنا دیا ہے آٹھ سال کم عرصہ نہیں ہوتا انتظار کے لیے۔"

"امید پہ دنیا قائم ہے ہم ڈھونڈ رہے ہیں نا انہیں ان شاء اللہ جلد مل جائیں گے۔"

ان کے پرامید انداز پر وہ تلخی سے مسکرائی۔

"ڈھونڈا انہیں جاتا ہے بابا! جو کھو جاتے ہیں لیکن جو خود چھپ جائیں جانتے بوجھتے ہوئے، ان کو ڈھونڈ انہیں جا سکتا۔ اب تک آپ کو سمجھ جانا چاہیے۔ ان لوگوں کو میری کوئی چاہ نہیں۔ ان کے لیے میرا ہونا نہ ہونا ایک برابر ہے۔ میں تو ایک وعدے ایک قسم کے حصار میں قید ہوں۔ لیکن دوسری طرف ایسی کوئی مجبوری نہیں، میں خود کو خلا میں معلق محسوس کرتی ہوں۔ بابا! نہ زمین میری ہے نہ آسمان میرا ہے۔ ٹھکرائے جانے کی ذلت میرے نصیب میں لکھ دی گئی ہے اور اس سے کسی صورت رہائی ممکن نہیں۔"

اب کے وہ بری پھر رو پڑی۔

سعید صاحب کا دل بری طرح دکھا تھا وہ اس کی تکلیف سمجھ سکتے تھے اب تو انہیں خود بھی اسے تسلی دیتے ہوئے اپنے لہجے کے کھوکھلے پن کا اندازہ ہوتا تھا لیکن وہ بھی کیا کرتے وہ اس سے اس امید کا آسرا بھی چھین لیتے تو وہ جیتے جی مر جاتی۔

"میری بچی مایوس نہیں ہوتے، اللہ پر بھروسا رکھو وہ سب اچھا ہی کرے گا۔" وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے اور اس کے سر اٹھانے سے پہلے تیزی سے چلتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔

☆☆☆

"اے بھیا! پورا ماہ ہو گیا تمہاری راہ دیکھتے اب آئے ہو۔" فوزیہ نے پیار بھری ناراضی سے اپنے بھائی کو دیکھا۔ جس کی متلاشی نظریں کسی کو تلاش

کر رہی تھیں۔ فوزیہ نے دیکھ کر برا سا منہ بنایا۔
''ابھی بھی جو ایک ماہ بعد آنے کی زحمت کی ہے جانتی ہوں کس کی وجہ سے آئے ہو۔''
''جب جانتی ہیں تو پوچھ کیوں رہی ہیں۔'' وہ شرمندہ ہوئے بغیر ڈھٹائی سے بولا۔
''اب ڈیلے گھمانا بند کرو، نیچے نہیں ہے وہ۔''
غفران نے برا سا منہ بنا کر پیالی میز پر رکھ دی۔
''کبھی بہن بھانجیوں کی بھی خبر لے لیا کرو۔''
''کیا خبر لوں ٹھیک ٹھاک صحیح سلامت تو بیٹھی ں میرے سامنے۔'' اس کے نہ ہونے کا سن کر اس کا وڈ خراب ہو چکا تھا۔
''بات سنو غفران! تم جن چکروں میں ہو نا، ن میں کامیابی نہیں ملنی کہیں۔ کیونکہ ابا جی بالکل نہیں نیں گے۔'' فوزیہ کے کہنے پر غفران نے غصے سے ہن کو دیکھا۔
''کبھی تو اچھی بات منہ سے نکال لیا کرو۔''
''میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔''
''آپا میں بہت پہلے کا کہیں بتا چکا ہوں، مجھے ابیہ چاہیے تو بس چاہیے، اب تم اپنے سر کو کیسے اضی کرنی ہو۔ تمہارا سر درد ہے۔'' وہ ماتھے پر بل ال کر بولا۔
''ایک تو مجھے تمہاری سمجھ میں نہیں آتی کیوں ں کے پیچھے پڑ گئے ہو سوائے ایک اچھی شکل کے ہے کیا اس کے پاس ہے تمہیں کیا لڑکیوں کی کمی ہے، ں سے ہزار گنا بہتر لڑکیاں ملیں گی۔''
''آپا مجھے ہزار گنا بہتر لڑکیوں سے کوئی لینا دینا ہیں۔ مجھے بس انابیہ چاہیے اگر تمہارے سسر آرام سے مان جاتے ہیں تو ٹھیک ورنہ میں اپنے طریقے سے لے جاؤں گا۔''
اس کا موڈ بری طرح سے خراب ہو چکا تھا اور فوزیہ کو بھی اندازہ ہو گیا تھا۔
''ارے بابا! یہ کیا موڈ آف کرنے والی بات ہے میں تو ویسے ہی ایک بات کر رہی تھی۔ تم انابیہ سے شادی کرنا چاہتے ہو، میں کرواؤں گی لیکن اس کے لیے کوئی الٹی سیدھی حرکت کرنے کی ضرورت نہیں میں ابا جی سے تفصیلی بات کر لوں گی اور مجھے پتا ہے وہ مان جائیں گے، چلو اب اپنا موڈ ٹھیک کرو، میں نے ویسے بھی تمہاری پسند کا کھانا بنوایا ہے۔ ندا ذرا شائستہ سے کہو، کھانا لگا دے۔''

☆☆☆

ریسٹ سے نکل کر انہوں نے بلند و بالا عمارتوں پر ایک نظر ڈال کر دوبارہ ہاتھ میں پکڑے پرچے کو دیکھا جہاں ایک پتا درج تھا۔ وہ گہری سانس لے کر سامنے بنی عمارتوں کی طرف بڑھنے لگے۔ وہ کافی دیر سے چل رہے تھے اب تو وہ ہانپنے لگے تھے۔ تھک کر وہ ایک بلڈنگ کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئے۔
''بزرگو! طبیعت ٹھیک ہے۔'' وہ دس منٹ سے یونہی گردن جھکائے بیٹھے تھے۔ جب اپنے پیچھے آواز سن کر انہوں نے سر اٹھایا۔ وہ اس بلڈنگ کا گارڈ مین تھا جو کب سے انہیں یہاں بیٹھا دیکھ رہا تھا۔
''بیٹا یہ بتا سکتے ہیں۔'' انہوں نے ہاتھ میں پکڑا پرچہ اس کے سامنے کیا۔
''جی یہ ہی بلڈنگ ہے جہاں آپ بیٹھے ہیں۔''
سعید صاحب نے چونک کر بلڈنگ پر لگے بورڈ کی طرف دیکھا اور شرمندہ ہو کر کھڑے ہو گئے۔
''معذرت چاہتا ہوں بیٹا پریشانی میں پتا ہی نہیں چلا۔''
''کوئی بات نہیں کس سے ملنا تھا آپ کو۔'' وہ ان کا ہاتھ تھام کر ان کو سیڑھیاں چڑھنے میں مدد کرنے لگا۔
''یہاں کے مالک سے ملنا تھا۔''
''کون سے والے سے۔'' سعید صاحب رک گئے تھے۔ ''کتنے مالک ہیں؟''
''بڑے صاحب کبھی کبھی آتے ہیں چھوٹے صاحب ہیں۔ ان کا بھی پتا نہیں کدھر ہیں یا نہیں۔''
''اچھا!'' سعید صاحب مایوسی سے بولے۔
''لیکن آپ ریسپشن سے پتا کر لیں۔'' وہ انہیں اندر لے آیا۔ ''مس اقبال! ان صاحب کو باس

سے ملنا ہے۔" ریسپشن پر کھڑی لڑکی نے سر سے پیر تک اس خستہ حال شخص کا جائزہ لیا۔

"آپ کی کوئی اپائنمنٹ ہے۔" وہ ناک چڑھا کر بولی۔

"نہیں بیٹا! مجھے ان سے ذاتی نوعیت کا کام ہے۔"

"ہوں۔" لڑکی نے سمجھ کر سر ہلایا ایسے بہت سے لوگ مدد مانگنے آتے تھے کیونکہ اس کمپنی کے مالکان کو چیریٹی کا بڑا شوق تھا۔ "آپ کا نام۔"

"سعید مرزا! بیٹا ان سے کہنا مجھے بہت ضروری بات کرنی ہے ایک مرتبہ میری بات سن لیں۔"

"آپ بیٹھیں، سر میٹنگ میں ہیں جوں ہی فری ہوتے ہیں میں آپ کو اندر بھیجتی ہوں۔"

وہ شکریہ ادا کر کے لابی میں رکھے صوفے پر بیٹھ گئے تھے۔ انہیں بیٹھے تین گھنٹے ہو گئے تھے لیکن ابھی تک کوئی بلاوا نہیں آیا تھا انہیں گھر سے نکلے بھی کافی وقت ہو گیا تھا۔

انہیں انابیہ کی فکر تھی جو یقیناً ان کے لیے پریشان ہو رہی ہوگی۔

"یہ کون ہیں؟ کب سے دیکھ رہی ہوں یہاں بیٹھے ہیں۔" عدیلہ نے ریسپشن پر کھڑی اقبال سے پوچھا۔

"میم! یہ سر سے ملنے آئے ہیں کہتے ہیں ضروری کام ہے مجھے تو کوئی چیریٹی کا کام لگتا ہے۔"

دونوں سعید صاحب کو دیکھ رہی تھیں جو سر جھکائے گہری سوچ میں گم تھے۔

"انہیں سر حذیفہ کے پاس بھیج دو۔"

"انکل آپ سر سے مل سکتے ہیں۔" سعید صاحب نے چونک کر اسے دیکھا اور کھڑے ہو گئے۔

"شکریہ بیٹا۔"

"وقار! انکل کو سر حذیفہ کے روم میں لے جاؤ۔" اقبال نے لفٹ کے قریب کھڑے لڑکے سے کہا تو سعید صاحب اس لڑکے کی طرف بڑھ گئے دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے ان کے ہاتھوں میں پسینہ سی اتر آئی تھی۔

"یس!" مردانہ آواز پر انہوں نے دھیرے سے دروازہ کھولا لیکن سامنے نظر پڑتے ہی ان کے نا صرف قدم رکے تھے بلکہ دل کی دھڑکن بھی سست پڑ گئی تھی۔ ریوالونگ چیئر پر بیٹھے وجود نے سرسری سی نظر ان پر ڈالی۔

"جی آپ مجھ سے ملنا چاہتے تھے؟"

سعید صاحب اب بھی حیرت سے پچیس ستائیس سال کے لڑکے کو دیکھ رہے تھے یہ یقیناً وہ نہیں تھا جس سے وہ ملنے آئے تھے۔

"پلیز بیٹھیے۔" حذیفہ نے بغور ان کی اڑی رنگت کو دیکھا۔ وہ جلدی سے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئے کیونکہ اگر وہ ایک پل بھی دیر کرتے تو شاید گر جاتے ان کی نظر سامنے پانی کے گلاس پر ٹکی تھی۔ حذیفہ نے ان کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا اور گلاس اٹھا کر ان کے آگے رکھا جسے شکریہ کہنے کے بعد وہ ایک ہی سانس میں پی گئے۔

"بیٹا! میں معذرت چاہتا ہوں شاید میں غلط جگہ پر آ گیا ہوں مجھے ارباز جیلانی سے ملنا تھا۔ میں سمجھا یہ جیلانی انڈسٹری ان کی ہے۔" وہ شرمندہ ہو کر بولے۔

"آپ کو کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی۔ یہ جیلانی انڈسٹری ان کی ہی ہے۔" سعید صاحب نے چونک کر اسے دیکھا۔

"بیٹا پلیز، مجھے انس سے ملوا دیں۔ میرا ان سے ملنا بہت ضروری ہے۔ ان سے یوکیس سعید مرزا آیا ہے وہ مجھے جانتے ہیں۔" وہ بے تابی سے بولے۔

"آپ لاسٹ ٹائم کب ملے تھے ان سے؟" سامنے والے نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"تقریباً دس گیارہ سال پہلے۔" حذیفہ نے گہرا سانس لیا۔

"ان کی وفات کو آٹھ سال گزر چکے ہیں۔" سعید صاحب کتنی دیر سامنے بیٹھے لڑکے کا چہرہ دیکھتے

رہے۔

''کامران جیلانی'' سرگوشی کے انداز میں ان کے منہ سے نکلا تو حذیفہ نے چونک کر انہیں دیکھا۔

''کامران جیلانی کا بیٹا بھی تھا وہ کہاں پر ہے؟'' وہ بے تابی سے بولے۔

اب کی بار حذیفہ کھوجتی نظروں سے ان کا جائزہ لینے لگا۔

''آپ سب کو کیسے جانتے ہیں اور کیوں پوچھ رہے ہیں؟'' وہ دونوں ہاتھ شیشے کی ٹیبل پر جما کر چہرہ آگے کیے انہیں بغور — دیکھنے لگا۔

''میں صرف ان کو بتا سکتا ہوں، کیا آپ ان کے بیٹے ہیں؟'' وہ اب بے تابی سے اس کے نقوش دیکھتے ہوئے جیسے کچھ کھوجنا چاہتے ہوں، ان کا چہرہ دیکھتے ہوئے اس نے سر نفی میں ہلایا اس نے واضح طور پر انہیں مایوس ہوتے دیکھا۔ وہ اب الجھن بھری نظروں سے اس شخص کو دیکھ رہا تھا۔

''آپ؟'' وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے جیسے الفاظ ختم ہو گئے ہوں۔''

''میں یہاں کام کرتا ہوں۔'' اس کے کہنے پر سعید صاحب نے سر اثبات میں ہلایا۔

''کیا میں ان کے بیٹے سے مل سکتا ہوں۔''

''وہ اس وقت یہاں پر نہیں۔ آپ کو جو کام ہے مجھے بتائیں اگر ہو سکا تو آپ کا پیغام پہنچا دوں۔''

اس کی بات پر سعید صاحب کے چہرے پر کشمکش کے آثار نظر آئے تھے پھر جیسے گہرا سانس لے کر دیکھا۔

''ان سے کہیے گا ان کی امانت میرے پاس ہے بہت سالوں تک اس کی حفاظت کی ہے لیکن اب اپنی زندگی کا بھروسا نہیں، مرنے سے پہلے اس کو اس کے وارثوں کے حوالے کرنا چاہتا ہوں۔''

''کیسی امانت؟'' حذیفہ کے سوال پر سعید صاحب کتنی دیر اسے دیکھتے رہے۔

''آپ مجھ پر اعتبار کر سکتے ہیں۔'' سعید صاحب نے سر جھکا لیا۔

''عفت گل کی بیٹی اس گھر کی امانت میرے پاس ہے ان سے کہیں اسے آ کر لے جائیں۔''

''ٹھیک ہے اگر ان سے ملاقات ہوئی تو میں بتا دوں گا۔'' وہ رکھائی سے بولا جس کا مطلب تھا اب وہ جا سکتے ہیں۔ وہ شرمندہ ہو کر کھڑے ہو گئے۔

''بیٹا! آپ کا اتنا ٹائم لینے پر معذرت چاہتا ہوں ویسے میں دوبارہ آؤں گا لیکن پھر بھی آپ میرا نمبر رکھ لیں۔'' انہوں نے پرچی پر لکھا نمبر ٹیبل پر رکھ دیا۔

''ہوں!'' اس نے محض سر ہلا کر سامنے پڑے لیپ ٹاپ کی اسکرین آن کر دی۔ سعید صاحب مایوسی سے باہر نکل گئے۔

ان کے باہر جاتے ہی حذیفہ نے لیپ ٹاپ آف کر دیا تھا۔ اس کے چہرے پر واضح طور پر سوچ کی پرچھائیں تھیں۔

☆☆☆

انابیہ نے پریشانی سے اپنے دونوں ہاتھوں کو مسلتے ہوئے گھڑی کی طرف دیکھا جہاں شام کے چھ بج رہے تھے۔ صبح سے شام ہو گئی تھی اور سعید صاحب کا کچھ پتا نہیں تھا اوپر سے موبائل بھی وہ گھر چھوڑ گئے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کیسے ان سے رابطہ کرے، اسے ان کی فکر ہو رہی تھی۔ برے اندیشوں کے ساتھ شام کے سائے بھی اسے ہولا رہے تھے۔

تب ہی سیڑھیوں پر آہٹ محسوس کر کے وہ بے تابانہ انداز میں بڑھی لیکن سیڑھیوں میں کھڑے غفران کو دیکھ کر بے ساختہ رکی تھی۔ اسے یوں آگے بڑھتا اور رکتا دیکھ کر وہ مسکراتا ہوا باقی سیڑھیاں بھی عبور کر کے اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

''مجھے یقین نہیں آ رہا کوئی اتنی بے چینی سے میرا انتظار کر رہا تھا۔'' غفران کی فدا ہوتی نظریں اس کے چہرے کا طواف کرنے لگیں جس کا چہرہ خوف سے زرد پڑ گیا تھا۔

''کیا ہوا اتنی پریشان کیوں ہو رہی ہو، میں ہی ہوں تم تو ایسے ری ایکٹ کر رہی ہو جیسے بھوت دیکھ لیا

ہو۔'' کہتے ہوئے وہ قریب رکھے صوفے پر بیٹھ گیا۔

انابیہ مزید پریشان ہو کر سیڑھیوں کی طرف دیکھنے لگی۔

''انکل نظر نہیں آرہے۔'' ان کے کمرے کی طرف نظر ڈالتے ہوئے وہ پوچھنے لگا۔ مسلسل خاموشی پر اس نے بغور اسے دیکھا۔

''کچھ پوچھا ہے۔''

''وہ گھر پر نہیں ہیں۔''

اس کے مسلسل گھورنے پر اسے بولنا پڑا تھا۔

تب ہی وہ ٹانگ پر ہاتھ مار کر بولا۔ ''فضا میں سکون سا محسوس ہو رہا تھا۔''

اس کے کہنے پر ڈر کے باوجود انابیہ نے غصے سے اسے دیکھا اس کے گھورنے پر وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

''مذاق کر رہا تھا۔'' اس کے کہنے پر وہ مڑ گئی۔

''کہاں جا رہی ہو۔'' اسے سیڑھیوں کی طرف بڑھتا دیکھ کر وہ تیزی سے کھڑا ہوا تھا۔

''میں نیچے آنٹی کے پاس جا رہی ہوں۔'' وہ گھبرا کر تیزی سے بولی۔

''میں تم سے ملنے آیا ہوں اور تم نیچے جا رہی ہو۔''

''بابا گھر پر نہیں ہیں۔'' وہ ہنوز گھبرائی ہوئی تھی۔ وہ اس کا چہرہ دیکھتا ہوا بالکل اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

''جانتا ہوں اسی لیے تو یہاں آیا ہوں مجھے تم سے بات کرنی ہے۔''

''لیکن مجھے نہیں کرنی۔'' وہ روہانسی ہو کر اسے دیکھنے لگی جو بالکل سیڑھیوں کے آگے پھیل کر کھڑا تھا۔

''لیکن مجھے جو کہنا ہے وہ تو میں کہہ کر جاؤں گا۔ دو سال ہو گئے مجھے تمہارے آگے پیچھے چکر کاٹتے ہوئے لیکن تم اور تمہارے بابا ٹس سے مس نہیں ہو رہے، کیا مانگ رہا ہوں صرف تمہارا ہاتھ، وہ بھی بہت شرافت سے، حالانکہ اتنی شرافت مجھے خود ہضم نہیں ہو رہی۔'' آخری لائن وہ صرف بڑبڑایا تھا۔

''اتنے ٹال مٹول کی وجہ پوچھ سکتا ہوں۔'' ایک تو وہ پہلے ہی سعید صاحب کی اتنی لمبی غیر حاضری کی وجہ سے پریشان تھی۔ دوسرا وہ نا صرف اس کے سامنے کھڑا تھا بلکہ اس سے جواب بھی مانگ رہا تھا۔ اس نے بے اختیار کسی کے آنے کی دعا کی تھی۔ وہ شاید قبولیت کی گھڑی تھی۔ ندا کی صورت سیڑھیوں پر نمودار ہوئی تھی۔ اس نے ایک نظر غفران پر دوسری نظر اس کے روہانسے چہرے پر ڈالی اور ایک طنزیہ اور جتاتی مسکراہٹ اس کے چہرے پر آئی تھی۔

''ماموں! امی آپ کو بلا رہی ہیں کھانا تیار ہے۔'' اس نے کہتے کے ساتھ اس کا ہاتھ بھی پکڑ لیا تھا جس پر غفران ایک نظر اس پر ڈال کر سیڑھیوں کی طرف مڑ گیا۔

انابیہ نے بے ساختہ دل پر ہاتھ رکھ کر اپنی رکی سانسیں بحال کی تھیں۔

☆☆☆

وہ کھانے کی ٹرے لے کر واپس آئی تو سعید صاحب صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کیے اسی پوزیشن میں بیٹھے تھے، جیسے وہ پندرہ منٹ پہلے چھوڑ کر گئی تھی۔ وہ ٹرے سامنے رکھے ٹیبل پر رکھ کر ان کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔

''بابا! جب کافی دیر تک وہ ویسے ہی بیٹھے رہے تو اس نے پریشانی سے انہیں پکارا۔

سعید صاحب نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور اسے سامنے دیکھ کر مسکرا دیے اور کچھ کہے بغیر کھانے کی طرف متوجہ ہو گئے۔ انابیہ بڑے غور سے ان کا چہرہ دیکھ رہی تھی جو کھاتے ہوئے بھی کسی سوچ میں گم تھے۔

''بابا کوئی بات ہوئی ہے۔''

''ہوں'' انہوں نے نا سمجھی سے اسے دیکھا۔

''آپ پریشان لگ رہے ہیں۔''

''نہیں تو۔'' وہ سر جھٹک کر بولے۔ ''بس تھک گیا ہوں۔''

''آپ صبح جلدی چلے گئے بتا کر بھی نہیں گئے۔

موبائل بھی یہی چھوڑ گئے، مجھے اتنی پریشانی ہورہی تھی۔"

"جاتا ہوں بیٹا! بس جلدی میں موبائل گھر بھول گیا تھا۔" انہوں نے تھوڑا سا کھانے کے بعد پلٹ پیچھے کھسکا دی۔

"آپ نے کھانا بھی ٹھیک سے نہیں کھایا۔"

"بس اتنی ہی بھوک تھی ایک کپ چائے کا پلوا دو پھر میں سوؤں گا تھک گیا ہوں۔"

انہوں نے گہرا سانس لے کر ٹی وی آن کردیا تو وہ ٹرے اٹھا کر کھڑی ہوگئی انہیں تھکاوٹ اتنی نہیں تھی جتنی مایوسی کی تھی شاید مایوسی سے زیادہ پریشانی تھی۔

ایک آس تھی کہ جیلانی فیملی کے ملتے ہی آسانی سے نہ سہی مشکل سے ہی سہی معاملہ حل ہوجائے گا۔ اتنے سالوں کی تلاش کے بعد جب انہیں جیلانی فیملی کی خبر ملی تو وہ کتنے خوش تھے۔ انہیں لگا وہ وقت آگیا جب وہ اپنے فرض سے سبکدوش ہوسکیں گے لیکن اس وقت انہوں نے خود کو مایوسی کی انتہا پر محسوس کیا تھا جب انہیں پتا چلا کہ خاندان کے تین دو افراد جو اس راز کے گواہ تھے۔ وہی اس دنیا میں نہیں رہے۔

ایک وہی تھے جو انابیہ کی آس کو زندہ رکھے تھے اب انہیں سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ وہ کیسے انابیہ کو سب بتائیں۔ لیکن انابیہ کو کچھ بھی بتانے سے پہلے انہیں ایک آخری کوشش ضرور کرنی تھی۔

☆☆☆

گاڑی کا دروازہ کھولتے ہی پرجوش آوازوں کے ساتھ اشتہا انگیز خوشبو نے اس کا استقبال کیا تھا۔ اس نے بے ساختہ سر گھما کر ان کی طرف دیکھا جہاں گھر والوں کے ساتھ یقیناً کچھ مہمان بھی تھے۔ اس نے گہرا سانس لے کر خود کو ریلیکس کیا اور ایک مسکراہٹ چہرے پر سجا کر لان میں موجود ہجوم کی طرف بڑھا۔

"لو حذیفہ بھی آگیا۔"

اس پر سب سے پہلی نظر کلثوم کی پڑی تھی، جواباً سب کی نظریں اس کی طرف گھوم گئی تھیں لیکن اس کی نظریں ایک چہرے پر رک گئی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں حیرانی دیکھ کر وہ بھرپور انداز میں مسکرا ہوا کھڑا ہوگیا۔

"بھائی!" حذیفہ خوشی سے کہتا ہوا اس کے گلے لگ گیا تھا۔

"آپ کب آئے اور مجھے انفارم کیوں نہیں کیا میں آپ کو لینے ایئرپورٹ آتا۔"

"اگر بتا دیتا تو سرپرائز تو نہ رہتا اور تم سب کے چہروں پر جو مجھے ایکسپریشن دیکھنے کو مل رہے ہیں، وہ کیسے ملتے۔" اس کی بات پر وہ سر ہلاتا ہوا اس کے ساتھ رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ تب ہی نظر ایک اجنبی چہرے پر پڑی جو بڑی دلچسپی سے اس ملاقات کو دیکھ رہی تھی۔

حذیفہ پہچانا کون ہے۔" کلثوم کے پوچھنے پر اس نے ایسی نظروں سے انہیں دیکھا جیسے کہہ رہا ہوں مجھے الہام نہیں ہوتے۔

"نثار بھائی کی بیٹی انعم ہے پاکستان گھومنے آئی ہے۔"

رخسانہ کے تعارف کروانے پر اس نے مسکرا کر اسے ہیلو کہا تھا جبکہ اس نے دایاں ہاتھ آگے بڑھایا تھا جسے ایک نظر دیکھنے کے بعد حذیفہ نے ہلکے سے تھام کر چھوڑ دیا تھا۔

"کام کیسا جارہا ہے؟" طالب کے پوچھنے پر اس نے سر ہلایا تھا۔

"اچھا جارہا ہے اب آپ آگئے ہیں تو اور اچھا ہوجائے گا۔ وہ جو انٹر چینج کے قریب پلازہ کی کنسٹرکشن کا کام تھا وہ ٹھیک جارہا ہے۔

تھوڑا مسئلہ ہوا تھا۔ لیبر کی وجہ سے پرابلم آرہی تھی لیکن اب انڈر کنٹرول ہے۔"

"خدا کے لیے کام کی باتیں گھر میں مت کیا کرو، سارا دن کم ہوتا ہے کام کی باتیں کرنے کے لیے، کم از کم گھر میں تو سکون سے بیٹھو۔" شمسہ کے ٹوکنے پر وہ دونوں مسکرا دیے تھے۔

حذیفہ نے ایک طائرانہ نظر سب پر ڈالی سب

مطمئن اور خوش نظر آ رہے تھے۔

"کیا بات ہے حذیفہ کوئی پریشانی ہے۔" طالب نے بغور اس کا الجھا انداز دیکھا اس کے پوچھنے پر سب حذیفہ کو دیکھنے لگے۔

"نہیں بھائی بس تھوڑا تھک گیا ہوں اب ۔ فریش ہو کر آتا ہوں۔" وہ کہہ کر تیزی سے کھڑا ہو گیا تھا۔

☆☆☆

صبح جب وہ تیار ہو کر ڈائننگ روم میں آیا تو طالب پہلے سے بیٹھا یقیناً اسی کا منتظر تھا۔

"بھائی آپ ابھی ریسٹ کرتے۔" وہ اس کے ساتھ والی کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"یار کل سے تم لوگ ایسے بی ہیو کر رہے ہو جیسے میں امریکہ سے پیدل چل کر آیا ہوں یا پہلی بار اتنا لمبا سفر کیا ہے میں نے۔" وہ قدرے جھنجلائے ہوئے انداز میں بولا۔

لگتا تھا اس سے پہلے بھی وہاں موجود تینوں خواتین بھی اس سے لگ بھگ ایسی بات کر چکی تھیں۔

"تو برا کیا ہے تمہاری بہتری کے لیے کہہ رہے ہیں۔"

"مجھے پتا ہے میری بہتری کس میں ہے۔" رخسانہ کو جواب دیتے ہوئے اس کا لہجہ سخت ہو چکا تھا۔ کلثوم اور شمسہ نے بے ساختہ ایک دوسرے کو دیکھا۔

"اور انعم جو اٹھ کر تمہارا پوچھے گی اسے تو تم یہاں سیر کروانے لائے تھے۔"

اب کی بار طالب نے چائے کا گھونٹ لیے بغیر کپ واپس میز پر رکھ دیا۔

"ممی نہ تو میں گائیڈ ہوں اور نہ اس کا نوکر، پہلے بھی آپ کے کہنے پر میں نے ایک مہینہ امریکا میں ویٹ کیا، یہاں اپنے بزنس کے سو کام تھے جنہیں حذیفہ کے سپرد کر کے آپ کے بھائی کے اوٹنگے بونگے کاموں کے لیے مجھے جانا پڑا۔ وہ تو جو ڈرامہ کمپنی ہیں سو ہیں آپ بھی کم نہیں، اتنا رو دھو کر ڈرامہ کیا۔ میرا بھائی بیمار ہے ہارٹ سرجری ہے میں سمجھا پتا نہیں کتنا سیریس معاملہ ہے۔ شاید ماموں کا آخری وقت آ گیا ہے۔ لیکن وہ وہاں ہٹے کٹے بیوی کے پہلو میں بیٹھے سالیوں کے ہاتھ کے آئل سے بھرے سموسے کھا رہے تھے۔"

حذیفہ تو پہلے ہی کپ کی آڑ میں اپنی مسکراہٹ چھپا رہا تھا لیکن اب اس کے انداز پر کلثوم اور شمسہ بھی اپنی ہنسی روک نہیں سکی تھیں۔ جبکہ رخسانہ ہونٹ بھینچے اپنے بیٹے کی گفتگو ہضم کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ نند اور دیورانی کی ہنسی پر خشمگیں نظروں سے انہیں دیکھا تو دونوں نے بمشکل خود کو سنجیدہ کیا۔

"احسان نہیں کیا تم نے، تمہارے اکلوتے ماموں ہیں اگر ان کا بیٹا ہوتا تو وہ بھی تمہارا احسان نہ لیتے۔"

انہوں نے لہجے کو رقت آمیز بناتے ہوئے کہا۔

"امی! ان کی تین عدد بیٹیاں ہیں جو کسی طور پر لڑکوں سے کم نہیں اور دوسرا آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے ماموں کی کوئی ہارٹ سرجری نہیں ہوئی اور نہ ہارٹ ٹربل، ایسڈیٹی پرابلم تھی جس کو کافی بڑھا چڑھا کر بتایا گیا تھا۔ میں تو اگلے ہفتے ہی آ جاتا لیکن ہر ہفتے ان کا کوئی نیا ڈرامہ شروع ہو جاتا تھا اور اب جب میں واپس آ رہا تھا تو اپنی بیٹی میرے ساتھ چپکا دی۔"

"شرم کرو طالب! کزن ہے تمہاری بچپن کی دوست ہے تمہاری اور پسند کرتی ہے تمہیں اور تم بھی تو پسندیدگی کا اظہار کر چکے ہو، تب ہی تو بھائی تم سے اتنی امیدیں لگا بیٹھے ہیں۔" رخسانہ کا انداز جتاتا ہوا تھا۔

"دوستی، کزن اور پسندیدگی ایسے فیکٹر نہیں کہ انسان آپ پر حاوی ہونے کی کوشش کرے اور آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ میں کبھی بھی خود پر کوئی چیز زبردستی تھوپنے نہیں دیتا اور نہ زبردستی کے رشتے کا قائل ہوں۔"

اس نے دو ٹوک انداز میں بول کر نیپکن سے منہ صاف کیا اور کرسی دھکیل کر کھڑا ہو گیا۔

حذیفہ جو کب کا ناشتا ختم کر چکا تھا اس کے

pklibrary.com

اٹھتے ہی کھڑا ہو گیا۔ وہ دونوں لاؤنج سے گزر رہے تھے جب قاسم تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتا ہوا ان کے پاس آیا۔

"بھائی! آپ آفس جا رہے ہیں؟" طالب کے ماتھے پر بل پڑے تھے جبکہ قدرے پیچھے کھڑے حذیفہ کے چہرے پر مسکراہٹ آئی تھی۔

"کیوں نہیں جا سکتا۔" قاسم اس کے اکھڑے لہجے پر گڑبڑا کر رہ گیا۔

"نہیں بھائی جا سکتے ہیں۔" وہ شرمندہ ہو کر سر کھجانے لگا۔

"ایسا کرنا شام کو تم اور نگین انعم کو باہر لے جانا۔"

"جی بھائی۔" اس کے بولنے پر وہ اس کے سر پر چپت لگا کر باہر نکل گیا۔

"بھائی کا موڈ کیوں آف لگ رہا تھا۔" قاسم نے ناشتے کی میز پر بیٹھتے ہوئے ان تینوں پر ایک نظر ڈالی۔

"اس کا موڈ کب آف نہیں ہوتا۔" رخسانہ نے غصے سے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔

"تمہیں جب پتا ہے تو کیوں اس سے بحث کرتی ہو۔" شمسہ نے کہنے کے ساتھ ناراضی سے انہیں دیکھا۔

"آپا یہ بحث تھی؟ میں ماں ہوں اس کی اس کا بھلا چاہتی ہوں اگر میں چاہتی ہوں، وہ شادی کرے تو برا کیا ہے اور انعم میں کیا برائی ہے۔ خوب صورت ہے۔ پڑھی لکھی ہے۔ میری بھتیجی ہے اور اوپر سے امریکن سیٹلڈ ہولڈر لوگ ترستے ہیں ایسے رشتے کو اور یہاں بات شروع کرو تو لاڈلے کا موڈ آف ہو جاتا ہے۔"

"بڑی مما! بھائی نہیں مان رہے تو کوئی بات نہیں میں دل و جان سے تیار ہوں۔" قاسم کی شرارت پر جہاں شمسہ کی ہنسی نکلی وہی کلثوم اور رخسانہ نے غصے سے دیکھا۔

"قاسم!" کلثوم کے گھورنے پر اس نے برا سا منہ بنایا۔

"مذاق کر رہا تھا ممی!"

"رخسانہ! یوں غصہ کرنے کی ضرورت نہیں، تم جانتی ہو طالب سے تم زبردستی سے کچھ منوا نہیں سکتیں، بے شک انعم اچھی لڑکی ہے اور طالب کی اس سے دوستی ہے اور جب تم نے اس سے بات کی تھی اس نے انکار بھی نہیں کیا تھا مطلب اسے کوئی اعتراض نہیں تو بار بار ایک ہی بات کر کے اسے ضد مت دلاؤ۔" شمسہ نے دھیرج سے انہیں سمجھایا تھا۔

"آپا! میں بس اس کی خوشی چاہتی ہوں اور جب تک اس کا گھر نہیں بس جاتا مجھے سکون نہیں آئے گا۔ آپ جانتی ہیں۔" وہ ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولیں۔

شمسہ نے ان کی بات سمجھتے ہوئے گہرا سانس لیا۔ جبکہ کلثوم نے میز پر رکھے ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر ان کو تسلی دی تھی۔

☆☆☆

باہر جانے سے پہلے وہ نیچے بنے لاؤنج کی طرف آئے تھے جہاں صوفے پر بیٹھی فوزیہ چائے پینے کے ساتھ فون بھی سن رہی تھیں۔

"میں باہر جا رہا ہوں کچھ منگوانا ہو تو بتا دو۔" وہ دروازے کے قریب کھڑے ہو کر پوچھنے لگے۔

"بعد میں کرتی ہوں۔" کہہ کر فوزیہ نے فون بند کر دیا اور کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر کھڑی ہو گئی۔

"اباجی! مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔"

ان کے دوٹوک انداز پر سعید صاحب نے گہرا سانس لیا۔ وہ جانتے تھے انہیں کیا بات کرنی ہے۔

"بہو ابھی مجھے ضروری کام سے جانا ہے۔ شام میں بات کرتے ہیں۔" ان کا انداز سرسری ٹالنے والا تھا۔

"لیکن مجھے ابھی کرنی ہے تو مہربانی کر کے بیٹھ جائیں۔" ان کے انداز پر چار و ناچار سعید صاحب کو بیٹھنا پڑا۔

"اباجی! بہت دفعہ بہت طریقے سے میں آپ

سے بات کر چکی ہوں، غفران انابیہ سے شادی کرنا چاہتا ہے پر ہر بار آپ مجھے ٹال دیتے ہیں۔ اگر آپ کی مرضی نہیں تو پسند وہ بھی مجھے نہیں لیکن میں غفران کی وجہ سے مجبور ہوں، اس کی ایک ہی ضد ہے وہ انابیہ سے شادی کرے گا اور یہ تو آپ بھی جانتے ہیں وہ ضد کا کتنا پکا ہے۔ میں نے اسے ہر طرح سے سمجھا کر دیکھ لیا ہے پر وہ مان نہیں رہا۔ اس کا کہنا ہے اگر آپ آرام سے مان جاتے ہیں تو ٹھیک ورنہ وہ زبردستی بھی یہ کام کر سکتا ہے۔"

سعید صاحب جو سر جھکائے ان کی باتیں سن رہے تھے جھٹکے سے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

"ابا جی مجھے بتائیں، میرے بھائی میں کس بات کی کمی ہے جو آپ یوں ٹال مٹول کر رہے ہیں۔ اپنا گھر ہے۔ گاڑی ہے، چلتا کاروبار ہے اور سب سے بڑھ کر انابیہ کو چاہتا ہے۔"

"تمہارا بھائی کیسا ہے بہو! تم خود بھی جانتی ہوں جو کام وہ کرتا ہے جس طریقے سے کماتا ہے۔ تم بھی جانتی ہو اور جو اس کی عادتیں ہیں، وہ بھی تمہیں پتا ہیں۔ خود دو بیٹیوں کی ماں ہو اپنے ایمان سے بتانا ایسا داماد تمہاری پسند ہوتا؟"

سعید صاحب کا کہنا ہی تھا کہ فوزیہ جو بڑی مشکل سے مہذب طریقے سے بات کر رہی تھیں انہیں پتنگے لگے تھے۔

"میری بیٹیوں کو بیچ میں مت لائیں۔" وہ انگلی اٹھا کر جیسے انہیں تنبیہ کرتی ہوئی بولیں۔

"میری بیٹیوں کا اس آوارہ ماں کی بیٹی سے کیا مقابلہ، آپ جتنا بھی چھپا لیں۔ کیا اس کی ماں کے کرتوتوں کا مجھے پتا نہیں بلکہ مجھے کیا ساری دنیا کو پتا ہے حتیٰ کہ اس نازک پھولوں کی رانی اور پاکدامن بی بی جس کا مقابلہ آپ میری بیٹیوں کے ساتھ کر رہے ہیں۔ اس کے تو باپ کا بھی پتا نہیں جبکہ میری بیٹیوں کے ساتھ ان کے باپ کا نام اور حوالہ دونوں موجود ہیں۔"

فوزیہ کا غصے کے مارے جبکہ سعید صاحب کا ضبط کے مارے چہرہ لال ہو چکا تھا۔

"اور الحمدللہ میرے بھائی کے ماں باپ کا بھی پتا ہے اور مرد کی کمائی دیکھی جاتی ہے اور لوگوں کے نزدیک یہ بات اہمیت رکھتی ہے۔ اس کے پاس کتنی دولت ہے، کیسے آئی اس سے کسی کو کیا مطلب؟ میرے بھائی کو لڑکیوں کی کمی نہیں۔ ابھی باہر نکلو، نا تو آپ کی لاڈلی سے زیادہ خوب صورت اور صاحب حیثیت لڑکی یوں منٹوں میں لوگ دینے کو تیار ہو جائیں گے۔ لیکن میرے بھائی کی آنکھوں پر اس کے حسن کی پٹی بندھ چکی ہے وہ اندھا ہو چکا ہے۔ اسے فرق نہیں پڑتا کہ وہ جائز ہے یا ناجائز۔"

"بس بہو!" اس سے پہلے وہ مزید زہر اگلتیں سعید صاحب نے غصے سے ہاتھ اٹھا کر انہیں روکا۔

"جو بات تم نہیں جانتیں اس کے بارے میں اتنے بڑے بول نہ بولو۔ بہو! اس بچی کے لیے ہمیشہ اتنی بے رحمی برتتی ہو ڈرو اللہ سے۔"

"اب ڈروں بھی میں، کرتوت ماں بیٹی کے عجیب اور ڈروں میں، ماں نے پتا نہیں شادی کی بھی تھی یا نہیں اور بچی لے کر آ گئی۔ اور بیٹی خوبصورتی کیش کروا رہی ہے۔ محلے کا ہر لڑکا اس کے پیچھے، اتنی نیک ہے تو لڑکے کیسے اس کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔"

"بس کرو بہو! میں بار بار کہہ رہا ہوں بڑے بول نہ بولو اس کا باپ ہے اور بہت معزز اور امیر آدمی ہے اتنا امیر کہ تمہاری سوچ ہے۔" غصے کے مارے وہ بول پڑے تھے۔

"اچھا!" ان کی بات کو فوزیہ نے ہوا میں اڑایا تھا۔ "تو کہاں ہے اس کا باپ؟ چلو کروڑوں کی جائیداد کو چھوڑو نام ہی دے دیتا کیوں باپ کی جگہ اس کا نام انابیہ گل ہے۔ کوئی احمد، سرفراز، مشتاق کیوں نہیں ہے۔" وہ استہزائیہ انداز میں بولی تھیں۔

"تم سے بات کرنا بے کار ہے۔" سعید صاحب نے غصے سے سر جھٹکا۔

"بات کو تالیں نہیں ابا جی! یہ میں اور میرا بھائی

ہیں جو اتنی چاہت سے رشتہ مانگ رہے ہیں ورنہ ایسی لڑکیوں کو کوئی اپنے گھر کی عزت نہیں بناتا۔"

"مجھے تمہارے یا تمہارے بھائی کی چاہت کی ضرورت نہیں۔ میری انابیہ چاہے جانے کے قابل ہے اور اس کے وارث اس کے محرم اسے پوری چاہت سے لے کر جائیں گے۔"

وہ ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اتنے یقین سے بولے کہ وہ ساکت کھڑی رہ گئیں۔ ان کے جاتے ہی وہ جیسے ہوش میں آئیں۔ انہوں نے تیزی سے موبائل اٹھایا تھا۔

☆☆☆

وہ دونوں ہاتھوں میں سر گرائے پارکنگ کے فٹ پاتھ پر بیٹھے تھے انہیں ایک ماہ سے زیادہ ہو گیا تھا یہاں آتے پہلی دفعہ کے بعد سے انہیں دوبارہ اندر جانے کی اجازت نہیں ملی تھی۔ اب تو انہیں دیکھ کر گارڈ بھی ماتھے پر بل ڈال لیتا تھا۔ ابھی بھی اس کے روکھے لہجے پر وہ مایوس ہو کر پارکنگ میں آ گئے تھے۔ فوزیہ کے سامنے وہ اتنے بڑے دعوے کر آئے تھے لیکن اب آگے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ تب ہی مردانہ آواز پر انہوں نے نظریں اٹھا کر سامنے دیکھا انہیں لگا جیسے کسی نے ان میں روح پھونک دی ہو۔ وہ تیزی سے اٹھ کر اس کی طرف بڑھے وہ جو اپنے سکریٹری اور ڈرائیور کے ساتھ اپنی کار کی طرف بڑھ رہا تھا۔ سامنے سے آتے شخص کو دیکھ کر نہ صرف ٹھٹکا بلکہ رک گیا۔ اس کے رکتے ہی اس کے ساتھ چلتے دونوں افراد بھی رک گئے تھے۔

"آپ دونوں گاڑی میں میرا ویٹ کریں میں آتا ہوں۔" اس شخص کو اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر اس نے تیزی سے کہا تو وہ دونوں اس شخص کو دیکھ کر آگے بڑھ گئے۔

"آپ دوبارہ آ گئے۔" دونوں ہاتھ ٹراؤزر کی جیبوں میں ڈالتے اس نے سعید صاحب کو دیکھا۔

"بیٹا! میں روز آفس آتا ہوں لیکن یہ لوگ مجھے آپ سے ملنے نہیں دیتے۔" وہ بڑی عاجزی سے بولے۔

"کیا کام ہے آپ کو مجھ سے؟" اس کا لہجہ بہت روکھا تھا۔

"وہ اور باز جیلانی۔"

"میں آپ کو بتا چکا ہوں" حذیفہ ان کی بات کاٹ کر بولا۔

"بیٹا کسی ایک انسان سے جو ان کے گھر کا ہو، مجھے ملوا دیں۔"

"دیکھیں میں آخری بار آپ کو بتا رہا ہوں جن لوگوں کا آپ ذکر کر رہے ہیں۔ وہ اس دنیا میں نہیں اگر آپ کو کچھ مالی مدد چاہیے تو وہ آپ مجھے بتا سکتے ہیں۔"

سعید صاحب کی آنکھیں نم ہوئی تھیں۔

"بیٹا مجھے کچھ نہیں چاہیے بس ان کی امانت ان تک پہنچانی ہے۔"

"میں آپ کا پیغام آل ریڈی ان تک پہنچا چکا ہوں کیا نام ہے؟" وہ سوچنے لگا "عفت گل وہ اس نام کی عورت اور اس کی بیٹی کو نہیں جانتے اور اگر جانتے بھی ہیں تو وہ اس رشتے کو اون نہیں کرنا چاہتے آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ سو آپ آزاد ہیں جیسے چاہیں جو چاہیں اس لڑکی کے لیے کر سکتے ہیں۔"

وہ کندھے اچکا کر لاپروائی سے بولا تو سعید صاحب کتنی دیر بے یقینی سے اس کا چہرہ دیکھتے رہے۔

"انہوں نے ایسا کہا کہ وہ آزاد کرتے ہیں اسے وہ نہیں جانتے۔" انہوں نے خود کلامی کی لیکن حذیفہ نے سن لی تھی۔

"جی ایسا ہی ہے۔ امید ہے آپ کی تسلی ہو گئی ہو گی اب آپ دوبارہ یہاں آ کر مجھے پریشان نہیں کریں گے۔"

اس کے کہنے پر انہوں نے سر جھکا لیا کیونکہ وہ اس کے سامنے رونا نہیں چاہتے تھے لیکن ان کی آنکھوں سے دو قطرے گرے تھے جو اس کی نظروں سے مخفی نہیں رہے تھے۔ اس نے بے ساختہ پہلو بدلا اور بنا رکے تیزی سے چلتا کار کی طرف بڑھا۔

"سر کون تھا یہ شخص؟"

اس کے بیٹھتے ہی نوید اس کے سیکریٹری نے بظاہر سرسری انداز میں پوچھا لیکن اس کا انداز تجسس تھا۔ حذیفہ نے ٹیڑھی اور غصیلی نظر اس پر ڈالی تو وہ سوری کہہ کر سیدھا ہو گیا۔

جب ان کی گاڑی پارکنگ سے نکلی، سعید صاحب وہیں کھڑے تھے۔ انہیں دوپہر سے شام ہو گئی تھی وہ یونہی سڑکوں پر خوار ہو رہے تھے لیکن کب تک وہ یونہی حقیقت سے نظریں چرا سکتے تھے۔ انہیں گھر جانا تھا انابیہ کو حقیقت بتانی تھی لیکن وہ خود میں حوصلہ نہیں پا رہے تھے لیکن آخر کب تک وہ تھک ہار کر گھر کی طرف چل پڑے تھے۔

لیکن شاید ابھی ان کا امتحان ختم نہیں ہوا تھا۔

دروازہ کھلتے ہی انہیں غفران اور فوزیہ کی شکل نظر آئی تھی۔ پتا نہیں کیوں ان کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔

"السلام علیکم چچا جی!" انہیں دیکھ کر غفران کھڑا ہوا اور ہاتھ کے اشارے سے اپنے سامنے رکھے صوفے کی طرف اشارہ کیا وہ بغور دونوں کو دیکھتے ہوئے بیٹھ گئے۔

"چچا جی! بات کو گھما پھرا کر نہیں کروں گا میں انابیہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور پچھلے دو سالوں سے میں مودبانہ گزارش کر رہا ہوں اور آپ مسلسل ٹال مٹول سے کام لے رہے ہیں جو بھی ہوں جیسا ہوں آپ کے سامنے ہوں۔ انکار کی وجہ تو نہیں بنتی اور آج آپا کو آپ نے صاف انکار کر دیا یہ کہہ کر وہ بڑے عزت دار معتبر گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ اگر اس کا تعلق معتبر گھرانے سے ہے تو کمی کمین تو میں بھی نہیں۔"

اب کے وہ دانت پیس کر بولا جیسے بڑے ضبط سے بات کر رہا ہو۔

"بہر حال" اس نے بالوں میں ہاتھ پھیر کر خود کو ریلیکس کیا۔

"آپ مجھے اس کے سوکالڈ معزز خاندان کا بتا دیں جن کا پچھلے دس سالوں سے ہمیں کیا انابیہ کو بھی نہیں پتا۔ میں خود ان سے جا کر انابیہ کا ہاتھ مانگ لیتا ہوں پھر تو آپ کو اعتراض نہیں ہوگا؟"

وہ قدرے آگے کو جھک کر ان کے تنے ہوئے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ کچھ گھنٹے پہلے کا منظر پھر ان کی آنکھوں کے آگے چلنے لگا۔ امیدیں تو سب ختم ہو گئی تھیں وہ اسے ہاں نہیں کرنا چاہتے تھے پر ناں بھی نہیں کر پا رہے تھے۔ انہوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا جو ان کے جواب کا منتظر تھا۔

"بیٹا، اس کی ماں اسے میرے پاس امانت کے طور پر چھوڑ کر گئی تھی کہ اسے اس کے ورثا کے حوالے کر دوں۔" وہ ٹھہر ٹھہر کر بول رہے تھے۔

"وہی تو کہہ رہا ہوں آپ سے، مجھے بتائیں اس کے خاندان والوں کا پتا۔" اب کہ وہ سخت لہجے میں بولا۔ "میں نہیں جانتا انہیں،" وہ نظریں اور سر جھکا کر بولے تو غفران گہرا سانس لے کر صوفے کی پشت سے ٹک گیا۔ جبکہ خاموش بیٹھی فوزیہ نے استہزائیہ انداز میں ابرو اچکائے۔

"جب آپ جانتے ہی نہیں تو اتنا لمبا ڈرامہ کیوں اور جہاں تک اس کی ماں کی بات ہے تو وہ عورت" وہ طنزیہ بولیں۔ "مر چکی ہے مرے ہوئے لوگوں کے ساتھ ان کی باتیں بھی ختم ہو جاتی ہیں۔" سعید صاحب جھکے سر کے ساتھ چونکے تھے۔

"اب آپ اس کے سرپرست ہیں فیصلہ آپ کا ہوگا جو کہ مجبوراً یا خوشی سے آپ کو میرے حق میں کرنا ہوگا۔ اور انابیہ کو آپ کیسے میرے حق میں راضی کرتے ہیں وہ بھی خوشی سے یہ میں آپ پر چھوڑتا ہوں اور مزید ٹائم نہیں آپ کے پاس، سات دن ٹھیک سات دن بعد جمعہ والے دن ہمارا نکاح ہوگا یہ بات آپ اچھی طرح سمجھ لیں اگر آپ انابیہ کو راضی نہ کر سکے یا کوئی گیم کھیلنے کی کوشش کی تو نتائج کے ذمہ دار آپ خود ہوں گے۔" وہ اپنی کمیض جھٹکتا ہوا کھڑا ہو گیا اس کے نکلتے ہی فوزیہ بھی اٹھ کر اس کے پیچھے گئی تھیں۔ جبکہ وہ کتنی دیر ویسے ہی ساکت بیٹھے رہے۔

☆☆☆

بستر پر کروٹ بدل بدل کر اب اس کا جسم دکھنے لگا تھا تنگ آ کر وہ اٹھ بیٹھا اس نے پیچھے کی طرف مڑ کر اپنا موبائل اٹھایا رات کے ساڑھے تین بج رہے تھے۔ اس نے گہرا سانس لے کر ٹانگیں بیڈ سے نیچے لٹکالیں اور کتنی دیر یونہی بیٹھا رہا اور پھر ٹی شرٹ پہنتا ہوا باہر نکل آیا۔

پورے گھر میں خاموشی پھیلی تھی۔ یقیناً سب سو رہے تھے۔ وہ ٹی وی لاؤنج سے ہوتا ہوا باہر لان میں آ گیا، گہرے سانس لیتے ہوئے اس نے تازہ ہوا اندر اتارتے ہوئے اپنی تھکن کم کرنے کی کوشش کی تھی۔ دروازہ کھلنے کی آہٹ پر اس نے مڑ کر دیکھا اور شمسہ کو اپنی طرف آتا دیکھ کر وہ کچھ حیران ہوا۔

"پھوپھو آپ جاگ رہی ہیں؟"

"نہیں ابھی آئی تھی۔ تم پر نظر پڑی تو باہر آ گئی۔"

وہ اب اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔

"بس نیند نہیں آ رہی تھی۔" وہ تھکی ہوئی آواز میں بولا۔

"کیوں۔"

"پتا نہیں۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے بالوں کو سنوارا۔

"میں دیکھ رہی ہوں، جب سے اسلام آباد سے آئے ہو، پریشان لگ رہے ہو اب یہ مت کہنا نہیں ہو۔ صاف نظر آ رہا ہے۔" اسے منہ کھولتا دیکھ کر انہوں نے فوراً ٹوک دیا تھا۔

"مجھ سے آفس میں کوئی سعید مرزا ملنے آئے تھے۔" کہنے کے ساتھ اس نے ان کا چہرہ دیکھا جو نارمل تھا۔

"آپ جانتی ہیں اس نام کے کسی شخص کو۔"

"نہیں۔" شمسہ نے حیرت سے اپنی طرف اشارہ کیا۔

"میں تو پہلی بار یہ نام سن رہی ہوں۔"

"لیکن وہ ہماری ساری فیملی کو جانتا تھا۔"

"اچھا!" وہ حیران ہوئیں۔ "وہ عفت گل کی بات کر رہے تھے۔" اب کی بار شمسہ نہ صرف رک گئی تھیں بلکہ چونک کر اسے دیکھنے لگیں۔

"عفت گل کی کیا بات؟"

"انہوں نے کہا اس کے پاس عفت گل کی بیٹی ہے جو اس کے پاس امانت ہے وہ ہمیں لوٹانا چاہتا ہے۔"

شمسہ بیگم کو لگا جیسے ان کا سارا وجود زلزلوں کی زد میں آ گیا وہ بے ساختہ نیچے بیٹھ گئی تھیں۔

"پھوپھو! آپ ٹھیک ہیں۔" ان کے نیچے بیٹھنے پر حذیفہ پریشان ہو کر دوزانوں ہو کر ان کے سامنے بیٹھ گیا۔

"عفت گل اس کے ساتھ تھی۔" ان کی آواز بہت ہلکی تھی۔

"نہیں؟"

"اور اس کی بیٹی۔"

"نہیں"

اس نے پھر وہی لفظ دہرایا۔

"تم نے کیا جواب دیا؟"

وہ پریشانی سے اس کا چہرہ دیکھنے لگیں۔

"میں نے اسے کہا میں کسی کو نہیں جانتا۔"

شمسہ نے بے اختیار سکون کا سانس لیا۔

کچھ دیر بعد حواس بحال ہوئے انہوں نے بغور سامنے بیٹھے حذیفہ کو دیکھا۔

"بات سنو حذیفہ! اس بات کا ذکر تم کبھی گھر میں نہیں کرو گے یہ آج آخری بار تمہارے اور میرے درمیان بات ہو رہی ہے۔ مجھے نہیں پتا عفت گل زندہ ہے یا نہیں۔ لیکن ہمارا اس سے یا اس کی بیٹی سے کوئی لینا دینا نہیں۔"

"پھوپھو! آپ کیسی بات کر رہی ہیں لینا دینا تو ہے یہ آپ بھی جانتی ہیں۔" وہ بے چینی سے بولا۔

"خود پر قابو رکھو حذیفہ!" شمسہ اب کہ سختی سے بولیں۔

"عفت گل وہ ناگن ہے، جو ہماری خوشیاں

ثابت نگل گئی تھی اور وہ جو بیٹی جسے وہ ہماری امانت کہہ رہی ہے پتا نہیں کس کا گناہ ہے جو وہ ہمارے سر منڈھنا چاہ رہی ہے۔'' وہ حقارت سے بولیں۔ تمہاری کچھ نہیں لگتی وہ۔''

''پھوپھو! اس کا ایک اور رشتہ بھی ہے اس گھر اور گھر والوں کے ساتھ۔''

حذیفہ کے جتاتے ہوئے انداز پر وہ ماتھے پر بل ڈال کر اسے دیکھنے لگیں۔

''جس سے رشتہ جڑا ہے وہ مانے گا؟''

ان کا انداز جتاتا ہوا تھا۔ ''اس گھر میں دوبارہ طوفان آجائے جس رشتے کی تم بات کر رہے ہو وہ جڑے گا نہیں بلکہ کئی زخموں کو پھر کریدے گا اور سب سے زیادہ واویلا تمہاری ماں مچائے گی۔ اس گھر کی عورتوں کو نفرت ہے عفت گل سے اور اس کی بیٹی سے اور اگر اس کی بیٹی یہاں آگئی تو۔'' انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی جبکہ حذیفہ کا سر بھی جھکا تھا۔

''پھوپھو! میں اچھا فیل نہیں کر رہا، میرے انکار پر جو ناامیدی اس بوڑھے شخص کے چہرے پر اتری تھی وہ میری نظر میں مجھے مجرم بنا دیتی ہے۔ اور پرسوں جب میں ان سے روڈ ہوا تو ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں سو نہیں پا رہا پتا نہیں وہ واقعی مجبور ہوں۔ عفت گل یا اس کی بیٹی کسی مشکل میں ہوں۔'' وہ واقعی مضطرب لگ رہا تھا۔ اس کی اتنی بے چینی شمسہ کو پریشان کر رہی تھی۔

''حذیفہ! جذبات میں آکر کوئی غلط قدم مت اٹھا لینا۔ تم سب چیزوں کے گواہ ہو جو ہم نے برداشت کی ہیں۔ ساری عمر کی محرومی، یہ یتیمی تم نے دیکھی ہے یہ اس عورت کی وجہ سے ہے وہ قابل رحم نہیں ہے۔ سو پلیز خود کو کنٹرول رکھو، بہت مشکل سے سب نارمل ہوا ہے۔ گھر میں خوشیاں آرہی ہیں۔ سو پلیز میرے بچے! اپنے دماغ سے یہ بوجھ اتار دو کہ تم کسی کے مجرم ہو۔ مجرم ہماری عفت گل ہے۔ ہماری زندگی کا سیاہ باب ہے۔ جسے اب کوئی یاد کرنا نہیں چاہتا۔ لہٰذا بھول جاؤ اور مطمئن ہو جاؤ تم نے کچھ غلط نہیں کیا۔''

وہ اس کا چہرہ تھپتھپا کر بولیں تو وہ سر ہلا کر مسکرا دیا جب کہ کمرے میں آتے ہی ان کی نیند اور اطمینان دونوں رخصت ہو گئے تھے۔ برسوں پہلے جو راز دفن ہو گئے تھے انہیں دفن ہی رہنا چاہیے تھا۔

☆☆☆

کئی دن سے ان کے سینے میں ہلکا ہلکا درد تھا لیکن پرسوں سے درد کچھ زیادہ ہو رہا تھا لیکن پھر بھی وہ اسے نظر انداز کر رہے تھے۔ ابھی بھی درد کی ایک شدید لہر ان کے سینے میں اٹھی جسے انہوں نے ہونٹ بھینچ کر برداشت کرنے کی کوشش کی تھی اور کچھ دیر بعد درد خود بخود کم ہو گیا تھا۔ انہوں نے بے جان ہوتے ہاتھوں کے ساتھ پانی کا گلاس پکڑ کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ تب ہی انابیہ سبزی کی ٹوکری لے کر ان کے سامنے آکر بیٹھ گئی وہ بغور اسے دیکھ رہے تھے جو پتا نہیں کون سا قصہ انہیں سنا رہی تھی۔ مسلسل خاموشی پر اس نے سامنے دیکھا جو زیر لب مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہے تھے۔

''بابا میں آپ کو کوئی لطیفہ سنا رہی ہوں؟'' وہ نروٹھے پن سے بولی۔

''نہیں میں کچھ سوچ رہا تھا۔''

''کیا؟''

وہ ہاتھ روک کر انہیں دیکھنے لگی۔

''جب تم چھوٹی تھیں تو گن کے چار پانچ جملے بولتی تھی اب تو بمشکل چپ ہوتی ہو۔'' ان کا انداز شرارتی تھا۔

''میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔ آپ کو کیا پتا سارا دن میں خاموش ہی ہوتی ہوں میں ہوتی ہوں اور یہ دیواریں، آپ آتے ہیں تو کوئی بات کرنے والا کوئی ملتا ہے۔''

اس نے عام سے انداز میں بات کی تھی پر انہیں بہت محسوس ہوئی تھی۔

''میں جانتا ہوں بیٹا مذاق کر رہا تھا۔ تم تو میری بولتی مینا ہو جس کی وجہ سے میرے گھر میں اور میری

زندگی میں رونق ہے۔'' انابیہ نے پیار سے ان کی طرف دیکھا۔

''مجھے پتا ہے بابا! جب میں بولتی ہوں تو آپ خوش ہوتے ہیں۔ اسی لیے میں زیادہ باتیں کرتی ہوں۔'' وہ خوشی خوشی بتانے لگی۔

''میری بیٹی باتیں اتنی پیاری کرتی ہے کیسے خوشی نہیں ہوگی۔''

ان کی بات پر اس کی مسکراہٹ سکڑ گئی تھی۔

''بولنا تو میں نے آپ کے پاس آ کر سیکھا ہے بابا ورنہ میری باتیں تو میری ماں کو بھی اچھی نہیں لگتی تھیں پہلے ان کے پاس میرے لیے ٹائم نہیں ہوتا تھا جب بھی وہ گھر میں ہوتیں تو انہیں میری موجودگی اچھی نہیں لگتی تھی۔ باتیں تو دور کی بات ہے۔ جب وہ بیمار ہوئیں تو میرے پاس ان سے کہنے کے لیے کچھ بچا ہی نہیں تھا۔''

''اچھا چھوڑو پرانی باتیں یہ بتاؤ آج کیا بنا رہی ہو۔'' انہوں نے بات بدل دی وہ سبزی کاٹ کر کھڑی ہوئی تو وہ بھی کھڑے ہوگئے۔

''آپ کہاں جا رہے ہیں۔'' انہیں جوتے پہنتے دیکھ کر اس نے پوچھا۔

''واجد کی طرف جا رہا ہوں۔'' انہوں نے اپنے دوست کا نام لیا۔

''اچھا جلدی آیئے گا مجھے اکیلے ڈر لگتا ہے۔'' وہ اس سے کہنے لگے تھے۔ نیچے چلی جایا کرے لیکن ان کا رویہ یاد آتے ہی وہ رک گئے۔ اور سر ہلا کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے۔

☆☆☆

چائے کی پیالی سامنے میز۔ پر رکھتے ہوئے انہوں نے بغور سر جھکائے سعید صاحب کو دیکھا۔

''پریشان لگ رہے ہو۔'' ان کے سامنے بیٹھے واجد صاحب نے سوال کیا۔

''ہاں۔'' انہوں نے انکار نہیں کیا تھا۔

''خیریت ہے؟'' واجد صاحب کے پوچھنے پر انہوں نے مختصراً انہیں جیلانی فیملی کے بارے میں بتایا تھا۔

''پھر تم نے اب کیا سوچا ہے۔''

''سوچنے کے لیے اب کچھ بچا ہی نہیں۔''

وہ مایوسی سے بولے۔ ''پہلے انابیہ کو لے کر پریشان تھا کیا بتاؤں اس کو اور اب فوزیہ اور اس کے بھائی نے نیا شوشا چھوڑ دیا ہے۔ میں کیسے انہیں سب بتاؤں وہ میری بات کا یقین نہیں کریں گے۔ غفران مجھ سے اس کے اپنوں کا ثبوت مانگ رہا ہے تو کیا کہوں وہ تو جیسے کہیں غائب ہی ہوگئے ہیں اور جو امید تھی وہ بھی ختم ہوگئی، اس لڑکے نے کہا انابیہ آزاد ہے مطلب ان لوگوں نے اسے ایسا کہنے کو کہا ہوگا۔

میں خود کو بہت بے بس محسوس کر رہا ہوں۔

واجد! وہ اب چہرہ اٹھا کر انہیں دیکھنے لگے۔

''غفران انابیہ سے شادی کرنا چاہتا ہے تم بتاؤ میں کیسے جانتے بوجھتے اس بچی کو اس کے نکاح میں دے دوں وہ تو اس کے سائے سے بھی خوف کھاتی ہے اور میں جو اسے اس کے اپنوں کی کہانی سناتا تھا جس کے انتظار میں وہ کتنے سالوں سے ہے کیسے اسے کہہ دوں وہ حقیقت نہیں فریب تھا بھول جاؤ سب، کیا بھولنا اتنا آسان ہے۔'' کہہ کر وہ خاموش ہوگئے تھے۔

کچھ دیر کے بعد کچھ یاد آنے پر انہوں نے جیسے چونک کر واجد صاحب کو دیکھا تھا۔

''واجد کچھ عرصہ پہلے تم نے بھی انابیہ کے لیے خواہش کا اظہار کیا تھا؟''

''ہاں لیکن تم نے ہی منع کر دیا تھا۔''

''ہاں'' تب بات اور تھی کیا تمہیں اب بھی انابیہ سے شادی کرنا چاہتا ہے؟'' وہ بڑی امید سے واجد صاحب کا چہرہ دیکھ رہے تھے جن کے چہرے کا رنگ پھیکا ہوگیا تھا۔

''تم اس سے بات کرو میں نکاح کے لیے تیار ہوں۔''

''وہ اب نہیں مانے گا کیونکہ اس کی ماں اس کا رشتہ طے کر چکی ہے۔'' وہ ان سے نظریں نہیں ملا رہے

تھے اور سعید صاحب جانتے تھے وہ جھوٹ بول رہے ہیں، وہ خاموش ہوگئے تھے۔

''سعید! میری مانو تو انابیہ کی شادی غفران سے کروادو کیونکہ جتنا فوزیہ، انابیہ اور اس کی ماں کی کو بدنام کرچکی ہے کوئی بھی انابیہ کو اپنانے کے لیے تیار نہیں ہوگا۔''

''فوزیہ جھوٹ بولتی ہے واجد! عفت گل نے اگر کوئی غلطی یا گناہ کیا ہے تو وہ اس کا عمل تھا اس میں میری معصوم بچی کا کیا واسطہ، وہ معصوم تو آج تک کبھی گھر سے اکیلی نہیں نکلی کوئی سہیلی نہیں کسی غیر آدمی کے سامنے نہیں جاتی۔ وہ تو پاکیزہ ہے تو کوئی کیسے اسے اپنانے سے انکار کرے گا۔''

''بات اس کے علاوہ بھی ہے سعید!'' وہ نظریں چراتے ہوئے بولے۔

''مجھے پتا ہے تمہیں برا لگے لیکن دوست ہونے کے ناتے میرا فرض ہے کہ میں تمہیں آگاہ کروں کہ لوگ پیٹھ پیچھے کیا باتیں کرتے ہیں۔'' کہہ کر وہ رکے تھے جیسے آگے کی بات کے لیے مناسب الفاظ ڈھونڈ رہے ہوں۔

''لوگ کہتے ہیں کہ تم انابیہ کی شادی ہی نہیں کرنا چاہتے کیونکہ''

انہوں نے کہنے سے پہلے گلا تر کیا کیوں کہ سعید صاحب انہیں دیکھ رہے تھے ''کیوں کہ تمہاری خود کی نظر ہے اس پر۔''

واجد صاحب کی بات پر پہلے تو وہ ساکت رہ گئے اور پھر ایک دم ان کی مٹھیاں بھینچ گئی تھیں اور چہرے کا رنگ خطرناک حد تک سرخ پڑ گیا تھا۔

''واجد'' وہ چیخ پڑے تھے۔ ''ہوش میں ہو تم کیا کہہ رہے ہو۔ وہ بچی میری بیٹی، میری نواسی کی عمر کی ہے۔ اس کی ماں میری بیٹی کی طرح تھی۔ اتنی گندی بات تمہارے دماغ میں آئی بھی کیسے؟''

ان کا بس نہیں چل رہا تھا سامنے بیٹھے اپنے دوست کا چہرہ تھپڑوں سے لال کردیں۔

''سعید! میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا میں تمہیں صرف وہی بتا رہا ہوں جو لوگ کہہ رہے ہیں۔ اس محلے سے ہی پانچ چھ رشتے انابیہ کے لیے گئے تھے۔ لیکن تم نے سب کو انکار کردیا۔ وہی لوگ اب ایسی بات کررہے ہیں۔ کچھ ان باتوں کو رنگ دینے والی تمہاری اپنی بہو ہے۔ اسی لیے تم سے کہہ رہا ہوں جتنی جلدی ہوسکے انابیہ کی شادی کردو اور اس وقت غفران سے زیادہ موزوں کوئی رشتہ نہیں۔''

وہ تو جیسے سن ہو کر رہ گئے تھے۔ دماغ میں جیسے دھماکے ہورہے تھے۔ ان کی ساری عمر کی نیک نامی انہیں تنکوں کی طرح ہوا میں اڑتی محسوس ہورہی تھی۔ اگر ایسی بات انابیہ نے سن لی تو وہ پریشان ہوا ٹھے۔

''سعید! میرے بھائی!''

سعید صاحب نے انہیں صرف ہاتھ اٹھا کر بات کرنے سے روک دیا۔ ان کے قدم گھر کی طرف اٹھے تھے۔ صرف ایک محرم رشتہ نہ ہونے کی وجہ سے اتنا گھناؤنا الزام! غصے کے بعد دوسرا احساس بے بسی کا تھا جو ان کی آنکھوں میں آنسو لے آیا تھا۔ اور جو فیصلہ وہ کتنے عرصے سے نہیں کرپا رہے تھے وہ اس ایک پل میں ہوگیا تھا انہیں اپنی انابیہ کو ایک ایسا رشتہ دینا تھا جو محرم ہو جس کے لیے اسے معاشرے کو جواب دہ نہ ہونا پڑے۔

☆☆☆

''آپ نے اچانک آکر مجھے سرپرائز کردیا۔'' حذیفہ نے طالب کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''تم جانتے ہو مجھے سرپرائز کرنا اچھا لگتا ہے۔'' وہ مسکراتی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

''جانتا ہوں لیکن اس بار لگتا ہے سرپرائز بڑا ہے۔'' اس نے شرارتی انداز میں اسے دیکھا۔

''مطلب؟'' طالب نے ابرو اچکائے۔

''مطلب تو آپ ہی بتائیں گے۔'' وہ اب بھی مسکرا کر بولا۔

''او بھائی میرے دماغ میں پہلے ہی دس چیزیں چل رہی ہوتی ہیں تم بتاؤ تم کس کی بات

کررہے ہو۔"

"وہ جسے آپ ساتھ لائے ہیں۔"

حذیفہ نے اس کے پیچھے اشارہ کیا جہاں انعم اپنے لیے شاپنگ کررہی تھی۔

"اچھا۔" وہ مسکرا کر بولا تب ہی ویٹر کافی اور اسنیکس لے کر آیا تو وہ دونوں خاموش ہوگئے۔

"یہ کوئی سرپرائز نہیں کزن ہے بس پاکستان دیکھنا چاہتی تھی تو ساتھ لے آیا۔" وہ کندھے اچکا کر بولا۔

"لیکن گھر والے تو کچھ اور ہی سوچ رہے ہیں۔"

حذیفہ نے کافی کا مگ اٹھاتے جیسے اس اطلاع دی۔

"جانتا ہوں۔" اب کی بار وہ سنجیدگی سے بولا۔

"پھر؟"

"پھر کیا؟" حذیفہ کے پوچھنے پر طالب نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"اچھی لڑکی ہے، آپ کو سوچنا چاہیے کیونکہ بڑی مما آپ کو لے کر پریشان ہیں۔"

"مما کی تو عادت ہوگئی ہے۔" وہ سر جھٹک کر بولا۔ "تم جانتے ہو میرے نزدیک عورت نامی مخلوق سب سے زیادہ ناقابل اعتبار ہے اور شادی کا مطلب پیار اور اعتبار کا رشتہ یعنی سب سے مضبوط رشتہ اور میرے نزدیک سب سے کمزور اور ناقابل اعتبار رشتہ۔" وہ تلخی سے بولا۔ تو کچھ دیر کے لیے حذیفہ بول ہی نہیں سکا۔

"بھائی سب عورتیں ایک جیسی نہیں ہوتیں۔ کیا ہماری مائیں اس بات کا ثبوت نہیں۔ آپ سب وہم دل سے نکال کر آگے بڑھیں۔"

طالب نے گہرا سانس لے کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی۔

"مجھے خوب صورت چہروں سے خوف آتا ہے۔ ان چہروں کے کئی روپ ہیں۔ معصوم، شوخ، دلربا لیکن ہر روپ میں ناگن جو پہلے اپنی اداؤں سے پھانستی ہیں۔ اپنے شکنجے میں کستی ہیں اور آخر اپنے زہر سے جان لے لیتی ہیں۔" اس کے چہرے پر اذیت تھی، حذیفہ نے وہ اذیت خود بھی محسوس کی تھی۔

"بھائی میں نے کہا نا سب ایک جیسی نہیں ہوتیں۔"

"نہیں ہوتی ہوں گی لیکن میں کسی لڑکی سے محبت نہیں کرسکتا کیونکہ مجھے اس لفظ پر اس جذبے پر یقین نہیں۔" حذیفہ جیسے ریلیکس ہوکر مسکرایا۔

"جب آپ کو محبت ہوگی ناں پھر آپ سب بھول جائیں گے اور اعتبار بھی آجائے گا۔"

اس کے شرارتی انداز پر طالب ایسے مسکرایا جیسے کوئی بچے کی بچکانہ بات پر مسکراتا ہے۔

"مجھے کبھی کسی لڑکی سے محبت نہیں ہوسکتی۔" وہ پورے یقین سے بولا تھا۔ "پتا ہے مجھے کہ آپ کے دل کی جگہ پتھر فٹ ہے چلیں آپ محبت نہ کریں بس شادی کرلیں۔" اس کے کہنے پر وہ سر جھٹک کر رہ گیا۔

"میری چھوڑو، تم اپنی کہو۔" اب کے طالب نے بغور اسے دیکھا۔

"میرا کیا ہے سادہ سا بندہ ہوں کھلی کتاب جیسا جسے ہر کوئی پڑھ سکتا ہے۔ آپ کی طرح مسٹری مین نہیں ہوں۔" وہ اب اپنا سینڈوچ اٹھاتے ہوئے شرارت سے اسے دیکھ کر بولا۔ "مسٹر سیدھی سادی کتاب! مجھے مشورے دینے کے بجائے خود شادی کرلو گھر کی خواتین کو شادی سے مطلب ہے اب چاہے وہ میری ہو یا تمہاری۔"

"بڑے آپ ہیں۔"

"صرف تین سال۔"

"جو بھی ہے پہلے آپ کی ہوگی۔" اس سے پہلے طالب مزید کچھ کہتا انعم اپنی شاپنگ کرکے آگئی تھی اس کے آتے ہی دونوں نے اپنا موضوع بدل دیا تھا۔

☆☆☆

وہ کب سے بیٹھی منتظر نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی جنہوں نے اسے خاص بات کے لیے بلایا تھا پر اب سر جھکائے پتا نہیں کن سوچوں میں گم تھے۔

"بابا!" اسے اس خاموشی سے خوف آرہا تھا۔

اس لیے بے ساختہ انہیں پکار بیٹھی انہوں نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر کتنی دیر دیکھتے رہے ان کے انداز اسے ہولا رہے تھے وہ اٹھ کر گھٹنوں کے بل ان کے سامنے بیٹھ گئی۔

"بابا کیا ہوا بتائیں مجھے۔"

"انابیہ! تم مجھ پر کتنا یقین کرتی ہو۔"

"میں خود سے زیادہ آپ پر یقین کرتی ہوں۔" وہ ایک لمحہ بھی سوچے بغیر تیزی سے بولی تھی۔

"کیا تمہیں لگتا ہے کہ میں تمہارے لیے کچھ برا کروں گا یا برا سوچوں گا۔"

"آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں؟" وہ اب نم لہجے میں بولی تھی۔

"یہ میرے سوال کا جواب نہیں بیٹا۔"

"بابا نہ مجھے اپنے بابا یاد ہیں نہ میری ماں کے ساتھ میری کوئی خاص یادیں ہیں۔ آپ نے مجھے ماں باپ دونوں بن کر پالا ہے میں کیسے آپ کی کسی بات پر انکار کر سکتی ہوں۔"

"اگر میں تمہارے لیے کوئی فیصلہ کروں تو کیا تم اسے قبول کرو گی۔"

آپ حکم کریں بابا!" وہ مسکرا کر پر یقین لہجے میں بولی۔ اس کی مسکراہٹ دیکھ کر سعید صاحب نے ایک پل کے لیے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

"میں نے تمہاری اور غفران کی بات طے کر دی ہے اگلے جمعے کو نکاح ہے تمہارا۔"

وہ کتنی دیر ان کا چہرہ دیکھتی رہی جیسے امید ہو کہ ابھی وہ مسکرا کر کہہ دیں گے کہ وہ مذاق کر رہے تھے لیکن ان کا جھکا سر اس کے خیال کی نفی کر گیا تھا۔

"بابا!"

"انابیہ! میری گڑیا! اپنے بابا سے کوئی سوال نہ کرنا تمہارے کسی سوال کا جواب میرے پاس نہیں، میں جانتا ہوں میری غلطی ہے میں نے تمہیں غلط آس دلائی تھی تم نے صحیح کہا تھا ڈھونڈا انہیں جاتا ہے جو گم ہو جاتے ہیں جو ملنا ہی نہ چاہیں جو کوئی رشتہ نہ رکھنا چاہیں۔ انہیں ڈھونڈ کر بھی کیا فائدہ..... تمہارا بابا تمہاری ماں سے کیا وعدہ پورا نہیں کر سکا۔

میری امید ختم ہو گئی ہے۔ اب ان کی تلاش بے کار ہے۔ میری زندگی کا کوئی بھروسا نہیں آج ہوں کل نہیں ہوں میں تمہیں یوں اکیلا چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا۔ اسی لیے تمہارے لیے کوئی مضبوط رشتہ چاہتا ہوں، جس پر دنیا کوئی سوال نہ اٹھا سکے۔ غفران تمہیں پسند کرتا ہے وہ تم سے کوئی دل لگی نہیں کر رہا وہ تمہیں اپنانا چاہتا ہے تب ہی تو بار بار انکار کے باوجود پیچھے نہیں ہٹا۔ پہلے مجھے امید تھی لیکن اب کچھ ایسا نہیں رہا جس کی وجہ سے میں تمہیں مزید لٹکا کر رکھوں۔" وہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔ جبکہ وہ سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔

یوں ہی اسے یونہی خاموش دیکھ کر سعید صاحب نے اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھا۔

"انابیہ! میں جانتا ہوں میں غلط کر رہا ہوں لیکن میں مجبور ہوں۔ مجھے پروا نہیں لوگ مجھے کیا کہتے ہیں۔ مجھے پروا یہ ہے کہ میری پاک دامن بیٹی کے آنچل پر بدنامی کا ذرا سا بھی دھبہ نہ لگے۔" ان کا لہجہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ انابیہ نے زور سے گہرا سانس لیا اور سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

"بابا مجھے آپ پر پورا یقین ہے آپ نے جو بھی فیصلہ کیا ہے مجھے منظور ہے۔" اس نے اپنے سر سے ان کا ہاتھ بڑی عقیدت سے اپنے دونوں ہاتھوں میں تھاما تھا۔ وہ بھیگی آنکھوں کے ساتھ مسکرائے تو انابیہ بھی مسکرا دی یہ الگ بات تھی کہ دونوں کی مسکراہٹ میں کرب نمایاں تھا۔

☆☆☆

سعید صاحب ابھی ابھی وہاں سے اٹھ کر گئے تھے۔ جبکہ پیچھے بیٹھے پانچوں نفوس بے یقین سے تھے

لیکن ہر ایک کی بے یقینی کا الگ عالم تھا۔

''ابا جی اتنی جلدی مان گئے۔'' فوزیہ سب سے پہلے بولی تھیں۔

''دادا جی کی تو خیر ہے میں تو انابیہ کے بارے میں سوچ رہی تھی وہ کیسے مان گئی۔'' غفران جو خوش گوار حیرت میں مبتلا انابیہ کے تصور میں گم تھا۔ شائنہ کی بات پر ناگواری سے اسے دیکھا۔

''کیوں اس میں حیرت کیا ہے؟'' اس کے انداز پر شائنہ نے گڑبڑا کر ماں کو دیکھا جو آنکھیں نکال کر اسے کچھ الٹا سیدھا بولنے سے روک رہی تھیں۔

''نہیں ماموں! میرا مطلب تھا۔ وہ آپ سے اتنا ڈرتی ہے تو اس لیے۔'' وہ بمشکل بات سنبھالتے ہوئے بولی۔ ''ارے ڈرتی ورتی نہیں بس ڈرامے کرتی ہے بھولے پن کے، ورنہ میرے بھائی جیسا ہینڈسم مرد قسمت والوں کو ملتا ہے۔ ایسے رشتوں کے لیے لوگ جوتیاں گھسا دیتے ہیں اور اسے گھر بیٹھے بغیر محنت کے مل گیا ہے۔''

''خیر آپا! ڈرامے تو نہیں کرتی میری انابیہ واقعی بڑی بھولی ہے۔''

غفران نے بڑے دلار کے ساتھ میری انابیہ کہا تھا۔ یعنی ابھی سے اسے اپنی ملکیت تصور کر لیا تھا۔ فوزیہ اور اس کی بیٹیوں کو یہ بات کافی ناگوار گزری تھی۔

''بھائی جان! آپ بھی کچھ بولیں۔''

کب سے خاموش بیٹھے شکیل صاحب نے چونک کر غفران کو دیکھا۔

''میں کیا کہوں، تم لوگوں کی باتیں سن رہا ہوں۔ ابا جی نے اگر ہاں کی ہے تو ضرور انابیہ کی مرضی سے کی ہوگی ایک بچی اپنے گھر کی ہو جائے گی۔ اس سے اچھا اور کیا ہوگا اور ابا جی بھی اپنی ذمہ داری ادا کر کے اپنے فرض سے آزاد ہو جائیں گے۔'' ان کے کہنے پر جہاں غفران نے خوشی سے سر ہلایا وہیں فوزیہ نے برا سا منہ بنایا تھا۔

''آپا! کل میں آپ کو کچھ پیسے دوں گا انابیہ کے لیے اچھی سی شاپنگ کر لیں لیکن نکاح کا جوڑا میں خود پسند کروں گا۔'' وہ خوشی خوشی اپنی پلاننگ بتانے لگا۔

''تمہیں پتا ہے غفران! کتنی مہنگائی ہے اور پھر اچھی چیزیں مہنگی بھی ہوتی ہیں۔''

''آپا! دس لاکھ دوں گا۔ کافی ہیں یا اور بھی دوں۔'' فوزیہ کے ساتھ شائنہ اور ندا کا منہ بھی کھل گیا تھا۔

''ماموں! ہمیں شاپنگ نہیں کروائیں گے۔'' ندا خوشامدی انداز میں بولی۔

''کیوں نہیں جو تمہیں پسند آئے لے لینا۔''

وہ واقعی کافی خوش لگ رہا تھا جبکہ فوزیہ دل ہی دل میں حساب لگانے لگیں وہ کیسے دس لاکھ کا سلی بخش استعمال کر سکتی ہیں۔

''ذرا جاؤ بیٹا چائے بناؤ اور ماموں کا منہ میٹھا کروائو۔''

شکیل صاحب کے کہنے پر ندا کھڑی ہوئی، جب غفران نے روک دیا۔

''آپ بیٹھیں بھائی جان! میں ذرا اوپر چکر لگا آؤں۔ چائے بھی وہیں پیوں گا۔''

وہ مسکرا کر کھڑا ہو گیا جبکہ فوزیہ کتنی دیر تلملائی ہوئی سیڑھیوں کی طرف دیکھتی رہیں۔

☆☆☆

وہ کتنی دیر سے ہاتھ میں پکڑی چھری کو بے خیالی میں گھما رہی تھی۔ آہٹ پر اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا اور سامنے کھڑے شخص پر نظر پڑتے ہی چھری پر اس کی گرفت سخت ہوئی وہ ٹھوکر نکل کر کھڑی ہو گئی۔ وہ وارفتگی سے اسے دیکھتا ہوا سیدھا اس کے مقابل آ کر کھڑا ہو گیا۔

انابیہ نے نظروں کا زاویہ بدل کر سعید صاحب کے کمرے کی طرف دیکھا۔

''کیسی ہو؟''

''ٹھیک'' کہنے کے ساتھ اس نے چھری واپس

بڑی والی نوکری میں رکھ دی۔
"بیٹھنے کو نہیں کہو گی؟"
"بیٹھیں میں بابا کو بلاتی ہوں۔"
"نہیں میں تم سے ملنے آیا ہوں۔ بیٹھو۔" اس کو یونہی کھڑا دیکھ کر اس نے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ "ابھی تھوڑی دیر پہلے چچا جی ہمارے نکاح کی رضامندی دے کر گئے ہیں میں تم سے پوچھنے آیا ہوں۔ تمہاری رضامندی شامل ہے یا نہیں۔"
وہ تو ایسے پوچھ رہا تھا جیسے وہ انکار کرے گی اور وہ پیچھے ہٹ جائے گا۔ اس کو مسلسل خاموش دیکھ کر غفران کے ماتھے پر بل پڑے تھے۔
انابیہ نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور بے ساختہ سر اثبات میں ہلایا۔ اس کے سر ہلاتے ہی اس کے تاثرات یکسر بدل گئے تھے۔
"انابیہ! میں بتا نہیں سکتا میں کتنا خوش ہوں تمہاری رضامندی میرے لیے بہت اہمیت رکھتی ہے۔ میں تمہیں بہت خوش رکھوں گا۔ جب تمہیں اس دو کمرے کے گھر میں کام کرتا دیکھتا ہوں مجھے بہت برا لگتا ہے اب جب تم میری بنو گی۔ تو کوئی کام کرنے نہیں دوں گا۔"
وہ بڑے جوش سے اپنے خیالات اسے سنا رہا تھا اور وہ بڑے ضبط سے اس کے سامنے بیٹھی سن رہی تھی۔
"میں نے آپا کو پیسے دیے ہیں نکاح کی شاپنگ کے لیے لیکن نکاح کا جوڑا میں خود تمہارے لیے لوں گا بالکل تمہارے شایان شان۔"
وہ کہنے کے بعد مشتاق نظروں سے اسے دیکھنے لگا جو سر جھکائے گود میں رکھے اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔
اس نے بغور اس کے حلیے پر نظر ڈالی وہ ہمیشہ کی طرح عام سے گھسے ہوئے کپڑوں میں بھی خاص لگ رہی تھی۔
"ویسے تو میں چاہتا تھا پوری رقم تمہارے ہاتھ پر رکھتا لیکن آپا کو تو جانتی ہو نا، ناراض ہو جاتیں۔ اس لیے ساری رقم انہیں دے کر آیا ہوں تاکہ کوئی بدمزگی نہ ہو۔ لیکن تم پریشان نہ ہونا۔ سب تمہاری پسند کے مطابق ہوگا۔" وہ اس سے ایسے بات کر رہا تھا جیسے ان کے درمیان بہت بے تکلفی ہو۔
"تم بھی کچھ کہو نا؟"
اب اسے اس کی مسلسل خاموشی محسوس ہوئی تھی۔
"میں کیا کہوں۔" وہ بے چارگی سے بولی۔
غفران نے ماتھے پر بل ڈال کر اس کا پریشان حال چہرہ دیکھا جہاں کوئی خوشی نہیں تھی۔ اس سے پہلے وہ مزید بات کرتا اس کا موبائل بجا تھا، اس نے ناگواری سے موبائل نکالا اور نمبر پر نظر پڑتے ہی اس کے تاثرات بدلے تھے۔
اس نے بے ساختہ سامنے دیکھا لیکن وہ ویسے ہی سر جھکائے بیٹھی تھی۔ وہ بغیر کوئی بات کیے تیزی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ اس کے جاتے ہی انابیہ جھکا سر اٹھا کر گہرے سانس لینے لگی کب سے رکے آنسو تیزی سے بہنے لگے تھے۔
دروازے سے باہر نکلتے ہی اس نے تیزی سے فون آن کیا۔
"ہیلو!" دوسری طرف سے پتا نہیں کیا کہا گیا تھا کہ وہ ماتھے پر بل ڈال کر ہونٹ بھینچ گیا۔
"کیا ہر چیز کا حساب دینا ضروری ہے۔ مجھے کوئی ضرورت نہیں ہو سکتی۔"
"مطلب" وہ چونک کر بولا۔ "دو دن پہلے تک تو سب ٹھیک تھا اچانک کیا ایمرجنسی ہو گئی ہے۔"
دوسری طرف کی بات سنتے ہوئے اس کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔
"اچھا ٹھیک ہے میں سنڈے تک پہنچ جاؤں گا۔" وہ خود کو پرسکون کرتے ہوئے بولا۔
"کل کیسے آؤں میرے باپ کا جہاز نہیں ہے۔" اب وہ غصے سے بولا۔
"کیا تم نے میری سیٹ بک کروا دی ہے۔" وہ پھڑ پھڑا کر رہ گیا۔

"سیٹ کینسل کرواؤ میں وعدہ کرتا ہوں میں سنڈے سے پہلے آجاؤں گا۔"

اب کے وہ خوشامدی انداز میں بولا۔ جواباً پتا نہیں کیا کہا گیا تھا وہ دوبارہ ہونٹ بھینچ گیا اور فون کان سے ہٹالیا اور ٹیبل سے مکا بنا کر گاڑی کے بونٹ پر دے مارا۔ تھوڑی دیر وہیں کھڑے رہ کر اس نے خود کو ریلیکس کیا تھا اور دوبارہ گھر کے اندر داخل ہوا۔

"ارے غفران! تم گئے نہیں ابھی۔" فوزیہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"آپا! آپ ابھی میرے ساتھ شاپنگ پہ چلیں نکاح کی رسم آج رات کو ہی ہوگی۔"

فوزیہ کے ساتھ شائنہ اور ندا نے بھی حیرت سے اسے دیکھا۔

"غفران! ایسا کیا ہوگیا ہے۔ اکلوتے تم میرے بھائی ہو، میرے بھی کچھ ارمان ہیں، کیسے یوں روکھا پھیکا تمہارا بیاہ کردوں۔ پہلے ہی تمہارے ماں باپ نہیں اب بہن کے ہوتے یوں تیسوں کی طرح شادی کرلو گے۔" فوزیہ نے بدقت اپنے لہجے کو رقت آمیز بنایا۔

"لیکن آپا! میرے پاس ٹائم نہیں، مجھے کل واپس آسٹریلیا جانا ہے۔" وہ جھنجلا کر بولا۔

"ہاں تو میرے بھائی خیر سے جاؤ، یہ شادی ہے مذاق تو نہیں، تم اپنا سوچ رہے ہو۔ انابیہ کا بھی تو سوچوں۔ لڑکی ہے اس کے بھی اپنی شادی کے کچھ ارمان ہوں گے، پہلے ہی بے چاری کے ماں باپ نہیں۔ اب بے چاری منہ سے کچھ نہیں کہتی اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ اس کے کوئی ارمان نہیں ہوں گے اور پھر تم یوں کرو گے تو اسے لگے گا کہ تمہیں بھی اس کی خوشی کا احساس نہیں۔ نکاح کر کے اس پر احسان کررہے ہو اور دوسرا آج نکاح کرو گے کل چلے جاؤ گے تو وہ بے چاری پھر بیچ میں لٹکتی رہے گی۔"

غفران کے تنے ہوئے تاثرات ڈھیلے پڑے تھے اور فوزیہ نے جیسے سکون کا سانس لیا۔

"لیکن آپا میں یوں نہیں جاسکتا۔ پتا نہیں مجھے آنے میں کتنی دیر لگتی ہے اور اگر اس دوران چچا جی یا انابیہ کی نیت بدل گئی تو، میں رسک نہیں لے سکتا۔" وہ ایک بار پھر پٹڑی سے اترنے لگا۔ فوزیہ نے دانت پیستے ہوئے اس عاشق کو دیکھا۔

"تو کون کہتا ہے تم کوئی رسم کیے بغیر چلے جاؤ۔"

"ابھی منگنی کرلیتے ہیں جب تم آؤ گے تو دھوم دھام سے شادی کریں گے۔"

"منگنی" اس نے پرسوچ انداز میں دہرایا۔

"ہاں منگنی اس کے ہاتھ میں تمہارے نام کی انگوٹھی کا مطلب ہے وہ تمہاری ہے۔" فوزیہ نے جیسے اسے یقین دلایا تھا۔

"وہ میری ہے۔" اس دوران وہ پہلی بار مسکرایا تھا۔

☆☆☆

اس نے پتھرائی نظروں سے سامنے رکھے جھلملاتے جوڑے کو دیکھنے کے بعد پاس کھڑی شائنہ کو دیکھا۔

"جلدی سے تیار ہوجاؤ نیچے سب انتظار کررہے ہیں۔" کہہ کر وہ باہر نکل گئی جبکہ اس کا اپنی ٹانگوں پر کھڑا رہنا مشکل ہوگیا تھا۔

تب ہی دستک دے کر سعید صاحب اندر آئے۔ "بابا!" وہ تیزی سے ان کی طرف مڑی۔

"آپ نے تو کہا تھا جسے کو تو پھر آج کیوں۔" وہ خوف نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

"یہ تو ہونا ہی تھا۔ کیا فرق پڑتا ہے اگر آج ہورہا ہے۔" انہوں نے خود کو سنبھالتے ہوئے لاپروائی سے کہا تو وہ کتنی دیر انہیں دیکھتی رہی۔

غفران کو واپس جانا ہے اس لیے نکاح نہیں ہورہا صرف منگنی ہے۔

اس کی واپسی پر اب نکاح کے ساتھ رخصتی بھی ہوگی۔" ان کا انداز سپاٹ تھا۔

انابیہ نے نظریں جھکالیں ان کا انداز اسے بتا رہا تھا وہ جبھی اب اس سے جان چھڑانا چاہتے ہیں وہ مزید کوئی بات کیے بیڈ پر پڑا جوڑا اٹھا کر واش روم

میں بند ہوگئی۔ اس کے جاتے ہی سعید صاحب نے چہرے پر ہاتھ پھیر کر خود کو پرسکون کرنے کی کوشش کی لیکن آنسو بار بار آنکھوں کی سطح گیلی کر رہے تھے۔ وہ ایک نظر بند دروازے کو دیکھ کر باہر نکل گئے۔

انہوں نے مسکراتے ہوئے نظر سامنے کی تو جہاں ان کی نظریں ساکت ہوئیں وہیں مسکراہٹ بھی سکڑ گئی تھی۔ ندا اور شائنہ کے درمیان وہ تھی۔ نظریں جھکائے ڈری ہوئی لیکن انتہا کی خوب صورت دکھتی ہوئی۔ انہوں نے دوبارہ سر تا پیر اس کا جائزہ لیا۔ انہوں نے اس کے لیے معمولی سا لباس لیا تھا حتیٰ کہ اس کے لیے بیوٹی پارلر والی تک نہیں بلائی تھی۔ وہ چاہتی تھیں وہ عام سی لگے لیکن اتنی احتیاط کے باوجود وہ سب سے نمایاں تھی جبکہ ان کی بیٹیاں انہوں نے دائیں بائیں نظریں گھمائیں۔ ان کا لباس انہوں نے خوب صورت اور قیمتی لیا تھا۔ وہ دونوں مہنگے ترین پارلر سے تیار ہوئی تھیں لیکن اس کے سامنے ان کی مثال ایسی تھی جیسے چراغ تلے اندھیرا۔ انہوں نے ہونٹ بھینچ کر اپنے بھائی کو دیکھا جس کی نظریں اس پر سے ہٹ ہی نہیں رہی تھیں۔ وہاں کھڑے باقی لوگوں کی نظریں بھی اس پر ٹکی تھیں۔

سعید صاحب نے محلے میں سے کچھ لوگوں کو بلایا تھا۔ کیونکہ وہ ان کو بتانا چاہتے تھے کہ انابیہ کسی سے منسوب ہے تاکہ جو غلط باتیں لوگوں کے دلوں میں ہیں وہ مٹ جائیں۔ اس کے پاس بیٹھتے ہی فوزیہ نے ایک انگوٹھی انابیہ کی طرف جبکہ دوسری غفران کی طرف بڑھائی۔ اس کے انگوٹھی تھامتے ہی غفران نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا انابیہ کی نظر اس کے ہاتھ پر ایک پل کے لیے رکی اور کپکپاتے ہاتھ سے اس نے انگوٹھی اس کی انگلی میں ڈال دی تھی۔

غفران نے ہاتھ اس کی طرف بڑھایا لیکن وہ نظر جھکائے گود میں رکھے اپنے ہاتھ کو دیکھ رہی تھی۔ سعید صاحب نے چونک کر اسے دیکھا وہ انہیں حواسوں میں نہیں لگی تھی۔

''انابیہ!'' انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ کا دباؤ ڈالا تو اس نے چونک کر انہیں دیکھا۔

''بیٹا ہاتھ بڑھاؤ'' ان کے کہنے پر اس نے غفران کی طرف دیکھے بغیر اپنا ہاتھ بڑھایا تھا جیسے اس نے تھام لیا تھا۔ اس کی گرفت سخت ہوئی تو اس نے سہم کر اسے دیکھا اس کے دیکھنے پر وہ مسکرایا اور انگوٹھی اس کی انگلی میں ڈال دی۔

''منگنی مبارک ہو۔'' اس کا ہاتھ چھوڑ کر وہ اس کے قریب جھکتا سرگوشی کے انداز میں بولا۔

''اتنی خوب صورت لگ رہی ہو کہ دل نہیں مان رہا کہ تمہیں ایسے چھوڑ جاؤں لیکن مجبوری بہت بڑی ہے پر کوئی نہیں اب تو تم میری ہوگئی ہو۔ بس کچھ دن پھر یہ دوریاں ختم ہو جائیں گی اور تم ہمیشہ کے لیے میری ہو جاؤ گی۔''

پریشان بیٹھی انابیہ کی یہ سن کر سانس ہی جیسے رک گئی تھی کہ وہ اس کی ہو جائے گی۔

☆☆☆

''میں کیا کوہ قاف میں رہتا ہوں جہاں فون نہیں ہوسکتا یا وہاں جانے کا راستہ گوگل میپ سے غائب ہوگیا تھا۔'' عمیر نے اپنے سامنے بیٹھے طالب اور حذیفہ کو گھور کر دیکھا اس کے گھورنے پر حذیفہ کے ساتھ قاسم اور یٰسین کی بھی ہنسی نکل گئی تھی۔

''میں نے کیا تم لوگوں کو لطیفہ سنایا ہے جو اپنی بتیسی کی نمائش کر رہے ہو۔''

''بھائی آپ خیر سے خود بہت بڑا لطیفہ ہیں سنانے کی کیا ضرورت ہے۔'' قاسم کی زبان میں کھجلی ہوئی تھی۔

''شرم نہیں آرہی نا تم لوگوں کو۔'' عمیر دانت کچکچا کر بولا۔

''عمیر! اتنی اوور ایکٹنگ کیوں کر رہے ہو۔'' طالب کے کہنے پر اس نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا۔

''اور اپنے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔ ہفتہ ہوگیا ہے تمہیں آئے اور تم نے ــــ ملنا ضروری نہیں سمجھا۔''

"ایک منٹ اپنی فضول ایکٹنگ کو لگام دے کر بتاؤ میں تو آنسٹر تمہیں بتائے بلے بغیر کئی مہینوں کے لیے باہر جاتا ہوں پہلے تو تم نے کبھی اس طرح کے بھونڈے شکوے نہیں کیے۔"

"پہلے تم ایسی چیز بھی ساتھ نہیں لائے۔" اس نے آنکھوں سے انعم کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے اشارے پر سب انعم کی طرف دیکھا۔

"کزن ہے۔" طالب نے سنجیدگی سے کہا۔

"پر آنٹی نے تو کچھ اور بتایا ہے۔" وہ آنکھیں مٹکا کر بولا۔

"کیا کہا می نے؟" طالب کو اب غصہ آرہا تھا جو ٹیبل پر موجود سب لوگوں کو محسوس ہوا تھا۔ حذیفہ نے طالب سے نظر ہٹا کر انعم کو دیکھا جو سب کو دیکھ رہی تھی۔

"خیر تم یہ سب چھوڑو، یہ بتاؤ تمہیں کیسے پتا چلا ہم یہاں ہیں۔"

"گھر فون کیا تو آنٹی نے بتایا تم لوگ ڈنر کے لیے گئے ہو تو بس میں پہنچ گیا۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"ہاں جب مفت ملے وہاں آپ سب سے پہلے پہنچتے ہیں۔" قاسم نے کی زبان میں کھجلی ہوئی تھی۔

عمیر نے اسے گھور کر دیکھا جبکہ وہ کندھے اچکا کر کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

☆☆☆

پتا نہیں کیسے پلیٹ پر اس کے ہاتھ کی گرفت ایک پل کے لیے ڈھیلی پڑی تھی نتیجتاً پلیٹ سلپ سے ٹکرا کر زمین پر گری اور کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی۔ اس کا ہاتھ بے ساختہ اپنے ہونٹوں تک گیا۔ دل کی دھڑکن بے تحاشا بڑھ گئی تھی۔ تیز قدموں کی آواز پر اس نے تیزی سے جھک کر ٹکڑے سمیٹنے چاہے تب ہی کونے میں رکھا گلاس بھی لڑھک کر نیچے آیا اور مزید کرچیوں کی آواز پھیلی تھی۔

"یہ کیا کر دیا نامراد؟" قدم اس کے قریب آ کر رکے اور تیز چنگھاڑتی آواز بالکل اس کے قریب سے آئی تھی۔

جلدی جلدی سمیٹنے کے چکر میں کئی ٹکڑے ہاتھ پر لگ گئے تھے۔

فوزیہ نے غصے سے اسے بالوں سے پکڑ کر کھڑا کیا اور تھپڑ اس کے گال پر دے مارا اور وہ جو بالوں کے کھینچنے پر چیخی تھی۔ تھپڑ لگتے ہی جیسے ساکت ہو گئی۔

"میں کب سے دیکھ رہی ہوں منگنی کیا ہوئی ہے تمہارے پر ہی نکل آئے ہیں۔ مہارانی کی طرح اوپر ہی بیٹھی رہتی ہو، کام کے لیے تمہیں دس آوازیں دینی پڑتی ہیں اور کام کرتی ہو تو بگاڑ کر رکھ دیتی ہو۔ میرا اتنا قیمتی ڈنر سیٹ تھا جس کی پلیٹ توڑی ہے اب یہ نقصان تمہارا باپ پورا کرے گا۔"

کہنے کے ساتھ انہوں نے اس کے زخمی ہاتھ کو بری طرح مروڑا کہ وہ بلبلا کر رہ گئی۔

"جس غفران پر تم مان کر کے اتنا اکڑ رہی ہو وہ تمہارا منگیتر بعد میں میرا بھائی پہلے ہے۔ آئی سمجھ، اب دفع ہو جاؤ۔" انہوں نے اسے بازو سے کھینچ کر دروازے کی طرف دھکا دیا۔ وہ روتی ہوئی سیڑھیوں کی طرف بڑھی تھی۔

نماز پڑھ کر وہ باہر آئے تو انابیہ انہیں نظر نہیں آئی۔ وہ اسے دیکھنے کے لیے وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھے۔

تب ہی وہ روتے ہوئے اوپر آتی دکھائی دی چہرے سے ان کی نظر ہاتھوں تک گئی جہاں سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ بے ساختہ اس کی طرف بڑھے۔

"انابیہ! میری بچی یہ کیا ہوا۔" انہوں نے بڑے احتیاط سے اس کے ہاتھ تھامے، جہاں کانچ کے ٹکڑے نظر آرہے تھے۔ وہ اسے ساتھ لگائے اندر لے آئے صوفے پر بٹھا کر انہوں نے بغور اس کے ہاتھ کا جائزہ لیا۔

"میری بیٹی بہت بہادر ہے۔" انہوں نے کہتے کے ساتھ کانپتے ہاتھوں سے اس کی ہتھیلی اور انگلیوں سے چھوٹے چھوٹے کانچ نکالے۔ تکلیف کے مارے اس کے ہونٹوں سے سسکی نکلی تھی۔

pklibrary.com

''بس ہوگیا میرے بچے۔'' سعید صاحب کے پاس رکھی ڈیٹول رومال پر لگا کر اس کا زخم صاف کیا اور دوسرا رومال اس کے ہاتھ پر باندھ دیا اور ہاتھ سے اس کے آنسو صاف کیے۔ تب ہی ان کی نظر اس کے بائیں گال پر پڑی تو وہ چونک کر دیکھنے لگے۔

''یہ کیسے ہوا؟'' وہ کبھی اس کے گال کو دیکھتے تو کبھی ہاتھ کو۔

''پلیٹ ٹوٹ گئی تھی اس کو اٹھاتے ہوئے'' کہہ کر وہ خاموش ہوگئی۔

''اور یہ نشان۔'' انہوں نے اس کے گال کی طرف اشارہ کیا لیکن وہ خاموش رہی تھی۔

''چلو اٹھو جا کر آرام کرو میں تمہارے لیے دودھ گرم کر کے لاتا ہوں۔''

''نہیں بابا مجھے ضرورت نہیں۔''

''مجھے پتا ہے تمہارے لیے کیا ضروری ہے کیا نہیں جاؤ اندر، آتا ہوں میں۔'' وہ سختی سے کہہ کر اٹھ گئے وہ کچن میں آئے تو فوزیہ ابھی تک بڑبڑا رہی تھیں انہیں دیکھ کر وہ حیران ہو کر چپ ہوگئی تھیں۔

انہوں نے فریج سے دودھ نکالا اور کپ میں ڈال کر مائیکرو میں رکھا۔ فوزیہ چور نظروں سے انہیں دیکھنے لگیں مائیکرو کی آواز پر انہوں نے مگ نکالا اور خاموشی سے باہر نکل گئے۔

فوزیہ جو ان کے لیکچر کا انتظار کر رہی تھیں اتنی خاموشی پر ایک پل حیران ہوئیں اور پھر کندھے اچکاتے ہوئے باہر نکل گئیں۔

☆☆☆

تسبیح پڑھتے ہوئے ان کی نظریں اس پر تھیں جو آنکھیں بند کیے لیٹی تھی کچھ دیر بعد جب انہیں لگا وہ سو چکی ہے تو انہوں نے قدرے جھک کر اسے دیکھا۔ اور واقعی سو چکی تھی وہ اس پر پھونک مار کر کمرے سے باہر نکل آئے۔

اپنے کمرے میں آ کر انہوں نے گھڑی کی طرف دیکھا اور موبائل سے ایک نمبر ڈائل کیا۔ کچھ دیر بعد فون اٹھا لیا گیا تھا۔

''ہیلو چاچا جی! سب خیریت ہے؟'' دوسری طرف سے غفران کی حیران آواز سنائی دی تھی۔

''ہاں بیٹا خیریت ہے معذرت چاہتا ہوں تمہیں اتنی رات کو زحمت دی۔''

''نہیں چاچا جی زحمت کی بات نہیں، یہاں رات نہیں ہوئی ابھی۔ آپ بتائیں مجھے، انابیہ ٹھیک ہے۔'' سعید صاحب نے گہرا سانس لیا۔

''چچا جی آپ چپ کیوں ہیں، انابیہ ٹھیک ہے۔'' ان کی خاموشی پر وہ پریشانی سے بولا۔

''بیٹا آج میں عجیب کشمکش میں ہوں میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ انابیہ کی منگنی تمہارے ساتھ کر کے میں نے صحیح کیا یا غلط۔''

''آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں کچھ ہوا ہے کسی نے آپ کو میرے بارے میں کچھ بتایا ہے۔'' وہ بے حد پریشانی سے بولا۔

''غفران! فوزیہ کا رویہ کبھی بھی انابیہ کے ساتھ اچھا نہیں رہا اسی وجہ سے میں اتنے سالوں سے تمہارا رشتہ لینے سے ہچکچا رہا تھا۔ میں ابھی بھی انابیہ کی شادی نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن'' انہوں نے گہرا سانس لیا۔

''تمہاری چاہ دیکھ کر لگا تم میری بچی کو خوش رکھو گے۔ اس کی عزت کرواؤ گے نہ میں نے تمہاری عمر کی پروا کی نہ مزاج کی لیکن اس کے باوجود سب الٹا ہو رہا ہے فوزیہ تو ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گئی ہے۔ نوکروں کی طرح کام کرواتی ہے۔

آج تو اسے مارا بھی ہے۔ اس کے ہاتھوں پر بھی زخم تھے میں نہیں جانتا کیسے کیونکہ میری بچی کو شکایت کرنا تو آتا نہیں لیکن مجھے بہت تکلیف پہنچی ہے۔ غفران اگر تم اس کی عزت نہیں کروا سکتے تو ابھی بتا دو تا کہ میری بچی کوئی امید نہ لگائے اور ایک بات تم نے جو چیزیں، سونا، کپڑے وغیرہ انابیہ کے لیے لیا تھا تمہاری بہن واپس لے چکی ہے۔ یہ میں تمہیں اس لیے بتا رہا ہوں کل کو وہ اس پر چوری کا الزام بھی لگا سکتی ہے۔''

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

فرح بخاری

شام شہر ہجر

مکمل ناول

میاندم کا گھرانہ ہے جہاں ایک گھر میں دو خاندان رہتے ہیں۔ رضوانہ کی تین بیٹیاں ہیں۔ شوہر مر چکے تھے، ندرت بھاوج ہیں ان کا ایک بیٹا ہے مومن جس کی منگنی رضوانہ کی بیٹی تحریم سے طے تھی۔ وسیلہ نے ایل ایل بی کیا تھا لیکن ماں کی بیماری کی وجہ سے پریکٹس نہیں کر سکی تھی۔ چھوٹی ایلیا کالج کی طالبہ ہے۔

تھانہ میں حویلی میں رہنے والی دادی منصب پر بہت مہربان ہیں وہ ان کے منشی کا بیٹا ہے۔ حویلی میں کوئی اس کا آنا پسند نہیں کرتا۔ دادی اس کی تعلیم کا خرچہ اٹھاتی ہیں وہ پولیس آفیسر بن جاتا ہے اس کا ٹرانسفر میاندم ہو جاتا ہے۔ منصب کی دو بہنیں ہیں میمونہ اور رمشہ، میمونہ شادی شدہ ہے۔

حویلی میں رہنے والی شہناز اور کمال خان کا بیٹا ارحم ہے جو ضدی اور بد دماغ سا ہے۔ شہناز بی بی کی بہن گلناز ہے جو نیم پاگل ہے۔ ارحم شادی کرنا چاہتا ہے۔

رضوانہ اور ندرت مومن کے ساتھ شاپنگ پر جاتی ہیں دو گاڑیوں میں قافلہ جاتا ہے ایک گاڑی وسیلہ اور دوسری مومن چلا رہا ہے، راستے میں بارش اور طوفان کا سامنا کرنا پڑتا ہے منصب بھی اس طوفان کا شکار ہوتا ہے۔

pklibrary.com

وسیلہ اور منصب اس طوفان میں ملتے ہیں۔ اتفاقاً وسیلہ ایک پتا پوچھتے منصب سے ٹکراتی ہے وہ اسے مختصر راستے سے اپنے گھر لے کر جاتا ہے۔ لیکن وہ اس پر شک کرتی ہے بعد میں اسے منصب کے گھر اسی پتے کی غرض سے جانا پڑتا ہے وہ شرمندہ ہوتی ہے۔

تحریم کی شادی میں وسیلہ منصب اور رمشہ کو انوائٹ کرتی ہے۔ منصب اور رمشہ کو وسیلہ اچھی لگتی ہے تحریم اور مومن پوری فیملی کے ساتھ کالام گھومنے جاتے ہیں اسی سفر میں وسیلہ اور منصب کی پھر ملاقات ہو جاتی ہے۔

ارحم رضوانہ اور ان کی فیملی کو ڈھونڈ لیتا ہے اور شہناز اور دادی کو بھی ان سے ملوانے لاتا ہے۔ رضوانہ کا خوف ختم ہو جاتا ہے، شہناز ارحم کے لیے وسیلہ کا رشتہ مانگتی ہے۔ منصب کو جب یہ بات پتا چلتی ہے تو وہ پیچھے ہٹ جاتا ہے۔

تحریم کا انتقال ہو جاتا ہے مومن کی شادی ایلیا سے ہو جاتی ہے وہ اس رشتہ کو قبول نہیں کر پاتا کیوں کہ اس کے انکار کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ تانیہ عیسیٰ کے بھائی کا علاج کرتی ہے۔ وہ اس لڑکی کی شادی کا پتا چلنے پر خودکشی کر لیتا ہے۔ عیسیٰ اس سب کا ذمہ دار ڈاکٹر تانیہ کو سمجھتا ہے۔ اس کے کلینک پر توڑ پھوڑ کی جاتی ہے۔ وہ ہنگورہ چھوڑ کر میاندم آجاتے ہیں۔ شہناز شادی میں دادی کو نہیں لاتی۔ منصوبے کے تحت وہ وسیلہ کو اپنی نیم پاگل بہن کے ساتھ تہ خانے میں بند کر دیتی ہے۔

وسیلہ کی حالت خراب ہو جاتی ہے، منصب اپنے طور پر کسی کے ذریعے معلوم کرواتا ہے تو پتا چلتا ہے کہ ارحم چترال میں رہ رہا ہے اور دوسری شادی بھی کر چکا ہے، وہ مومن کو اعتماد میں لے کر ساری صورت حال بتاتا ہے۔

مومن رضوانہ اور ایلیا کے ساتھ تھانہ آتا ہے۔ وسیلہ ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہوتی ہے، اس کی دماغی حالت خراب ہو جاتی ہے وہ کسی کو نہیں پہچانتی۔ منصب کی مدد سے مومن شہناز اور رارحم کے خلاف رپورٹ درج کرواتا ہے۔ ارحم اور شہناز اپنی ملازمہ کے ذریعے ہاسپٹل میں وسیلہ کو مارنے کی کوشش کرتے ہیں، عین وقت پر منصب آجاتا ہے۔

مومن وسیلہ کو میانوالی لے آتا ہے۔ یہاں اس کا علاج ہوتا ہے لیکن اس کی دماغی حالت بہتر نہیں ہوتی۔ اس کے لیے تانیہ کی مدد لی جاتی ہے۔

دادی منصب کو بتا دیتی ہیں کہ وہ ان کا پوتا ہے، شہناز اسے مارنے کا پروگرام بناتی ہے اس لیے وہ منشی کی بیوی سے رضوانہ کا بیٹا تبدیل کر دیتی ہیں۔ تاکہ اس کی جان بچ جائے۔

پندرہویں اور آخری قسط

''یا اللہ۔ یہ بچے تو مجھے تیار ہی نہیں ہونے دیں گے۔ ان لوگوں کو میکورہ سے نکلے بھی کتنی دیر ہوگئی۔ اب تو بس پہنچنے ہی والے ہوں گے۔''

ایلیا پورے کمرے میں بوکھلائی سی گھوم رہی تھی۔ ساتھ ساتھ بڑبڑا بھی رہی تھی۔ راشد کے گھر والے کچھ ہی دیر میں یہاں پہنچنے والے تھے۔ وسیلہ اپنے کمرے میں رمشہ کو تیار کر رہی تھی، اس لیے بچوں کو اس کے پاس چھوڑ دیا گیا اور وہ دونوں تو باقاعدہ فائٹ کرنا سیکھ چکے تھے۔

''کیا ہو گیا ہے۔ کیوں بنا میوزک کے ناچ رہی ہو۔'' مومن نے مسکرا کر اس کی حالت دیکھی جس پر اس کا اور بھی منہ بن گیا۔

''راشد بھائی کی امی اور بہنوں نے مجھے ماسی سمجھ لینا ہے بچی۔''

''ارے واہ۔ میری شہزادی کو کس کی جرات ہے کہ ماسی سمجھے۔'' وہ قریب تو آ گیا لیکن آرام کرنے کے انداز میں صوفے پر نیم دراز ہو گیا۔ ایلیا نے دونوں ہاتھ کمر پہ رکھ کر خاموش شکوہ بھری نظر ڈالی۔ کہ مطلب وہ بھی زبانی کلامی ہمدردی کرنے بیٹھ گیا تھا۔ جبکہ اسے کسی کی مدد چاہیے تھی۔ مومن سمجھ تو گیا لیکن مسکراتا رہا۔

''اب آہی گئے ہیں تو پلیز میری مدد کروا دیں۔'' بالآخر اس نے کہہ ہی دیا۔

''جی جی ضرور کریں گے۔ لیکن یہ شیطانی ٹولہ میرے حوالے مت کرنا۔'' اس نے صاف جتا دیا۔

''ہائیں۔'' ایلیا کی آنکھیں پھیلیں ''تو؟''

''تو۔ یہ کہ۔'' اس نے سر کھجاتے کچھ سوچا، پھر عابی کو اٹھا کر کمرے سے نکل گیا۔ ایلیا دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی جب دو ہی منٹ میں وہ واپس آ گیا۔ عابس اس کے ساتھ اب نہیں تھا۔

''عابی کو امی کو دے آیا ہوں۔'' اس نے بتا کر چند کھلونے یہاں وہاں سے جمع کر کے ربا کو بیڈ پر بٹھایا اور اس کے بعد ایلیا کے قریب آ کر اسے شانوں سے تھام کر مسکراتے ہوئے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بٹھا دیا۔

''ہاں تو اب کریں گے ہم آپ کی ہیلپ۔'' وہ ڈریسنگ ٹیبل کے کونے پر بیٹھ کر اسے بغور دیکھنے لگا۔

''کیا پہن رہی ہے میری ملکہ۔'' اس نے ایلیا کی ٹھوڑی انگلی سے اونچی کی۔ اور ایلیا کی ساری جھنجھلاہٹ ساری بےزاری پل میں ہوا ہو گئی۔ مسکرا کر صوفے پہ رکھے ڈریس کی طرف اشارہ کیا۔

''واؤ۔ میرا فیورٹ ریڈ سوٹ۔'' مومن نے نظروں کے تعاقب میں دیکھا تو سرخ سوٹ دکھائی دیا۔ ''جاؤ شاباش جلدی سے پہن کر آؤ۔ پھر میں تمہاری زلفیں سنوار کر تمہیں تیار کروں گا۔''

''جی۔ اور اس مرتبہ کی ''دکھاوے'' کے لیے

نہیں۔" وہ اسٹول سے اٹھ کر اس کے کان کے قریب کہتے ہنس کر دور چلی گئی۔ مومن نے کچھ دیر سوچا پھر قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ ایلیا اسے وہ دن یاد دلا رہی تھی جب وسیلہ کو دکھانے کے لیے اس نے ایلیا کے بال بنائے تھے۔

"آپ کو یاد نہیں آتا وہ پرانا وقت جب مجھے آپ سے اتنی ڈانٹ پڑتی تھی۔"

"آتا ہے میری جان۔ اور جانتی ہو۔ مجھے یہاں ہونا ہے۔" اس نے ہاتھ اپنے دل پہ رکھا۔

"ہائے، اللہ نہ کرے۔ کیوں؟" اس کا تو دل دہل گیا۔ ہاتھ بے ساختہ مومن کے دل پہ رکھا۔

"کیونکہ پھر مجھے یہ افسوس ہوتا ہے کہ میں نے اِن حسین آنکھوں کی گہرائی کو تب کیوں محسوس نہ کیا تھا۔ اور یہ چھوٹی سی موٹو جو آج میری زندگی ہے، مجھ سے اتنی دور کیوں تھی۔"

"اچھا بس بھی کریں۔" وہ بری طرح خجل ہوگئی۔ "قدرت کا مقرر کردہ وقت ہی سب سے حسین ہوتا ہے۔ سارے کب، کیوں، کیسے خود بخود سمجھ میں آنے لگتے ہیں۔ اور مجھے جو وقت آج حاصل ہے، وہی سب سے خوبصورت لگتا ہے، اور اس نے ابھی ہی آنا تھا۔ بس دعا ہے کہ اس کا یہ حسن کبھی ختم نہ ہو۔ ہماری محبت، ہماری خوشیوں کو کسی کی نظر نہ لگے۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے سنجیدہ سی ہوگئی۔ مومن نے کچھ دیر اسے بغور دیکھا پھر نرمی سے اپنے ساتھ لگا لیا۔

"محبت ہمیں کس طرح وہمی بنا دیتی ہے، ابھی تمہیں سن کر محسوس ہوا اور یہ کسی بھی رشتے میں خلوص کی انتہا ہوتی ہے ایلیا! جب بندے کا دل موم سے بھی نرم ہو جاتا ہے اور وہ اپنی خوشیوں پر بھی کھل کر خوش نہیں ہو پاتا، کہ کھو دینے کا ڈر اس کی خوشیوں پر بھی غالب آنے لگتا ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے، ہمارے دکھ کے دن بیت چکے۔ یہ ہمارے صبر کا انعام ہے جو ہمیں ایک دوسرے کے حصول سے میسر آیا ہے۔ اس کی عمر بہت طویل ہوگی ان شاء اللہ۔"

"ان شاء اللہ" وہ اس کے سینے پہ سر رکھے مسکرا دی۔

☆☆☆

"کہاں غائب ہو لڑکی! کتنے دن ہو گئے، یہاں کا چکر ہی نہیں لگایا۔" اتوار کی صبح جبکہ باہر ہلکی دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ منصب ناشتے کے بعد بیرونی لان کی کرسیوں پر آ بیٹھا۔ تانیہ واقعی بہت دن ہوئے یہاں دکھائی نہ دی تھی۔ وہ بھی ہفتہ بھر ڈیوٹی میں مصروف رہا تھا۔ آج سوچا اس کی خیریت معلوم کر لے۔

"میں بھی آج ہی سوچ رہی تھی آنے کا۔ دیکھ رہے ہو نا، کتنی سردی ہو گئی تھی۔ ابو کی طبیعت بھی ٹھنڈ کی وجہ سے کچھ خراب ہو گئی تھی۔"

"اوہو۔ اب کیسے ہیں۔"

"ہاں شکر ہے، اب تو ٹھیک ہیں۔ یہاں سردی بھی تو مینگورہ کی نسبت بہت زیادہ ہے۔ میں سوچ رہی تھی ہمیں گھر واپس چلے جانا چاہیے۔"

"اچھا!" منصب کو سن کر حیرت ہوئی "بھروسا آ گیا عیسیٰ پر؟" اس کا لہجہ ہلکا پھلکا اور انداز مزاحیہ تھا تانیہ ہنس پڑی۔

"ہاں، کچھ ایسا ہی سمجھ لو۔ اس سے بات کر کے تسلی تو ہوئی تھی۔"

"تو پھر مہینوں سے بے چارے کو انتظار کی سولی پر کیوں لٹکا رکھا ہے۔ جواب بھی دے ہی دو۔"

"جواب۔ مطلب ہاں میں؟" تانیہ نے اُلٹا اسی سے پوچھ لیا۔

"ہاں بھئی۔ اور کیا، جب تسلی ہے تو پھر انکار کے کیا معنی؟"

"اُس بارے میں تو زیادہ نہیں سوچا، لیکن اپنے گھر تو جا ہی سکتے ہیں۔"

کیا "انکل آنٹی کی طرف سے کچھ ایشو ہے؟"

اب کے منصب بھی سنجیدہ ہوا۔ عیسیٰ سے پارک والی ملاقات کو اب کافی وقت ہو گیا تھا۔ تانیہ کی خاموشی اس کی سمجھ سے باہر تھی۔

"امی ابو کی طرف سے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ انہوں نے مجھے اختیار دیا ہے۔ لیکن میں خود بہت کنفیوز ہوں۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔" تانیہ نے ایک گہری آہ بھری۔ لہجہ انتہا کا تھکا تھکا سا تھا۔

"اچھا تم یہیں آجاؤ۔ آرام سے بات کر لیتے ہیں۔" منصب کو لگا آمنے سامنے بات کر لینا زیادہ صحیح رہے گا۔ نجانے تانیہ کے کیا خدشات تھے۔

"ہوں۔ میں آتی ہوں کچھ دیر میں۔" تانیہ نے بھی اپنے ذہن کو بات کے لیے آمادہ کیا۔ منصب نے کال آف کر کے سر کرسی کی پشت سے ٹکایا۔ اسے بھی تانیہ سے کچھ ڈسکس کرنا تھا۔

☆☆☆

گیارہ بجے کے قریب دھوپ میں ہلکی سی تپش محسوس ہونے لگی تو ہاجرہ بیگم اور رضوانہ باہر برآمدے میں آبیٹھیں۔ اس سے قبل دھوپ بھی اتنی ٹھنڈی تھی کہ باہر نکلنے کو جی ہی نہیں چاہ رہا تھا۔

"اماں جی! مجھے لگتا ہے ہمیں وسیلہ سے ایک بار پھر کھل کر بات کرنی ہوگی۔ اب تو اس کی طلاق کو کتنا وقت ہو گیا۔"

"ہوں، بات تو ٹھیک ہے۔ لیکن وہ جو کچھ سننا ہی نہیں چاہتی اس کا کیا کریں۔" وہ سوچ میں پڑ گئیں۔ منصب نے کچھ عرصہ پہلے اُنہی سے اس بارے میں بات کی تھی کہ وہ نہ صرف وسیلہ سے ازحد شرمندہ ہے بلکہ اب بھی اس کا طلب گار ہے، اور اگر وسیلہ اسے معاف کرنے کا ظرف رکھتی ہے تو وہ اپنی کوتاہیوں کا ازالہ کرنا چاہتا ہے۔ ہاجرہ بیگم نے یہ بات تب ہی وسیلہ سے کہہ دی تھی لیکن اس کی طرف سے کوئی رسپانس دیکھنے میں نہیں آیا۔ بعد میں رمشہ، ایلیا حتیٰ کہ مومن بھی اسے بہت بار سمجھا چکا تھا کہ اسے پرانی باتوں کو بھول کر اپنے فیوچر کے متعلق سوچنا ہوگا۔ اور منصب سے بہتر اس کے لیے کوئی نہیں ہو سکتا۔ لیکن وہ بالکل خاموش تھی۔

شاید اسے کچھ وقت دینا چاہئے۔ ہاجرہ بیگم نے متانت سے اپنا خیال ظاہر کیا تو رضوانہ نے چونک کر دیکھا۔

"کیا واقعی آپ کو ایسا لگتا ہے۔ میرا مطلب ہے میں تو جلدی فیصلہ کرنے کو اس کے حق میں بہتر سمجھ رہی ہوں تاکہ وہ پرانی باتوں سے چھٹکارا پالے۔"

"وہ بھی ٹھیک رضوانہ۔ لیکن وسیلہ جیسی مجبور اور حساس بچی کے ساتھ شاید ایسا رویہ مناسب نہیں۔"

"شاید آپ صحیح کہتی ہیں۔ آج کل کے بچے الگ ہی ڈھنگ سے سوچتے ہیں۔" رضوانہ نے ایک آہ کھینچی۔

☆☆☆

"جی تو کیا چل رہا ہے انسپکٹر صاحب کے دماغ میں؟" وہ قریب دو گھنٹے بعد اس کے روبرو تھی۔ رمشہ دونوں کے سامنے کافی رکھ گئی تھی۔ دھوپ اس ٹھنڈ میں بہت بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ پنک اور سفید سوٹ میں بال کیچر میں جکڑے وہ گلابی شال اوڑھے ہوئے تھی۔ دادی اور رضوانہ آنٹی سے وہ برآمدے میں مل آئی تھی۔ وسیلہ بھی اس وقت وہیں بیٹھی ہوئی تھی۔ تانیہ کے اہتمام کو اس نے بہت توجہ سے دیکھا تھا۔ پھر اس کی عجلت۔ وہ کچھ ہی دیر میں یہ کہہ کر باہر چلی گئی تھی کہ اسے منصب سے کچھ ضروری کام ہے۔ وسیلہ بھی اُٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی۔ رمشہ نے اس کی سنجیدگی کو محسوس کر لیا تھا تب ہی اُن دونوں کو کافی دے کر وہ وسیلہ کے پاس آگئی۔

"تم کیوں اندر آگئیں۔ اتنی اچھی دھوپ نکلی ہے۔ واک کرتے ہیں۔"

"نہیں۔ مجھے کسی کی پرائیویسی میں مخل ہونے کا کوئی شوق نہیں ہے۔"

"ہیں۔" رمشہ نے تعجب سے گھور کر وسیلہ کو دیکھا "تانیہ اور منصب کی پرائیویسی؟"

"میرا مطلب ہے وہ کہہ گئی ہے کہ اسے کچھ ضروری کام ہے۔" وسیلہ کے منہ سے منصب کا نام تک نہیں نکل پایا۔ گھر والے بھی اس گریز کو اب اچھی

طرح جان چکے تھے۔ لیکن رمشہ پچھلے کچھ دنوں سے مسلسل اسی بارے میں کچھ سوچ رہی تھی۔ جب سے اس کا رشتہ طے ہوا تھا گھر میں اس کی جلدی شادی کی باتیں ہو رہی تھیں۔ اور وہ تب سے اسی سوچ میں تھی کہ منصب کے معاملے پر وسیلہ سے ایک بار کھل کر ضرور بات کرے گی۔

"ہاں، خیر ان کا تو چلتا رہتا ہے، میرا خیال ہے وہ لوگ واپس مینگورہ شفٹ ہونا چاہ رہے ہیں۔ اسی سلسلے میں کچھ کام ہوگا۔ اچھا وہ چھوڑو، تم اپنے پلانز بتاؤ۔ کیا سوچ رہی ہو آج کل؟"

"میں!" وہ مسکرا دی "پریکٹس کر کے ان شاء اللہ باقاعدہ وکالت شروع کروں گی۔"

"یہ تو بہت اچھا سوچا۔ وقت کا مصروف گزرنا خود اپنی صحت کے لیے بہت اچھا ہوتا ہے۔ لیکن۔ وسیلہ!" رمشہ آخر میں کچھ اٹک گئی۔ وسیلہ نے چونک کر سر اٹھایا۔

"میرا مطلب ہے، اگر تم گھر بسانے کے متعلق بھی سوچو تو دادی اور آنٹی کو بہت خوشی ملے گی۔ وہ بہت پریشان رہتی ہیں، بلکہ اس حوالے سے تو سب ہی پریشان ہیں۔"

"میں نے کبھی انکار نہیں کیا رمشہ۔ لیکن فی الحال صرف وکالت۔ اور ہاں اگر کچھ سالوں تک کوئی اچھا بندہ ایسا مل گیا جس کے ساتھ زندگی گزارنے کے بارے میں سوچا جا سکے تو میں بھی ذہن بنانے کی کوشش کر لوں گی۔"

"تو۔ تم منصب بھائی کو بالکل معاف نہیں کر رہیں۔" رمشہ کا لہجہ مایوس سا ہو گیا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا، یہاں معافی کا مطلب منصب سے رشتہ جوڑنا کیوں سمجھا جا رہا ہے۔ میں کہہ چکی ہوں، بات معافی کی نہیں ہے۔ مجھے تمہارے بھائی سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ ہاں لیکن شادی وغیرہ کا فیصلہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ اور میں منصب سے شادی نہیں کر سکتی۔"

"لیکن کیوں وسیلہ۔"

"کیونکہ وقت کے ساتھ خیالات ایک سے نہیں رہتے، ان میں بھی بدلاؤ آتا ہے۔ تم سب بلاوجہ اس بات کو پرانے تناظر میں دیکھ رہے ہو، جبکہ یہاں واقعی بہت کچھ بدل چکا ہے۔"

"بتاؤ نا وسیلہ۔ منصب میں کیا بدلاؤ آیا ہے؟"

"عجیب بات ہے۔ تم لوگوں کو دکھائی نہیں دیتا۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ رمشہ نے پلٹ کر اسے حیرت سے دیکھا اور پھر خود بھی اس کے پیچھے آ گئی۔

"کیا دکھائی نہیں دیتا؟"

"تم لوگوں کو اپنے بھائی کے جذبات کا بھی احساس کرنا چاہیے۔ میں نہیں کہتی کہ کچھ غلط ہوا ہے، کیونکہ میری شادی ہو چکی تھی اور مجھ پر جو بیت رہی تھی اس کی یہاں کسی کو خبر نہیں تھی۔ ایسے میں اس کا لائف میں آگے قدم بڑھانا اور اپنے خیالات کو کسی اور جانب موڑنا بالکل جائز تھا۔ البتہ ابھی کچھ دن پہلے دادی کے ہاتھ جو پیغام بھجوایا گیا، اس کی وجہ سوائے میرے دکھوں کا مداوا کرنے کی کوشش کے اور کچھ نہیں تھا۔"

"اور کیا ہے منصب کے خیالات میں بدلاؤ کی وجہ؟" رمشہ نے تحمل کا مظاہرہ کیا جبکہ بات کچھ کچھ پلے پڑ گئی تھی۔ جواباً وسیلہ نے کھڑکی کا پردہ ایک سائیڈ پہ کر دیا۔ سامنے لان کی کرسیوں پر تانیہ اور منصب باتوں میں مشغول تھے۔

"تمہارا مطلب ہے، بیچ کے عرصے میں تانیہ نے وہ جگہ پُر کی تھی؟" رمشہ نے اس مرتبہ کھل کر پوچھ لیا۔

"یہی سچ ہے رمشہ۔ اور مجھے لگتا ہے یہ بہت صحیح بھی ہے۔"

"اول تو ایسی کوئی بات ہے ہی نہیں۔ دوسرے وہ عیسیٰ کی منگیتر ہے۔" رمشہ نے اس کا خیال فوراً رد کیا۔

"تو مرغزار کے واقعے کو اتنا عرصہ گزر گیا۔ تانیہ بھی عیسیٰ کو معاف نہیں کر پا رہی۔ اسے بھی تو

عیسیٰ سے جدا ہوتے وقت یہی لگا تھا کہ یہ چیپٹر اب ہمیشہ کے لیے کلوز ہو چکا۔ اس لیے جب منصب اسے ملا تو دونوں کا سیچ پر فیکٹ ہو گیا۔"

"ہاں بظاہر ایسا ہی لگتا ہے وسیلہ۔ تانیہ کے لیے منصب کیسا دوست ہے اور منصب کے خیالات تانیہ کے متعلق کیا ہیں۔ تم اندازہ لگانے کی غلطی مت کرو۔"

"تو ٹھیک ہے، میں وعدہ کرتی ہوں کہ اس معاملے کی تہہ تک میں بہت نیوٹرل ہو کر پہنچوں گی۔"

"ضرور کرو یہ کوشش، لیکن ایسا میں صرف امی، دادی اور باقی سب گھر والوں کی وجہ سے چاہوں گی۔ میرا اس سب میں کوئی ذاتی انٹرسٹ نہیں ہے۔ میں چاہتی ہوں، وہ مجھ پر دباؤ ڈالنا بند کر دیں۔" وسیلہ نے آخر میں واضح بھی کر دیا اس کی دلچسپی کس وجہ سے ہے۔ رمشہ نے متانت سے سر ہلایا۔ اس نے وسیلہ کی نظروں کے تعاقب میں باہر لان کی طرف دیکھا۔ منصب نے اپنی ہتھیلی مسکرا کر تانیہ کے سامنے پھیلائی تھی، جس پر تانیہ نے ہنستے ہوئے ہلکی سی تالی بجائی اور دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ وسیلہ نے ایک چور نظر رمشہ پر ڈالی لیکن وہ جو لباً وسیلہ سے نظر بھی نہیں ملا پائی۔

☆☆☆

"میرے الجھے دماغ میں تو بہت کچھ چلتا رہتا ہے۔" منصب کافی کا کپ اٹھاتے ایک دم سست ڈھیلے انداز میں ہنس دیا "پہلے تم کہو، کیا کنفیوژن ہے؟"

"ایک ہی کنفیوژن ہے منصب کہ کیا مجھے عیسیٰ پر دوبارہ بھروسا کرنا چاہیے؟"

"ہاں، رائے تو میری یہی ہے۔ کہ عیسیٰ صحیح بندہ ثابت ہوگا۔ لیکن جہاں تک بھرپور تسلی وغیرہ کی بات ہے تو پہلے اسٹیپ میں تم لوگوں کا مینگورہ شفٹ ہونا بہت ضروری ہے۔ اپنا گھر اپنا کلینک دوبارہ سنبھالو۔ اور اس دوران عیسیٰ اور اس کی فیملی کے رویے جانچو۔ دیکھو کہ وہ تم سب کی واپسی پر کیسا رویہ اپناتے ہیں۔ تم تو رویے جج کرنے میں ماہر ہو۔ اس کی امی اس کی بہنوں وغیرہ سے ملنا پڑے تو پیچھے مت ہٹنا کیونکہ یہی موقع ہوگا جب تم ان سب کو سنو گی۔ کیا پتا ہر بات عیسیٰ کے کہے کی تصدیق کرتی جائے۔"

"ہوں۔" تانیہ! سر ہلاتے جیسے ساتھ ساتھ کسی نتیجے پر پہنچ رہی تھی "تم صحیح کہتے ہو منصب۔ اور ایسا ہی ہونا چاہیے۔ رائٹ۔ میرا دماغ حقیقی معنوں میں بند ہو چکا تھا۔ تھینکس منصب۔ تم نے واقعی ہماری بہت بڑی مشکل حل کی ہے۔"

"تو پھر میری فیس؟" اس نے مسکرا کر ہتھیلی تانیہ کے سامنے کی اور اس نے ہنس کر منصب کے بڑھے ہاتھ پر تالی بجادی۔

"حاضر جناب۔ جو فیس آپ حکم کریں۔"

"تو پھر جو لباً اب آپ میری مشکل حل کریں گی۔"

"جی ضرور۔ تو کیا ہے آپ کی مشکل؟"

"گورنمنٹ کی طرف سے مجھے ذاتی گھر ملنے والا ہے۔ یہیں پولیس اسٹیشن کے قریب ہی۔ تو میں چاہتا ہوں رمشہ کی شادی کے بعد میں وہاں شفٹ ہو جاؤں۔"

"ہوں۔" تانیہ نے سر ہلایا "اور مشکل؟"

"امی نہیں جانے دیں گی۔"

"تو کیا یہ تمہاری مرضی پر ہے کہ ذاتی مکان لو یا نہ لو۔"

"ہاں اگر میں یہ فائدہ نہ اٹھانا چاہوں تو کوارٹر کسی اور کو بھی دیا جا سکتا ہے۔ اب ظاہر ہے یہاں میرا ذاتی مکان ہے تو میرے پاس آپشن موجود ہے۔"

"تو پھر مت جاؤ۔ کیا ضرورت ہے ماں سے دور جانے کی۔"

"یہی تو اصل مشکل ہے ڈیئر!" منصب نے ایک گہری آہ بھری۔ "وسیلہ کو میری صورت سے بھی

چڑ ہے۔ آخر کب تک اس کے سر پر مسلط رہوں۔ انسان کے لیے اپنا گھر وہ جگہ ہوتی ہے جہاں آ کر وہ مکمل بے فکرا اور آزاد ہوتا ہے۔ سکون کا دوسرا نام گھر کی پناہ ہے۔ لیکن میں تو یہاں آ کر عجیب الجھن میں پھنس گیا ہوں۔ سارا وقت یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ وسیلہ کہاں ہے، مجھے کہاں بیٹھنا ہے، کہاں نہیں۔ اس سے ٹکراؤ نہ ہو جائے۔ اسی کشمکش میں سارا وقت ہم دونوں کو اپنے اپنے روم میں گزارنا پڑتا ہے۔"

"لیکن اس مسئلے کا ایک حل اور بھی تو ہے نا؟" تانیہ نے معنی خیزی سے دھیان دلایا، چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

"اس کے لیے وہ تیار نہیں۔" منصب نے مایوسی سے سر نفی میں ہلایا۔

"کیا مکمل انکار۔ مطلب کوئی گنجائش نہیں؟" وہ متعجب ہوئی۔

"ہاں لگتا تو ایسا ہی ہے۔"

"پھر تو تمہیں اپنی امی کو کنوینس کرنا چاہیے کہ وہ تمہیں جانے دیں۔ ان سے وعدہ کرو کہ آتے جاتے رہو گے۔ وہ بھی تم سے ملنے بلکہ کبھی کبھار رہنے آ سکتی ہیں۔ یہاں وسیلہ کے پاس تو دادی ہیں۔"

"تو پھر کوارٹر کی درخواست دے دوں؟"

"ایک بار وسیلہ سے بات کر لیں؟ اگر تم کہو۔" تانیہ نے اجازت چاہی۔

"مجھے نہیں لگتا۔ شاید وہ مجھے معاف نہیں کر پا رہی، اور جسٹی فائڈ بھی ہے۔" منصب نے کندھے اچکائے "میری کم ہمتی نے اس کی زندگی کیا سے کیا کر دی تھی۔ ایسے انسان سے آگے وہ کیا اچھی امید رکھے۔"

"لیکن تم لوگ اب ایک ہی فیملی ہو۔ خدشات ہونے تو نہیں چاہئیں۔"

"اور اگر پھر بھی ہیں تانیہ۔ تب دباؤ دینا بالکل جائز نہیں۔"

"ہاں خیر!" اس نے ہاتھ جھٹکے "قائل کرنے اور مجبور کرنے کا فرق میں سمجھتی ہوں۔ وسیلہ خود بہت میچور اور سمجھ دار ہے۔ اس کے انکار کی ضرور کوئی وجہ ہو گی۔ او کے پھر مجھے اجازت۔ میں آج امی ابو سے مینگورہ جانے کی بات کرتی ہوں۔"

"ہاں۔ پھر دوست سے ملنے سفر کر کے آنا پڑے گا۔" وہ مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ "بلکہ کچھ زیادہ طویل سفر۔" منصب نے ابرو اٹھا کر دور کا اشارہ کیا۔ جس پر تانیہ بے ساختہ ہنس پڑی۔ منصب کا اشارہ یقیناً مرغزار کی جانب تھا۔

"دیکھتے ہیں۔" وہ شرمادی، اور منصب نے اس کے شرمانے کو اس کی رضامندی کی نظر سے دیکھا۔ عیسیٰ کا صبر ضرور رنگ لانے والا تھا۔

☆☆☆

راشد کے گھر والے کچھ دن ہوئے ہو کر جا چکے تھے۔ شادی کے لیے دو ماہ بعد کی تاریخ رکھی گئی تھی۔ گھر میں ان دنوں سب کی توجہ کا مرکز رمشہ کی شادی تھی۔ لیکن رمشہ خود کسی اور ہی چکر میں الجھی تھی۔ اس نے منصب کو وہ ساری باتیں بتا دیں جو اس روز وسیلہ نے کی تھیں۔

"واؤ انٹرسٹنگ!" وہ بہن کی بات سن کر بے اختیار کچھ ایسے ہنسا کہ رمشہ نے اُسے گھور کر دیکھا۔

"اس میں انٹرسٹنگ کیا ہے بھلا؟"

"مجھے پہلے دل کھول کر ہنس تو لینے دو۔"

"تم پاگل ہو گئے ہو منصب۔" رمشہ اب جھنجھلا رہی تھی۔

"ہوں، اوکے۔ سنجیدہ بات کرتے ہیں۔" اس نے ہنسی روکی "اور کیا کیا باتیں ہوئیں؟"

"بس پھر آخر میں اس نے یہ کہا کہ میرا اس سب میں کوئی انٹرسٹ نہیں ہے، یہ تو نیں امی اور دادی کی وجہ سے چاہ رہی ہوں کہ حقیقت کا پتا چلے تاکہ وہ اس پر دباؤ ڈالنا بند کر دیں۔"

"ہوں۔" منصب نے بھی اس بار سنجیدگی سے سنا۔ "حقیقت تو واقعی پتا چلنی چاہیے۔"

"مجھے بھی بتاؤ، کیا ہے حقیقت؟"

"تم تو خیر بہت بڑی الو ہو۔ تمہیں میں بتا بھی چکا ہوں لیکن تم وسیلہ کا دماغ صاف نہیں کرپائیں۔ چلو، خیر اسی میں بہتری تھی۔" وہ آخر میں پھر مسکرانے لگا۔

"اُلو نہیں ہوں۔" رمشہ بھی ہنس دی "میں نے بھی اسی لیے نہیں بتایا وہ تانیہ کو بہن سمجھنے والی بات۔ کیونکہ میں چاہتی تھی اب یہ معاملہ ذرا خوب صورت طریقے سے نمٹے۔"

"واہ! منصب نے بے اختیار اسے تعریفی نظر سے دیکھا" پھر تو مجھے اپنے الفاظ واپس لینے چاہئیں۔"

"جی ہاں۔ اور یہ بتاؤ کہ تم کیا سوچ رہے ہو"

"میں تو نکلنے کے لیے کوئی خوبصورت مقام سوچ رہا ہوں، لیکن ایک تو ہر طرف برف پھیلی ہے۔ اِس ٹھنڈ میں نکلیں بھی تو کہاں۔" وہ اب سر کھجا رہا تھا۔

"وہ ایسا کرتے ہیں شاپنگ کے بہانے ایک آدھ چکر مینگورہ کا لگا آتے ہیں وہاں جانے سے وسیلہ بھی انکار نہیں کرے گی۔ تم بہت خوش لگ رہے ہو یہ سب سن کر۔ کیا وجہ ہے؟"

"وجہ تو بہت واضح ہے نا۔ اب تک میں یہ سمجھ رہا تھا کہ اس نے مجھے معاف نہیں کیا اس لیے میرا ساتھ نامنظور ہے۔ لیکن یہاں تو معاملہ غلط فہمی کا نکلا۔ وہ صرف اس لیے سب کو انکار کررہی ہے کہ اسے لگتا ہے اب میری دلچسپی کا محور تانیہ ہے، اور وہ ہمارے آڑے نہیں آنا چاہتی، اور ظاہر ہے کہ اب مجھے اس کی غلط فہمی دور کرنی ہے تیاری کرلی ہیں۔"

"اوکے۔" رمشہ بھی خوش دکھائی دے رہی تھی۔ عجلت سے باہر نکل گئی۔ اسے اب جلد از جلد ایلیا وغیرہ سے مشورہ کرنا تھا۔

☆☆☆

کھلی کھلی دھوپ لیے وہ بھی ایک خوش گوار اتوار تھا۔ ہفتے بھر سے یہاں اچھی دھوپ نکل رہی تھی۔ برف پگھلنے کا موسم آ گیا تھا۔ سڑکیں اور آبادیاں تو تقریباً صاف بھی ہوچکی تھیں۔ سفیدی اب اونچی چوٹیوں تک جارہی تھی۔ ناشتے کے بعد وہ سب دو گاڑیوں میں مینگورہ کے لیے روانہ ہوئے۔

وسیلہ اگرچہ جانے کے لیے تیار نہ ہورہی تھی لیکن اس کے علاوہ یہاں باقی سب جانتے تھے کہ یہ پروگرام تو بنایا ہی اس کے لیے گیا تھا، تب ہی رمشہ جذباتی بلیک میل دیتے خفا ہوگئی تو وسیلہ بھی جانے کے لیے تیار ہوگئی۔ دادی، رضوانہ، عذرت اور توفیق صاحب گھر پر ہی تھے۔ مومن نے گھر سے روانہ ہوتے وقت بڑی شرافت کا مظاہرہ کرتے ایلیا، بچوں اور وسیلہ کو اپنے ساتھ بٹھالیا اور رمشہ بھائی کے ساتھ اس کی گاڑی میں بیٹھ گئی۔

سب کچھ چونکہ پہلے ہی اَپس میں طے تھا اس لیے خاموشی اور سنجیدگی سے سفر شروع کردیا گیا۔ وسیلہ کو ان سب کے عزائم کی بھنک تک نہیں پڑی۔ وہ ریبا کو لیے پچھلی سیٹ پر مگن بیٹھی تھی۔ میاندم سے نکل کر مین روڈ پر آتے ہی سردی کی شدت بھی بہت حد تک کم ہوگئی۔ دریائے سوات کے کنارے کنارے مینگورہ کا سفر جاری تھا۔ میاندم سے نکلے انہیں کچھ ہی دیر ہوئی تھی۔ اگلی آبادی آئی تو چائے لینے کے لیے مومن نیچے اترا اور ایلیا کو بھی اشارے سے ساتھ آنے کا اشارہ کردیا۔

"یہ کہاں رک رہے ہو؟" وسیلہ نے ابرو سکوڑ کر باہر دیکھا

"بس چائے کافی کا پتا کررہے ہیں۔" مومن مختصر جواب دے کر ایلیا اور بچوں سمیت دور چلا گیا۔ وہ پرس سے موبائل نکال کر اس پر جھک گئی۔ درمیان میں شاید دو ہی منٹ گزرے تھے کہ گاڑی کا دروازہ کھول کر کوئی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اور فوراً ہی گاڑی تیز رفتاری سے اسٹارٹ بھی ہوگئی۔ وسیلہ نے تعجب سے سر اُٹھایا کہ مومن بھائی نے ایلیا اور بچوں کی آمد کا انتظار کیے بغیر گاڑی کیوں چلا دی لیکن نظر منصب پر پڑی تو بری طرح بوکھلائی۔

"یہ آپ کی گاڑی نہیں ہے۔" وہ پوری قوت پر
اسے غلط فہمی ہی تھی اس لیے چلا اٹھی لیکن جب منصب
پر اس شور شرابے کا کوئی اثر نہ ہوا۔

وسیلہ کی پلکیں غصے اور جھنجھلاہٹ سے نم ہو رہی تھیں نہ اسے ان سب کی پلاننگ پسند آئی تھی نہ منصب کی یہ دل لگی کی باتیں کوئی اثر کر رہی تھیں۔ وہ کھولتا دماغ لیے گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔

جب منصب نے گاڑی فضا گٹ کے خوب صورت پارک کے سامنے سڑک سے اتار کر ایک پر سکون جگہ روک دی۔ صبح سویرے شدید سردی کے موسم میں پارک بالکل ویران پڑا تھا۔ منصب مسکرا کر کار سے نیچے اتر گیا۔ شکر ادا کیا کہ پارک کا کیفے ٹیریا کھلا ہوا تھا۔ اس نے دو کپ کافی بنوائی اور واپس آ کر پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر پہلے چھوٹی ٹرے درمیان میں رکھی اور خود بھی سامنے بیٹھ گیا۔ کار کا دروازہ کھلا ہی رہنے دیا۔

"سوری، بنا تمہاری اجازت کے یہ سب پلان کرنا پڑ گیا۔" وسیلہ چہرے پر خفگی اور آنکھوں میں اجنبیت لیے چہرا دوسری جانب کیے بیٹھی تھی۔

"لیکن وسیلہ۔ اگر ایک شخص اپنے کیے پر نادم ہے، اور معافی مانگنا چاہتا ہے تو اسے کم از کم اس کا موقع تو ملنا چاہیے۔ کیا یہ سب باتیں میرے دماغ کو کچوکے نہیں لگاتیں کہ اگر میں نے اس وقت شادی سے انکار نہ کیا ہوتا تو تمہاری زندگی اتنے بڑے طوفان سے نہ ٹکراتی، تمہیں دوبارہ پروپوز کرنے کے پیچھے کسی ہمدردی یا ازالے جیسے کوئی جذبات نہیں ہیں۔ غلطی پر پچھتاوا اپنی جگہ۔ لیکن تمہارا ساتھ چاہنے کے پیچھے صرف میری محبت کارفرما ہے۔

رمشہ نے بتایا کہ تم وکالت شروع کرنا چاہتی ہو، مجھے سن کر خوشی ہوئی۔ اور یہ سن کر اور بھی اچھا لگا کہ تم اپنے حق کے لیے لڑنا چاہتی ہو۔ تم پر جس جس کی طرف سے جو جو زیادتی ہوئی، تم اپنی تعلیم اپنی ڈگری کے بل پر اس کو کٹہرے میں کھڑا کرنا چاہتی ہو، یہ یقیناً تمہارا حق ہے میں بس تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔" وسیلہ خاموش تھی۔ اس نے کافی کا کپ اسے تھمایا۔

"اور ہاں، ایک بات اور۔ انسان کی زندگی میں بدلاؤ آنا بھی بھلے ایک حقیقت ہے لیکن سوچنے کی بات ہے کہ اگر کہیں کوئی تبدیلی آ چکی تھی اور میں مروت میں یا مجبور کیے جانے پر تمہیں پروپوز کر رہا تھا تو تمہارے انکار کے بعد پیچھے ہٹنا اور اس نئے رجحان کی طرف قدم بڑھانا میرے لیے کتنا آسان ہو جاتا لیکن میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ جب تک تم چاہو، میں تمہارا انتظار کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

"ہمیں چلنا چاہیے۔" اس نے خالی کپ سامنے رکھتے بنا اس کی طرف دیکھے آرڈر جاری کیا اور منصب نے کچھ دیر اسے دیکھا اور پھر گاڑی سے باہر نکل گیا۔

"چلو کم از کم اس نے سنا تو سہی۔" وہ اسی پر اکتفا کرتے ڈرائیونگ سیٹ پر واپس آیا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

☆☆☆

"بس جی، ہو گئی شاپنگ۔" ایلیا نے ڈھیر سارے شاپنگ بیگز ڈگی میں ٹھونسے اور مومن نے ہاتھ اٹھا کر اللہ کا شکر ادا کیا۔

"اور اب سوائے کسی اچھے ریسٹورنٹ جانے کے میرا کہیں اور جانے کا موڈ نہیں۔" اس نے انگلی اٹھا کر متنبہ کیا۔ رمشہ، وسیلہ اور تانیہ بھی ان کے قریب آ چکی تھیں۔ تانیہ کچھ دن ہوئے اپنی فیملی کے ساتھ اپنے جنگورہ والے گھر دوبارہ شفٹ ہو چکی تھی۔ اسے رمشہ نے کال کر کے شاپنگ سنٹر بلا لیا تھا۔ وہ بھی کافی دیر سے ان کے ساتھ شاپنگ کروانے میں مصروف تھی۔ تانیہ نے ان سب سے اپنے گھر آنے پر بہت اصرار کیا لیکن مومن کا کہنا تھا کہ رمشہ کی شادی کا دعوت نامہ دینے وہ باقاعدہ اہتمام سے آئیں گے۔ تب ہی دوپہر کا کھانا ریسٹورنٹ میں کھایا گیا۔ کھانے کے دوران ان کے درمیان یہ طے پایا تھا کہ ساری لیڈیز اور بچے مومن کی کار میں

میاندم روانہ ہو جائیں گے اور منصب تانیہ کو اس کے گھر چھوڑنے کے بعد پیچھے آئے گا۔ اس وقت سہ پہر کے تین بجے تھے۔ منصب تانیہ کو لے کر اس کے گھر کے لیے نکلا اور وہ سب میاندم روانہ ہو گئے۔

مومن نے بڑے روڈ سے میاندم کی طرف ٹرن لیا تو موبائل پر منصب کی کال آنے لگی۔

"ہاں بھئی، کہاں پہنچے تم، ہم تو گھر والے روڈ پر چڑھ آئے۔"

"ہاں وہ ایکچوئلی یہی بتانے کے لیے کال کی تھی، میں فی الحال گھر نہیں آ رہا۔" منصب نے کچھ ٹھہر ٹھہرا آغاز لیا تو مومن چونک گیا۔

"کیا مطلب۔ کہاں ہو تم؟"

"میں تھانہ جا رہا ہوں۔"

"تھانہ۔ کیوں؟" مومن کو سن کر ہی تشویش ہوئی لیکن پھر سوچا شاید اپنی بہن سے ملنا ہو۔

"کیا سسٹر کی طرف؟"

"آں۔ وہاں بھی جاؤں گا، لیکن ابھی تو حویلی۔" وہ مومن کے لہجے کو دیکھتے سنبھل کر جواب دینے کی کوشش کر رہا تھا لیکن مومن کے لیے پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔

"کیوں منصب۔ اچانک حویلی کس لیے۔ تمہیں پتا ہے وہاں۔" وہ کہتے کہتے رک گیا۔ باقی سب اس کی جانب متوجہ تھیں۔

"یار ٹینشن مت لو۔ بس وہ گلناز خالہ کی کال آئی تھی۔ شہناز تائی کی وجہ سے بہت پریشان تھیں۔ میں چاہتا ہوں، ارحم کو سمجھاؤں۔"

"یہ سب تمہارے کرنے کے کام نہیں ہیں منصب! ان سب سے دور ہی رہو۔ میں تو کہتا ہوں واپس آ جاؤ۔" مومن نے کار پارکنگ میں روکی۔ خواتین سامان لے کر اندر آ گئیں لیکن سب کے چہروں پر پریشانی آ چکی تھی۔ رمشہ کا بس نہیں چل رہا تھا، یہیں سے واپس پلٹ جاتی اور بھائی کو اپنے ساتھ لے آتی۔ اسے معلوم تھا کہ ارحم نے کسی کرائے کے قاتل کو کر رکھا ہے۔ ایسے میں منصب کا تھانہ جانا۔ وہ کمرے میں آ کر ست سی بیٹھ گئی۔

"کیا ہوا۔ شاپنگ اچھی نہیں ہوئی؟" رضوانہ ان کے اترے چہرے دیکھ کر عام انداز میں مسکرائیں لیکن ایلیا اور رمشہ نے بے ساختہ ایک دوسرے کو دیکھا۔

"جی نہیں، بس تھکاوٹ ہے۔" ایلیا ہلکا سا مسکرائی۔

"امی کو بتا دو ایلیا! وہی روک سکتی ہیں بھیا کو۔" رمشہ نے دھیمی آواز میں کہنا شروع کیا لیکن رضوانہ نے پھر بھی سن لیا۔

"کیا بتا دو۔ کیا ہوا؟" وہ تو بتا جانے ہی ہاتھ پیر چھوڑنے لگیں۔ ایلیا نے لب چباتے وسیلہ کو دیکھا پھر خود ہی امی کو بتا دیا کہ "منصب بھیا تھانہ گئے ہیں۔ وہ بھی حویلی۔"

"پاگل ہے یہ لڑکا!" انہوں نے ہاتھ سینے پہ مارا "وہ۔ کیا نام ہے، کوئی بادشاہ خان اس کے پیچھے لگا ہے نا۔ تت۔ تو ایسے میں وہاں جانے کا کیا مطلب، میرا فون دو ایلیا۔" وہ دل پہ ہاتھ رکھے بیٹھ ہی گئیں۔

"اتنا کیوں پریشان ہو رہی ہیں۔ بیٹھ جائیں یہاں۔" وسیلہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ماں کے پاس آئی۔ ایلیا اس دوران منصب کو کال ملاتے ہوئے ماں کے قریب آئی۔

"ہیلو منصب۔ کہاں ہو۔ دیکھو، تم فوراً واپس آؤ۔"

"ارے امی! کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ اب تو میں تھانہ پہنچنے والا ہوں۔ آپ پلیز زیادہ نہ سوچیں۔ بس گلناز خالہ اور تائی سے مل کر واپس آ رہا ہوں۔"

اس نے ماں کی نہ سنتے بس اپنی کہہ کر کال ہی آف کر دی۔

"یا اللہ۔ یہ تو کچھ سن ہی نہیں رہا۔ ارے کوئی دادی کو بتاؤ۔"

وہ ہاتھوں پہ سر گرائے نڈھال سی ہو گئیں۔ محض دو چار دن پہلے خود ہی بیٹھا بتا رہا تھا کہ ارحم نے

pklibrary.com

کرائے کا قاتل چھوڑا ہے اس کے پیچھے۔ ایسے میں خود خطرے کے منہ میں جانا، وسیلہ نے انہیں زبردستی لٹا دیا۔ دادی بھی سن کر پریشان ہوگئیں۔ ندرت مامی اور توفیق ماموں بھی وہیں آگئے۔ سب ہی اپنے اپنے تبصرے کررہے تھے۔

وسیلہ اگرچہ کسی بات میں حصہ نہیں لے رہی تھی لیکن ذہن اس کا بھی متواتر ایک ادھیڑبن میں تھا۔ آخر منصب نے اتنی لاپروائی کا مظاہرہ کیوں کیا تھا۔ کیا اس کی سرد مہری وجہ بنی تھی۔ وہ لب کاٹتے بے سر پیر کی باتیں سوچ رہی تھی۔ وہ خاموشی سے آکر اپنے کمرے میں بیٹھ گئی۔ رمشہ پریشانی سے یہاں وہاں چکر کاٹ رہی تھی۔ ساتھ ساتھ بڑبڑا بھی رہی تھی۔

وسیلہ کے جی میں آیا کہ رمشہ کے تو بہن اور بہنوئی تھانہ سے ہیں۔ تو اسے ان کو کال کرنی چاہیے لیکن رمشہ کا تو لگتا تھا دماغ ہی کام کرنا چھوڑ گیا تھا۔ اور وسیلہ مارے لحاظ کے کہہ ہی نہیں پارہی تھی۔ آخر رمشہ کو خود کیوں خیال نہیں آرہا تھا، انیس بھائی خود حویلی جاکر منصب کو وہاں سے واپس لاسکتے تھے۔ لیکن وہ یہ سب باتیں بھی سوچ کر رہ گئی۔ کہنے کی جرات نہیں کرپائی۔

☆☆☆

"مومن، تم منصب کو کال ملاؤ، اتنی دیر ہوگئی، اب تو وہ حویلی سے نکل آیا ہوگا۔"

توفیق صاحب نے مومن سے کہا تو اس نے فوراً موبائل نکالا۔ لیکن منصب کا نمبر بند آرہا تھا۔ مومن کا دل بے ساختہ بہت شدت سے دھڑکا۔

"نمبر آف ہے۔" اس نے ڈرتے ڈرتے پھوپھو کو دیکھا لیکن انہوں نے پھر یا اللہ کہہ کر سر پکڑا۔

"اب کیا کریں۔ دیکھ رہے ہیں بھیا۔ کتنا لاپرواہ ہے۔ میرا کچھ خیال ہی نہیں۔" وہ باقاعدہ رونے لگ گئیں۔

"اچھا اب رونا بند کرو، خیریت کی دعا کرتے ہیں۔" انہوں نے تسلی دینے کی کوشش کی اور وسیلہ جو اسی وقت دروازے میں آکر رکی تھی۔ واپس پلٹ کر کمرے میں آئی۔

"رمشہ! تم اپنی سسٹر کو کال کرو، میرا مطلب ہے میمونہ سے بات کرو۔" وہ اکثر ہی بھول جاتی تھی کہ رمشہ اور میمونہ ہی اس کی سگی بہنیں ہیں۔ انیس بھائی ذرا جا کر پتا کریں۔" وسیلہ نے اس بار بنا کسی سوچ بچار کے سیدھے کہہ دیا اور رمشہ کو بھی ہوش آیا۔

"ہاں، میمونہ سے بات کرنی چاہیے۔ مجھے یہ خیال کیوں نہیں آیا۔" وہ فوراً اپنے موبائل کی طرف لپکی۔ وہ بھی سن کر پریشان ہوگئی تھی۔

"بابا سے ہمیشہ یہ ان ہی حرکتوں پر ڈانٹ کھاتا تھا۔" وہ پلنگ کے کنارے بیٹھی اب انگلیاں چٹخا کر ٹینشن نکال رہی تھی۔ وسیلہ نے اسے مسکرا کر دیکھا۔ رشتوں کی تبدیلی محبت میں کمی نہیں لاسکی تھی۔ وہ حقیقتاً اپنے بھائی کے لیے پریشان تھی۔ میمونہ کی کال قریب بیس منٹ بعد آئی۔

"کہو۔ منصب سے بات ہوئی۔ کہاں ہے؟" وہ موبائل آن کرتے ہی شروع ہوگئی۔

"نہیں یار۔ میرا تو اپنا دماغ اب کام نہیں کررہا۔ منصب کا موبائل تو ویسے بھی بند آرہا تھا۔ میں نے انیس کو حویلی بھیجا تو ارحم نے کہا کہ یہاں تو منصب آیا ہی نہیں۔ اب یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ تمہارے مطابق تو اسے حویلی پہنچے بہت وقت ہوگیا۔ یہ تو مجھے صاف کچھ گڑبڑ لگ رہی ہے۔ انیس اب راشد سے رابطہ کررہے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ تم لوگوں نے اسے اجازت کیسے دی۔"

"ہم سے کیا پوچھ کر گیا تھا۔ اور یہ ارحم۔" رمشہ اپنی پلکیں جھپک کر اپنا رونا قابو میں کررہی تھی۔ "میمونہ! اس نے منصب کے ساتھ کچھ کرنہ دیا ہو۔"

"اللہ نہ کرے۔ میں انیس سے کہتی ہوں پولیس میں بات کریں۔" میمونہ کا دل ڈوبنے سا لگا۔ وسیلہ ان دونوں کی باتیں سن رہی تھی۔ اس نے ایک دم ہی آگے بڑھ کر رمشہ سے موبائل لے لیا۔

"میمونہ آپی۔ میں وسیلہ۔"

"وسیلہ!" میمونہ نے اسے پیار سے پکارا" کہو کیسی ہو؟"

"آپی۔ وہ۔" وہ کہتے ساتھ ہی اٹک سی گئی۔

"ہاں کہو وسیلہ۔"

"وہ آپ انیس بھائی سے کہیں کہ ارحم سے دوبارہ ملیں۔ اور اُن سے کہیں کہ ہم ان پر لگے سارے کیس واپس لے لیں گے۔ میرے ساتھ جو کچھ ہوا۔ میں انہیں معاف کرتی ہوں۔ لیکن وہ منصب کو واپس بھیج دیں۔"

"ہاں۔ ہاں۔ میں کہتی ہوں۔" میمونہ نے فوراً ہی کال کاٹ دی۔ رمشہ نے وسیلہ کی طرف دیکھا تو اس کا چہرا ایک دم اترا ہوا محسوس کیا۔ منصب کی گمشدگی کی پریشانی اس کے بھی چہرے سے عیاں تھی۔ وہ وہاں زیادہ دیر تک نہیں بیٹھ پائی اور واش روم میں گھس گئی۔ رمشہ کو صاف لگا کہ اسے رونا آرہا تھا۔ لیکن وہ اپنے جذبات چھپانا چاہتی تھی۔

☆☆☆

"کیا ہوا ہے تائی کو؟" وہ شہناز تائی کے سرہانے کھڑا نہایت افسوس سے گلناز بی بی کو دیکھ رہا تھا۔ شہناز تائی ایک دم بیمار نڈھال اور غشی کی حالت میں محسوس ہوئیں

"وہ۔ ارحم شاید۔ اپنے نام کروا رہا تھا سب کچھ، لیکن۔ آپا کو پتا چلا تو کاغذ پھاڑ دیے۔ تو ارحم نے ماں سے بہت جھگڑا کیا۔ ہاتھ بھی اٹھا دیا۔ تمہیں جان سے مارنے کی باتیں کر رہا تھا۔ آپا پھر عجیب عجیب باتیں کرنے لگیں۔ ارحم کو بددعائیں دے رہی تھیں۔" گلناز ساری بات بتاتے اسے دکھی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ وہ اب بھی رک رک کر بہت دھیمی آواز میں بات سمجھا پائی تھیں۔ ایک مدت سے بولنے کی عادت ختم ہو گئی تھی، تو بات کرتے خود بھی بے یقین سی رہتیں۔

"ابھی ارحم کہاں ہے؟"

"ڈیرے پر۔ تم۔ اُدھر نہیں گئے؟"

"نہیں میں تو سیدھا اندر آگیا۔ آپ کسی ملازم سے کہہ کر اس کو ذرا گھر بلائیں۔" وہ دور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ گلناز باہر چلی گئی۔ ارحم قریب دس بارہ منٹ بعد اندر آیا تو منصب کو دیکھ کر بری طرح چونکا۔

"تم۔ یہاں؟" وہ دروازے میں ہی رُکا۔

"کمال ہے تمہیں حیرت ہو رہی ہے۔ تمہارے بندے تو نظر رکھتے ہیں نا مجھ پر؟" وہ مسکرا دیا۔

"کس لیے آئے ہو؟" اس کا ماتھا ٹھنک گیا۔

"تمہاری خالہ نے بلایا ہے۔ اور یہ تائی کو کیا ہوا ہے۔ ڈاکٹر کو کیوں نہیں دکھاتے، حالت دیکھی ہے اِن کی۔"

"میں نے کچھ نہیں کیا۔ اپنے شوہر کے کرموں کو روتی رہتی ہیں۔" وہ استہزائیہ ہنسا اور منصب بس ایک دکھ بھری نظر ڈال کر رہ گیا۔

"وجہ جو بھی ہو ارحم۔ خیال تو تمہیں رکھنا چاہیے۔"

"مجھے تمہارے مشورے کی ضرورت نہیں، میری ماں ہے، میں خود دیکھ لوں گا۔"

"اِن کا علاج کراؤ، اور جب یہ ٹھیک ہو جائیں تو انہیں بتاؤ کہ منصب کو اس کی جائیداد میں کوئی حصہ نہیں چاہیے۔ میری طرف سے سب کچھ تمہیں مبارک ہو۔ میرے خلاف منصوبے بنانا بند کر دو، نقصان تمہارا ہی ہوگا۔"

"وہاٹ دا ہیل۔" وہ طنزیہ ہنسا" کیا بگاڑ لو گے تم میرا؟"

"بتاؤں۔ یا سنواؤں؟" منصب نے اس مرتبہ مسکرا کر اسے دیکھا اور موبائل نکال کر ایک وائس میسج اوپن کیا۔

"اچھا تو سن ہی لو۔" اس نے آواز اونچی کر کے موبائل ارحم کے نزدیک کیا۔

"ہیلو منصب، کیا حال ہیں۔ اچھا وہ بادشاہ خان کا ٹھکانا معلوم ہو گیا ہے۔ آج ہی اسے ساتھیوں

pklibrary.com

سمیت گرفتار کرلیا گیا ہے۔ اس نے یہ اقرار بھی کرلیا ہے کہ ارحم خان اس کے ساتھ رابطے میں تھا۔ اور یہ ارحم خان کے لیے کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔ بادشاہ خان کے ایجنسیوں سے رابطے تھے۔ ارحم کا اسے ہائیر کرنا اُسے سلاخوں کے پیچھے ڈال سکتا ہے۔ بہتر ہوگا ارحم کو اس بارے میں آگاہ کردو، باقی تمہیں بہت مبارک ہو، بادشاہ خان کی گرفتاری کے ساتھ ہی تمہاری جان کو لگے خطرات بھی ٹل گئے ہیں۔ ٹیک کیئر۔

"وائس ختم ہوگئی۔" منصب نے موبائل آف کیا۔

"یہ اے ایس پی شفقت احمد تھے۔ اور تمہارا ساتھی اس وقت پولیس کی حراست میں ہے۔ اِن فیکٹ تمہارے گرد بھی گھیرا تنگ ہونے والا ہے۔"

"یہ۔ یہ۔ سب جھوٹ ہے۔" ارحم کی زبان لڑکھڑا گئی۔

"اوکے۔ تو بادشاہ کو کال کرکے دیکھ لو۔ وہ تمہیں سچ بھی بتادے گا اور پولیس کے ہاتھ تمہاری ایک اور ثبوت آجائے گا تمہارے اس سے رابطے میں ہونے کا۔" اس بار منصب کا لہجہ طنزیہ ہوا اور ارحم کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

"تم میرے ساتھ ایسا نہیں ہونے دے سکتے۔" وہ بوکھلا سا گیا۔

"ہاں بالکل۔ تم میرے تایازاد ہو، میں چاہوں تو تمہیں بچا سکتا ہوں۔ لیکن میری شرط؟" اس نے ابرو اٹھایا۔

"بولو۔ کیا شرط ہے؟" ارحم نے بادلِ نخواستہ لہجہ نرم رکھا۔

"تائی کا علاج، ان کی دیکھ بھال۔ ان کا ہر طرح سے خیال رکھنا۔ اگرچہ یہ باتیں شرطوں سے کرنے والی نہیں ہیں۔ اولاد کی حیثیت سے تمہارا فرض ہیں۔۔ دوسرے مجھ سے اور میرے معاملات سے مکمل لاتعلقی برتو گے۔ ویسے بھی ایک نتیجہ تم ابھی ابھی دیکھ چکے، اور اگر میں درمیان میں نہ آؤں تو بہت جلد بھگت بھی سکتے ہو۔ تیسرے مجھے واقعی اس حویلی اور اس کی دولت سے کوئی سروکار نہیں۔ لیکن کان کھول کر سن لو، میں نے اپنا حصہ تائی امی کے نام کردیا ہے جو ان کی وفات کے بعد مجھے منتقل ہوجائے گا۔ اس لیے تم ان کا خیال رکھو، ان کی زندگی کی دعا مانگو تمہارا یہ عیش و آرام ان کی زندگی تک ہے۔"

یہ سن کر ارحم پر سکتہ طاری ہوگیا تھا۔

"ایک بات بتاؤں ارحم! تم نے ہمارے ہر رشتے کو صرف دولت کے تناظر میں دیکھا ہے جبکہ میرے لیے صرف رشتے اہم ہیں۔ آج میں خود کو تم سے کہیں زیادہ امیر سمجھتا ہوں کیونکہ مجھے محبت کرنے والا بھرا پرا خاندان مل گیا ہے۔ ایک دن تم نے مجھے نمک حرام، احسان فراموش اور نجانے کیا کچھ سنادیا تھا جبکہ حقیقت یہ نکلی کہ دادی کے میری تعلیم پر لگائے اخراجات تو دراصل ازالہ تھے اس حادثے کا جو نہ چاہتے ہوئے بھی ان سے سرزد ہوگیا تھا۔

ہاں جب بھی میں نے یہ دیکھا کہ تم اس دولت، اس حیثیت کا غلط استعمال کررہے ہو تو میں واپس آنے میں دیر نہیں لگاؤں گا، اور تم دیکھو گے کہ تم سے کیسے اپنے حصے کی ایک ایک پائی وصول کرتا ہوں۔ لہٰذا بہت سنبھل کر رہنا۔"

منصب نے انگلی اٹھا کر اسے وارن کیا اور گلناز بی بی کی طرف دیکھا۔

"آپ مجھ سے رابطے میں رہیے گا خالہ! اور یہ ارحم آپ کو کبھی منع نہیں کرے گا۔" تائی کی طبیعت ٹھیک ہوجائے تو میں ان سے ملنے دوبارہ آؤں گا۔ ابھی مجھے اجازت۔ وہ کہہ کر رکا نہیں اور باہر نکل آیا۔ موبائل پر ڈھیر ساری مسیڈ کالز آئی ہوئی تھیں۔ اسے ایک ایک کرکے سب کو تسلی دینی تھی۔ جانتا تھا اس کا موبائل آف ہونے کی وجہ سے سب پریشان ہوگئے تھے۔

منصب کو مینگورہ میں شاپنگ کے دوران سر شفقت کی کال آئی تھی۔ وہ اسے کچھ خاص بتانا چاہتے تھے۔ منصب نے انہیں بتایا کہ وہ اس وقت

pklibrary.com

مینگورہ میں ہے اور اسے تھانہ میں کچھ اور کام بھی ہیں اس لیے وہ کچھ دیر میں وہیں حاضر ہوتا ہے۔ لیکن تانیہ کو چھوڑ کر جونہی سفر پر روانہ ہوا، امی کی کال آئی اور اس کے بعد چارجنگ ختم ہونے کی وجہ سے اس کا موبائل آف ہوگیا۔ موبائل کو اس نے شفقت سر کے آفس میں آکر تھوڑا سا چارج کیا۔

انہوں نے جب بادشاہ خان کی گرفتاری کا بتایا تو منصب نے ہی ان سے کہا کہ وہ اس بیان کا باقاعدہ اسے ایک وائس بھی بھیج دیں کیونکہ ارحم اس طرح یقین نہیں کرے گا۔ پھر پولیس اسٹیشن سے وہ سیدھا حویلی آیا۔

یہاں کے معاملات نمٹا لینے کے بعد پہلا فون میمونہ کو کیا۔ اس سے خوب ساری ڈانٹ کھائی اور اب مسکراتے ہوئے میمونہ کے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ میمونہ نے کہا کہ "میاندم کال کر کے خود ہی سب کو بتائی ہوں کہ تم کہیں گم دم نہیں ہوئے اور ہٹے کٹے ہو۔" وہ غصے میں کہہ کر کال کاٹ گئی۔ منصب نے قہقہہ لگایا۔

☆☆☆

"جانتے بھی ہو، کتنا پریشان کیا ہے تم نے سب کو۔" میمونہ نے اس کے بازو پہ دوہتڑ جمائے۔

"مجھے جب ارحم نے کہا کہ یہاں تو تم آئے ہی نہیں، قسم سے مجھے چکر آگیا۔" انیس نے سر گھما کر بتایا تو منصب زور سے ہنس دیا۔

"یار! جب تم نے اس سے پوچھا تب میں واقعی ان سے نہیں ملا تھا۔ تھانہ آتے ہی پہلے پولیس اسٹیشن جانا پڑ گیا۔ وہاں کافی دیر بیٹھا رہا۔ اس دوران موبائل بھی آف تھا۔ تب ہی شاید میاندم اور تھانہ میں میری ڈھنڈیا مچ گئی۔"

"اور کچھ لوگوں نے تو فوراً سارے ہتھیار ڈال دیے۔" میمونہ معنی خیزی سے مسکرائی تو منصب نے آنکھیں چھوٹی کر کے دیکھا۔

"مطلب؟"

"بتا دوں؟" میمونہ نے انیس سے تائید چاہی تو وہ بھی ہنس دیا۔

"بتاؤ بھی۔ کیا معمہ ہے؟"

"جس وقت ہر طرف تمہاری گمشدگی کی آگ لگی تھی، مجھے رمشہ کی کال آئی۔ اور اسی کے ہاتھوں سے وسیلہ نے موبائل لے کر مجھے کہا کہ انیس بھائی کو ارحم کے پاس بھیجوں تاکہ وہ ارحم سے کہیں کہ وسیلہ اس پر لگے سارے کیس واپس لینے کو تیار ہے۔ بس کسی طرح اس کے پولیس والے کو جان کی امان دی جائے۔" وہ آخر میں کھلکھلا کر ہنس پڑی لیکن منصب کو بالکل یقین نہیں آیا۔

"مذاق کر رہی ہو؟"

"ہاں بھئی، تمہیں کیسے یقین آئے گا۔ لیکن ہم تو تمہارے ساتھ میاندم جانے کو تیار بیٹھے ہیں۔"

"اچھا واہ۔ یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔ لیکن۔" وہ ایکدم چونکا "اس بات کا پچھلی بات سے کیا لینا دینا۔"

"وہ تو وہیں جا کر بتائیں گے۔" وہ شوخی سے ہنس دی۔ منصب نے کندھے اچکائے۔

"او کے تو پھر چلو میرے ساتھ۔ دیر کس بات کی ہے۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ چائے اس نے میمونہ کے گھر آکر پی تھی۔ اور اتنا ریسٹ کافی تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ میمونہ، انیس اور چھوٹے شہیر کو لیے میاندم کی طرف روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

"ایک تو ان رشتوں کے ہیر پھیر نے مجھے بالکل ہی چکرا دیا ہے۔ دیکھیں نا دادی۔ اب مجھے اپنی ہی سگی بہن کا ہاتھ مانگنے کے لیے اپنے بھائی کی سگی ماں کے پاس جانا ہے۔ ہاں۔ کچھ ایسا ہی۔ ہے نا؟" میمونہ نے اپنے ہی جملے کی تصدیق کے لیے رمشہ کو دیکھا اور وہاں موجود سب ہنس پڑے۔

"بس تم اتنا تردد نہ کرو۔ یہاں سب کو پتا ہے۔" دادی نے اسے چھیڑا۔

"ہاں اور جہاں تک تمہاری خواہش کی بات ہے تو ہم میں سے کسی کو کوئی اعتراض نہیں بلکہ مجھے تو

بن جائے گی، اور کبھی یہ سوچ کر خوشی ہوتی ہے کہ میرا بیٹا میرا داماد بن رہا ہے۔ وہی بات کہ کبھی عجیب سی خوشی ہوتی ہے تو کبھی واقعی سر چکرانے لگتا ہے۔" رضوانہ بھی تصور کر کے خوب لطف لے رہی تھیں۔

"اعتراض تو میرے بھائی کو بھی بالکل کوئی نہیں ہے۔" میمونہ دبی دبی ہنسی سے کہنے لگی "البتہ آپ کی بیٹی۔"

"مجھے لگتا ہے پیار سے بہت منا لیا، اب سختی کرنی پڑے گی۔" ندرت مامی نے سر ہلاتے کچھ سوچ بچار کی جس پر سب چونکے۔

"یعنی؟"

"توفیق سے کہتی ہوں، وہی جا کر بات کریں، ان کے سامنے چوں بھی نہیں کرتی۔"

رضوانہ چونکہ وسیلہ کی فطرت سے واقف تھیں تو انہیں ساری فکریں ندرت کے ایک آئیڈیے کے بعد زائل ہوتی محسوس ہونے لگیں۔

☆☆☆

توفیق ماموں بہت شفیق اور نرم خو انسان تھے لیکن اس کے باوجود ان کی شخصیت میں ایک رعب اور بات میں دم ہوتا تھا۔ وہ داؤد وغیرہ کے ویسے بھی قائل نہ تھے۔ البتہ ایک بات انہوں نے غور کرنے کے انداز میں وسیلہ کے سامنے رکھی کہ اسے اپنی ماں کی خوشی کو ضرور مقدم رکھنا چاہیے۔ منصب اس کا بیٹا تھا تو وسیلہ بیٹی۔ انہیں اگر منصب کو چھوڑ کر اس کے لیے کسی بھی اور کو پسند کرنا پڑا تو ویسی خوشی کبھی محسوس نہیں کر سکتیں جیسی منصب کے لیے کریں گی۔ وسیلہ نے ان کو خاموشی سے سنا اور اگلی صبح جب ایلیا اس کی رائے جاننے آئی تو اس نے ہامی بھر لی۔ اسی نئی خبر پر خوشی اور جوش دکھائی دیتا رہا۔ میمونہ آپی بھی ابھی یہیں تھیں۔ اور شادی کی تاریخ طے کر کے جانا چاہتی تھیں۔ وسیلہ اُس وقت آگ کے دھیمے شعلوں کو دیکھ رہی تھی جب دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ اس نے سر اٹھا کر یونہی سرسری دیکھا لیکن نظر جب ہوئی۔

"تھینک یو وسیلہ جی۔" وہ مؤدب بننے کی کوشش کرتے بھی مسکرا رہا تھا۔ وسیلہ نے گھبرا کر یونہی بالوں کو کان کے پیچھے دھکیلا۔

"یہ ہامی اُس دن نہیں بھر سکتی تھیں۔ فضا گٹ میں گلا گھونٹ رکھا تھا کسی نے۔" منصب کے لہجے میں شوخی تھی، وہ بس سر جھکا کر رہ گئی۔

"مجھے تو ماموں نے کہا۔" وسیلہ نے ازحد سنجیدگی کے ساتھ نہایت صاف گوئی سے وضاحت کی تو منصب کا منہ کھلا رہ گیا۔

"مطلب۔ فورس کیا گیا؟" اس کی بوکھلاہٹ اس کے لہجے سے عیاں تھی۔ وسیلہ نے خاموشی سے منہ پھیر لیا کہ اب یہی سچ تھا۔

"لیکن میں ہرگز اِس۔ دباؤ وغیرہ کے حق میں نہیں ہوں۔۔ اِس۔ ان فیئر۔" وہ ایکدم ہی بہت پریشان دکھائی دینے لگا تھا۔ "اور پلیز وسیلہ آپ وہی کریں جو آپ کی مرضی ہے۔ میں اِن سب کو خود سمجھا لوں گا۔" وہ دروازے کی طرف پلٹ گیا۔

"ہمارے بڑے ہمارے بھلے کے لیے ہی ہمیں سمجھاتے ہیں۔

امی کی صحت ان کی زندگی ان کی خوشی میرے لیے بھی ہر بات سے بڑھ کر ہے۔"

"لیکن امی کو خوش کرنے کا یہی ایک طریقہ تو نہیں ہے۔ آپ اپنی پریکٹس شروع کریں۔ وکالت کا باقاعدہ آغاز کریں۔ ان کو خوش اور مصروف دکھائی دیں۔ وہ خود بخود مطمئن ہوتی جائیں گی۔"

"دراصل مجھے۔ کچھ کنفیس (اقرار) کرنا ہے۔" اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ چہرے پر وہی سنجیدگی تھی۔

"جی کہیں۔" وہ اب مکمل متوجہ تھا۔

"اگر میں یہ سچ آپ کو آج نہ بتاتی تو کچھ دن بعد کہیں نہ کہیں سے ضرور آپ کو معلوم ہو جاتا کہ وسیلہ کو توفیق ماموں نے رضامند کیا، تب آپ کے

دل میں گرہ پڑ گئی تھی کہ شاید مجھے مجبور کیا گیا ہو۔"

"ہوں۔ ہوں۔ تو؟" منصب ابرو جوڑے اب اسے بغور سن رہا تھا۔

"تو۔ وہ۔" وسیلہ نے ابرو سے اس کے ہاتھ کی جانب اشارہ کیا۔ منصب نے کچھ نہ سمجھتے اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا۔ اس کی بند مٹھی میں ایک نیلے رنگ کی مخملی ڈبیا دبی تھی جو اس نے کچھ دیر پہلے جیب سے نکالی تھی۔

"یہ۔ تو۔ انگوٹھی ہے۔" اس نے بند ڈبیا کو دوبارہ جیب میں رکھنے کی کوشش کی لیکن وسیلہ نے اپنا ہاتھ آگے کر کے انگلیاں پھیلائیں۔

"میرے لیے ہے تو پہنا سکتے ہیں۔"

"لیکن۔" منصب ابھی تک تذبذب میں تھا۔

"ماموں کی کوشش بے شک مجھے میرا بھلا سمجھانے کی تھی لیکن میرے ہامی بھرنے کی وجہ یہ نہیں تھی۔" وہ سر جھکائے پہلی مرتبہ تھوڑا سا مسکرائی اور معلوم نہیں آگے کیا کہنا چاہتی تھی۔

"وہ آپ نے فضا گٹ میں جو باتیں کیں، ان سے بہت کچھ کلیئر ہو گیا تھا۔" بالآخر اسے ایک جملہ سوجھ ہی گیا جبکہ منصب نے رک کر غور کیا کہ فضا گٹ میں کیا کیا باتیں ہوئی تھیں۔ ذہن میں کچھ دیر ان باتوں کو دوہرایا اور چہرے پر آسودہ سی مسکراہٹ آ گئی۔

"اس روز تو بہت سی باتیں کلیئر ہوئی تھیں۔ بڑی الجھن کیا تھی؟" وہ اب شرارتی انداز میں سوال کر رہا تھا۔

"ساری باتیں۔" وہ بات کو گول مول کرتے دوسری جانب پلٹ گئی۔

"بدگمانی نرا بندے کے دماغ کا فتور ہوتا ہے۔" وہ تدبر سے سمجھانے لگا۔

"جی نہیں، میں بدگمان نہیں ہوتی۔"

"لو جی، ابھی تو بدگمانی نہیں تھی۔" اس نے آہ بھر کر چھت کو دیکھا۔ "ہمارا پورا رشتہ داؤ پہ لگا ہوا تھا لڑکی۔" اس نے وسیلہ کا کان مروڑ کر یاد دلایا اور وہ ہنسے چلی گئی۔

"بس اب آپ جائیں۔"

"ایک بار پھر بہت معذرت وسیلہ۔ وہ کڑا وقت جو تم نے بہت قریب سے دیکھا، اگرچہ اب گزر چکا ہے لیکن اس کی یادیں شاید زندگی بھر مجھے بے چین رکھیں گی۔"

"منصب، آپ یہ سوری والی بات آئندہ بھی نہیں کریں گے۔" وہ جو اسے بغور سن رہی تھی۔ پورے استحکام سے کہنا شروع کیا "کیونکہ مجھے اس کڑے وقت سے نکالنے والے بھی آپ تھے۔ بجلی کا تار میرے پیروں سے شاید پانچ قدم کی دوری پر تھا جب میمونہ نے حویلی کے بڑے پھاٹک پر دستک دی، اگر وہ اس وقت وہاں نہ پہنچتی تو میں آج زندہ ہی نہ ہوتی، اب تو شہناز چچی اپنے منصوبے خود اپنے منہ سے قبول کر رہی ہیں۔ آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اگر آپ نے راشد بھائی کے ذمہ میری چھان بین کا کام نہ لگایا ہوتا تو نہ ارحم کی چترال سے واپسی کا پتا چلتا نہ آپ میمونہ آپی کو بھیجتے۔"

"یہ سب اللہ کی طرف سے ہوا، میں کون ہوں کوئی پلان کرنے والا۔"

"ہوں۔ تو اب میں کہہ رہی ہوں کہ جو کچھ میرے ساتھ ہوا۔ وہ میرے نصیب کا لکھا تھا۔ اس لیے آپ بھی یہ بات نہیں کریں گے۔"

"بہتر جناب!" اس مرتبہ منصب بھی مسکرا دیا۔ ماتھے تک ہاتھ لے جاتے شرارت سے اسے سیلوٹ کیا اور کمرے سے نکل گیا۔

☆☆☆

"میم۔ وہ۔ عیسیٰ صاحب آئے ہیں۔" نواز نے پردہ سرکا کر کچھ جھجک بھرے انداز میں اطلاع دی۔ تانیہ سمجھ رہی تھی اس کی پریشانی کی وجہ کیا ہے۔ لیکن اس نے بنا کوئی تاثر دیے سر کو اثبات میں ہلایا۔

"آنے دیں۔" اور نواز واپس پلٹ گیا۔ دھڑکنیں تو تانیہ کی بھی بے ترتیب ہوئیں لیکن اس

pklibrary.com

بے چہرے کو سپاٹ رکھنے کی کوشش کی۔ کسی کی آمد کی توقع ویسے وہ خود بھی کر رہی تھی۔ جب سے وہ لوگ مینگورہ واپس آئے تھے۔ عیسیٰ کی امی اور بہنیں دو مرتبہ ان کے ہاں آچکی تھیں۔ سلطانہ آنٹی ایک سیدھی سادی سی خاتون تھیں۔ تانیہ نے بجائے شرم جھجک کے خود بھی ان سے بہت سی باتیں کی تھیں۔ اور ان سب کو سن کر تانیہ کو بہت تسلی ہوئی تھی۔ بلکہ امی اور بابا بھی بہت مطمئن دکھائی دیتے تھے۔

"آہم م م۔" عیسیٰ نے اس کی توجہ کھنکار کر اپنی جانب مبذول کی تو تانیہ اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"ارے بیٹھو۔" عیسیٰ اس کے اٹھ کھڑا ہونے سے گھبرا سا گیا۔ جبکہ تانیہ مسکرا دی۔

"پیشنٹ بن کر آئے ہیں کیا؟"

"نہیں تو۔" اس نے سمجھ نہ آنے والے انداز میں ابرو جوڑے۔

"تو پھر ایک مشرقی لڑکی کو اپنا فرض نبھا لینے دیں۔" وہ معنی خیزی سے مسکرائی تو عیسیٰ بھی مسکرا دیا۔

"رشتہ دوبارہ استوار کرنے پر بہت شکریہ۔" آج کی آمد پچھلی کئی ملاقاتوں کی نسبت کافی اعتماد لیے ہوئے تھی اس کی انکل سرفراز اور آنٹی سے بھی بات ہوئی تھی۔ تانیہ سے البتہ میاندم میں پارک والی ملاقات کے بعد آج ملنا ہو رہا تھا۔

"چلو شکر ہے، یہ تو ایک اضافی خوبی نکل آئی، ورنہ میں بے ادب بیوی کے ساتھ بھی گزارا کرنے کو تیار تھا۔" وہ مسکراتے ہوئے سامنے بیٹھ گیا۔

"آپ کی شرائط بھی ویسے باادب بیوی سے خاص لگا نہیں کھاتی تھیں۔" اس نے بڑی لطافت سے یاد دلایا۔

"او۔۔وہ۔" عیسیٰ بری طرح جھینپ گیا۔ یہ شروع شروع کے دنوں کی بات تھی جب اس نے تانیہ کو آئیڈیل بیوی کے خواص بتائے تھے۔ "انتخاب بھی تو تمہارا کیا تھا پھر۔" اس نے حساب برابر کرنے کی کوشش کی اور تانیہ کی ہنسی نہیں روک پائی۔

"میں نے تو سوچنے کے لیے کافی طویل وقت دیا تھا۔" وہ بھی مسکرا کر جدائی کا وقت یاد دلانے لگی۔

"اور یہ بیچ کا وقت بہت اہم ہوا کرتا ہے۔" عیسیٰ کی خوب صورت گہری آنکھیں بڑی توجہ سے تانیہ کے چہرے پر جمی تھیں "اچھا وقت بھی سہانے خواب جیسا ہوتا ہے۔ آنکھیں تو صحیح معنوں میں کڑے وقت پر ہی کھلتی ہیں۔"

"جی یہ سچ ہے۔ لیکن میری دعا ہے اللہ ہم سب کو کڑے وقتوں سے بچائے۔" اس نے ایک آہ بھری "دیکھا جائے تو اس جہان کی زندگی ہی ایک سہانا خواب ہے، اصل آنکھ تو اُس دنیا میں ہی کھلتی ہے نا۔"

"کاش یہ بات صہیب کی سمجھ میں بھی آجاتی، اس کا حد درجہ حساس ہونا ہی اس کی پرابلم تھا۔" عیسیٰ کی سرد آہ بھی بڑی بے اختیار تھی۔ تانیہ لب بھینچے خاموش ہی رہی۔ دل میں یونہی ایک خیال سا آیا کہ اب تو زندگی بھر کا ساتھ ہونے والا ہے، کیا صہیب کا ذکر ان کے بیچ ہمیشہ ایسی تکلیف دہ خاموشی بن جایا کرے گا۔

"آپ نے وہ وقت دیکھا نہیں ہے تانیہ، جب پہلے صہیب کی موت، پھر اس کے بعد ہماری بدگمانی، نفرت، انتقام لینے کی کوشش۔ لیکن محض تین چار دنوں کے اندر ہی ڈرائیور کی زبانی حقیقت کا پتا چلنا اور اس کے نتیجے میں آپ کے خلاف پیدا ہونے والے جذبات کا یک لخت پشیمانی اور ازالے میں ڈھلنا، ہم نے اپنی ذات پر جھیلا ہے، اس روز اگرچہ وہ خودکشی کرنے کی نیت سے نہیں نکلا تھا لیکن جتنا وہ جذباتی تھا، ہمارا اس کے متعلق ایسا سوچنا بہت آسان ثابت ہوا۔ اور اسی وجہ سے ایک طویل عرصہ کے لیے ہمارے معاملات التوا اور کرائسس کا شکار ہو گئے۔ کچھ قصور میری جلد بازی کا بھی ہے۔ لیکن اب میں تحمل اور برداشت کا سبق سیکھ رہا ہوں۔"

"جی یہ صحیح ہے۔" تانیہ نے تائید میں سر ہلایا

"فوری طور پر آنے والی تکلیف ہی تو صحیح معنوں میں انسان کی ہمت کا امتحان ہوتی ہے۔ کوئی بھی اچھا برا واقعہ چاہے جتنی شدید نوعیت کا کیوں نہ ہو، اپنا اثر وقت کے ساتھ کم کرتے بالآخر مکمل کھو دیتا ہے۔ نہ کسی چیز کو بقا ہے نہ کسی اثر کو۔

پریشے کی شادی، اس کی جدائی کا دکھ بھی ایک عارضی تکلیف ثابت ہوتا، کاش کہ صہیب بھی چند دن اپنا صبر آزما کر دیکھ لیتا۔"

"اچھا ویسے، صبر برداشت کی پریکٹس میں کہیں کہیں خوشی کے پڑاؤ بھی آجایا کرتے ہیں۔ جسے اللہ کی طرف سے انعام سمجھا جاتا ہے۔" عیسیٰ نے معنی خیزی سے اضافہ کیا تو بات فوراً ہی تانیہ کی سمجھ میں آگئی۔

"اور ویٹ کیا طے کی ہے اس خوشی کے پڑاؤ کی؟" اس نے بھی فوراً ہی لطافت سے پوچھ لیا جس پر عیسیٰ نے زبردست قہقہہ لگایا۔

"بس چند ماہ۔ اور اس کی وجہ بھی میں بتاؤں گا۔" اس نے فی الفور بتایا تو تانیہ نے مسکرا کر سر جھکا لیا۔

☆☆☆

آج تو تھکاوٹ نے برا حال کر دیا تھا۔ دو کولیگ چھٹی پر گئے ہوئے تھے۔ مومن کو ان کے کام بھی نمٹانا پڑ گئے تھے۔ گھر واپسی بھی شام کے قریب ہوئی۔ وقت چونکہ کھانے کا تھا تو وہ وہیں ابو کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ کھانا ایک ساتھ کھا لینے کے بعد بھی وہ دیر تک حال احوال کرتا رہا۔ پھر یہ سوچ کر پھوپھو کی طرف چلا گیا کہ اگر مزید دیر کی تو وہ سب کہیں سو نہ جائیں۔ اُن سے روزانہ کی ملاقات بھی روٹین کا حصہ تھی۔

"تم آؤ گی؟" اس نے جاتے جاتے رُک کر ایلیا کو دیکھا جو کچن کے دروازے میں کھڑی تھی۔

"جی۔ وہ بچے کمرے میں اکیلے ہیں۔ میں ان کے پاس جا رہی ہوں۔"

"ہاں صحیح۔ میں پھر کچھ دیر پھوپھو وغیرہ کے ساتھ بیٹھ آتا ہوں۔" وہ ادھر ہی چلا گیا۔ ایلیا نے اس کی پشت کو دیکھتے شرارت سے اپنی ہنسی لبوں میں دبائی۔ آج تو مراد ہی بر آئی تھی۔ سب کچھ اس کی مرضی کے مطابق ہو رہا تھا۔ وہ جلدی سے اپنے کمرے میں آئی۔ بچے چھوٹے کمرے میں سوئے ہوئے تھے۔ اس نے بڑے کمرے کی لائٹ جلائی اور الماری سے کچھ سامان نکالا۔ بیڈ کے داہنے طرف کونے میں چھوٹا صوفہ اور گلاس ٹیبل تھی۔ اس نے میز سے چیزیں ہٹا کر دو، تین کینڈل اسٹینڈ رکھ دیے۔ جلانے کا ارادہ بعد میں کرتے اپنا جامنی پیازی ڈریس نکال لیا۔ واپس آکر جلدی سے بال بنائے، میک اپ کیا اور ہلکی سی جیولری پہن لی۔ کوشش یہی تھی کہ اس رات جیسی ہی لگے جب۔۔۔

موبائل کی بیل نے متوجہ کیا تو وہ جلدی سے بیڈ کے نزدیک آئی۔ کال رمشہ کی طرف سے تھی۔ ایلیا نے مسکراتے ہوئے کال اٹینڈ کی۔

"جی۔"

"ہو گئے سارے کام؟" رمشہ کی آواز ہلکی سرگوشی جیسی تھی۔

"ہاں۔ یہاں سب تیار ہے۔"

"بس ٹھیک ہے۔۔ پھر میں ان کی محفل بھی برخاست کرنے کا کچھ سوچتی ہوں۔"

"سب جاگ رہے ہیں؟"

"نہیں خواتین سب ہی اپنے کمروں میں ہیں۔ مومن بھائی، باہر لاؤنج میں منصب کے ساتھ بیٹھے ہیں۔ میں منصب کو کسی بہانے وہاں سے اٹھالی ہوں تو یہ بھی یقیناً اٹھ جائیں گے۔"

"اوکے، اوکے۔ میں ان کا ویٹ کر رہی ہوں۔" ایلیا کا بلاوجہ ہی دل دھڑکنے لگا۔ کال آف کر کے جلدی سے کینڈلز جلائیں، اور ایک خیال آنے پر کمرے کی لائٹ آف کر دی۔ جلتی کینڈلز کی خوبصورتی میں ایک دم ہی اضافہ ہوا۔ کمرے کا ماحول سنہری سا لگنے لگا۔

"واؤ۔" وہ موبائل میز پہ رکھ کر دونوں مٹھیاں

آپس میں بھیجے اپنے تخلیق کردہ ماحول سے آپ ہی مسرور ہو رہی تھی، جب پیچھے دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ ایلیا کے تو قدم ہی جیسے اپنی جگہ پر جم گئے۔ پلٹ کر دیکھنا محال تھا۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں میچ لیں۔ دونوں لب مخالت سے دانتوں میں دبا لیے۔ پتا نہیں مومن کا ری ایکشن کیسا ہوگا۔ وہ آنکھیں بند کیے کچھ دیر کھڑی ہی رہی۔ مومن اندر آ چکے تھے لیکن کچھ بول نہیں رہے تھے۔ وہ اپنی جگہ پر تھمی کھڑی تھی جب مومن نے اپنے ہاتھ اس کے دونوں شانوں پر رکھے۔

"سرپرائز۔ ہوں؟"

"آپ کو تو کچھ یاد بھی نہیں ہوگا۔" وہ ہلکا سا خفا ہوئی۔

"تم ہو نا یاد رکھنے کے لیے۔" مومن نے کندھوں سے نیچے لے جاتے اپنے دونوں ہاتھ اس کے دونوں ہاتھوں میں دیے۔

"کیسا لگ رہا ہے۔ ایک سال بعد؟" ایلیا مسکراتے ہوئے اس کی جانب پلٹی۔

"پچھلے سال کی اس رات کو یاد کر رہا ہوں۔" مومن کے موڈ اور لہجے میں ایکدم ہی بشاشت آ گئی تھی۔ ایلیا کے سرپرائز نے ساری تھکن پل میں اتار دی تھی۔ اسے واقعی یاد نہیں تھا کہ آج ان کی شادی کی سالگرہ ہے۔ لیکن ایلیا نے بہت خوب صورت انداز میں یاد دلایا تھا۔ کمرے میں آتے اس کی پہلی نظر جلتی کینڈلز پر پڑی تو وہ صرف متعجب ہوا تھا۔ لیکن کینڈل کے ساتھ کیک اور چھری نے سوچنے پر مجبور کیا۔ سالگرہ تو نہ اس کی تھی نہ ایلیا کی۔ بچوں کی بھی کچھ ماہ پہلے گزری تھی۔ پھر کمرے کا ماحول۔ اور خود ایلیا کی تیاری سے بس چند سیکنڈز لگے سمجھنے میں کہ آج ان کی شادی کی پہلی سالگرہ تھی۔ ایلیا نے سیکنڈ ٹائم رمشہ کے ساتھ جا کر کچھ چیزیں خریدی تھیں۔ اس نے گھر میں صرف رمشہ کو اپنا رازدار بنایا تھا اور اس کی بھی ایک خاص وجہ تھی

"تو۔ کیا یاد آیا؟" وہ دلچسپی سے پوچھنے لگی۔

"گردن تک اونچا کپڑوں کا ایک ڈھیر بانہوں میں سمیٹے بھاگتی ہوئی چڑیل۔" مومن نے ہلکا سا آگے جھک کر شرارت سے یاد دلایا تو ایلیا نے بے ساختہ ماتھے پہ ہاتھ مارا۔

"اللہ، آپ کی یادداشت تو غضب ہے۔ میں سوچ رہی تھی۔ کم از کم یہ بات تو بالکل یاد نہ ہو۔"

"ارے واہ۔ کیوں یاد نہ ہو۔ اور۔" وہ تھوڑا پیچھے کو ہو کر سر سے پیر تک ایلیا کو دیکھنے لگا۔ "یہ ڈریس بھی وہی ہے نا؟"

"جی۔ بالکل۔ تب تو آپ نے اس ڈریس والی کو غصے سے گھورا ہوگا۔ اس لیے آج دوبارہ پہن لیا۔"

"تاکہ پیار سے دیکھوں؟" اس نے جملہ جوڑا، وہ جھینپ کر ٹیبل کی طرف بڑھ گئی۔ "کیک کاٹ لیں۔"

"یار سرپرائز دینا ضروری تھا کیا۔ صبح تو کم از کم بتاتیں۔ میں بھی تمہارے لیے کچھ لے آتا۔ بلکہ شام کو سب مل کر مناتے۔"

"اونہوں۔" ایلیا نے سنجیدگی سے ٹوکا "یہاں آپ کچھ بھول رہے ہیں۔"

"مطلب؟" مومن نے ابرو جوڑے۔

"جناب، پچھلے سال اس دن دو شادیاں ہوئی تھیں۔ میں نہیں چاہتی تھی، سب کو انوالو کر کے میں وسیلہ آپی کا دل دکھاؤں۔"

"او۔" مومن نے سر ہلایا "ہاں سوری۔ یہ بات بالکل دھیان میں نہیں تھی۔ وسیلہ کے لیے اس دن کی یادیں بہت تلخ رہی ہیں۔ خیر، یہ تو تم نے اچھا کیا۔ لیکن مجھے تو یاد دلا دیتیں۔"

"کوئی بات نہیں، مجھے اگلے دن بھی تحفہ لینے میں کوئی اعتراض نہیں۔" اس نے لطافت سے جتایا کہ تحفہ تو وہ لے گی۔ مومن بھی ہنس دیا۔ دونوں نے مل کر کیک کاٹا۔ اور ایلیا نے مومن کو گھڑی کا گفٹ دیا۔

"واؤ۔ یہ تو عین میری پسند کے مطابق ہے۔

میں بھی لیدر کی گھڑی لینے کا سوچ رہا تھا۔ فل اسٹیل واچ کافی ہیوی ہو جاتی ہے۔ وہ پہن کر دیکھنے لگا۔

"سچی بہت لائٹ فیلنگز آ رہی ہیں۔" اس نے اپنی بھاری گھڑی اتار دی تھی۔ براؤن لیدر بینڈ والی گھڑی خوبصورت بھی بہت لگ رہی تھی

"اچھا ویسے مجھے ہیوی فیلنگ والے تحفے پسند ہیں۔" اس نے خالی کلائی پر فرضی کنگن کھنکا کر اشارہ دیا، مومن اس کی حاضر جوابی پر پہلے تو بے ساختہ ہنسا لیکن پھر بٹوہ کھول کر پانچ پانچ کے دو بڑے نوٹ نکالے۔

"زیادہ پھیلنے کی ضرورت نہیں ہے، یہ تم ابھی لو اپنا کیش گفٹ اور پھر چاہے اس سے ایئرنگز خرید لو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

"یہ شوہر لوگ زیادہ ہی کنجوس ہوتے ہیں۔" اس نے رقم بھی لے لی اور منہ بھی خوب بنایا۔

"اچھا گفٹ اگلے سال کے لیے ادھار رہا۔ پرامس۔" اس نے پیار بھری مسکراہٹ سے ٹالنے کی کوشش کی۔

"واہ۔ جیسے اگلے سال تو بڑا یاد رہے گا یہ دن۔ لکھ لیں۔ مجھے ہی ساری زندگی آپ کو یاد دلانا پڑے گا۔" اس نے منہ پھلایا۔

"ہوں۔ اور میری دعا ہے اللہ پاک نے اس "ساری زندگی" میں ہمارے لیے ڈھیروں ڈھیر سال لکھے ہوں۔ اتنے کہ ایک دن تم مجھے چھڑی اور میں تمہیں بتیسی گفٹ کر رہا ہوں گا۔" وہ اچھے موڈ میں محبت سے ایلیا کو دیکھتے ان آنے والے سالوں کو سوچ رہا تھا جب سچ مچ وہ ایک بوڑھی ایلیا ہوگی۔ ایلیا نے اس کی مسکراہٹ کو غور سے دیکھا۔

"تنگ نہیں آئیں گے؟"

"میں تنگ نہیں آتا۔ جن سے محبت ہو انہیں عادت جیسا اپنا لیتا ہوں۔ اور عادتیں تو چاہ کر بھی ترک کرنا مشکل ہو جاتی ہیں۔ ہے نا؟" وہ اسے بہت توجہ سے دیکھتے تائید چاہ رہا تھا۔ ایلیا نے مسکرا کر سر ہلایا۔

"اچھا آپ یہ میٹھا کھائیں۔ میں ذرا چینج کر لوں۔" وہ اٹھنے لگی لیکن مومن نے ہاتھ تھام کر روک لیا۔

"نہیں۔ ایسے نہیں۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا "ابھی کچھ انٹرسٹنگ کرنا ہے۔"

"کیا؟" وہ ناسمجھی سے دیکھنے لگی۔

"اس رات کی یاد تازہ کرتے ہیں۔" وہ کچھ سوچ کر مسکرا رہا تھا۔

☆☆☆

ایلیا اور مومن کی اینورسری سے کچھ ڈیڑھ ماہ بعد کی بات تھی جب پہلے رمشہ اور راشد شادی کے خوبصورت رشتے میں بندھے اور اس کے ایک ہفتے بعد منصب اور وسیلہ کی شادی انجام پائی۔ رمشہ اور راشد بھی شادی میں شریک تھے۔ وہ بھی میمونہ کی طرح تھانیہ بیاہ کر گئی تھی۔ اور میمونہ اس وجہ سے بہت خوش بھی تھی۔ رضوانہ نے منصب کو گورنمنٹ کی رہائش نہیں لینے دی۔ انہیں اور دادی کو اپنے اکیلے گھر میں وسیلہ اور منصب دونوں کی ضرورت تھی تب ہی منصب کے کمرے کو سجایا گیا۔

ڈاکٹر تانیہ بھی اپنی والدہ کے ساتھ شادی میں شریک تھی۔ اس کی اور عیسیٰ کی شادی چند ماہ بعد طے پائی تھی۔ رمشہ اور ایلیا نے دلہن بنی وسیلہ کو اس کے کمرے میں پہنچایا۔ وسیلہ نے اورنج اور میرون رنگ کا لہنگا پہنا تھا۔ فنکشن چونکہ ہال میں رکھا گیا تھا تو اختتام پر صرف گھر والے ہی دلہن کو لے کر آئے۔ گھر میں میمونہ اور رمشہ مہمان تھیں، انیس، راشد اور مومن نے بڑی شرافت سے دولہا کو بھی وقت پر اس کے کمرے میں بھیج دیا۔

وہ جس وقت کمرے میں داخل ہوا، سجی سنوری وسیلہ بلاوجہ ہی دوپٹہ درست کرنے لگی۔

منصب کو البتہ اسے نروس دیکھ کر خاصی تقویت ملی، کیونکہ اندر سے وہ بھی اچھا خاصا گھبرایا ہوا تھا۔ گھڑی، بٹوہ، اور جیب کا دیگر سامان ٹیبل پر رکھتے اس نے ذہن پر بہت زور دیا۔ پچھلی رات تک بھی

pklibrary.com

اچھے خاصے ڈائیلاگز یاد تھے۔ اُف کہاں اُڑ گئیں بار بار کی دوہرائی باتیں۔ منصب بیڈ کے نزدیک آ کر کنارے پر بیٹھا۔

"ارے یار۔ تم اتنی خوب صورت لگ رہی ہو۔ میرا دماغ بھی کام کرنا چھوڑ گیا ہے۔" اس نے انتہائی بے بسی سے اعتراف کیا تو وسیلہ نے ہنس کر منہ گھٹنوں میں دے دیا۔

"مجھے بالکل آئیڈیا نہیں کہ کس طرح بات شروع کرتے ہیں، اور جو سوچا تھا وہ صفاچٹ ہو گیا۔" وہ بتاتا جا رہا تھا اور وسیلہ کا ہنسی دباتے چہرا سرخ ہو گیا۔

"اچھا بس، کوئی بات نہیں۔" اس نے اپنی ہنسی بمشکل روکی، مسکراتے ہوئے اب وہ اپنے سجے سنورے ہاتھوں پہ نظریں جمائے بیٹھی تھی۔

"اِدھر بھی دیکھ لو۔ تھوڑی بہت محنت تو دلہا بے چارا بھی خود پہ کرتا ہے۔" وسیلہ نے کہنا ماننے کی کوشش کرتے آہستہ آہستہ نظریں اوپر اٹھائیں، نظر بمشکل ہی منصب کے چہرے پر ڈالی اور ہنس کر رخ پھیر لیا۔

"ہنسا ایسے رہی ہو جیسے جوکر دیکھ لیا ہو۔" منصب نے مصنوعی دکھ سے آہ بھرتے جیب سے گفٹ نکالا۔

"یار! یہ گفٹ کا بھی عجیب ہے۔ لڑکے بے چارے اسکول کے زمانے سے سوچنا شروع کر دیتے ہیں کہ پہلی رات تحفہ کیا دیں گے۔۔۔ اور آخر میں اماں ایک انگوٹھی پکڑا دیتی ہیں کہ جاؤ بیٹا دلہن کو دے دینا۔"

وہ سنجیدگی سے صفائی دے رہا تھا۔ وسیلہ کی ہنسی چھوٹ گئی۔ منصب کی بونگیوں نے ماحول کی ساری سنجیدگی ختم کر دی تھی۔ وسیلہ نے ڈبیا کھلنے پر خود ہی ہاتھ آگے کر دیا، چہرا البتہ دوسری جانب ہی تھا جب اچانک ہی پیروں کو کچھ چھوا تو اس نے چونک کر سر گھمایا۔ منصب اپنی جگہ سے اٹھ کر تھوڑا پیچھے ہو بیٹھا تھا اور ایک بہت نفیس گولڈن پازیب وہ اس کے پاؤں میں پہنا رہا تھا۔ ہلکی مسکراہٹ لیے آنکھیں اوپر اٹھا کر معنی خیزی سے وسیلہ کو دیکھا تو اس نے شرما کر سر جھکا لیا۔

"اماں کو نہیں پتا کہ اپنی خاص ہستی کے لیے خاص تحفہ ان کا محنتی بچہ پہلے ہی خرید چکا ہے۔"

"تو وہ انگوٹھی؟" وسیلہ نے ہلکا سا ابرو اٹھا کر استفسار کیا۔

"ہاں۔ اب لگی ہو نا ایک دم روایتی بیوی۔" منصب نے بے ساختہ انگلی لہرائی جبکہ وسیلہ نے شرم ترک کرتے ہتھیلی آگے پھیلا دی۔

"لائیں میری ساسو ماں والا گفٹ۔"

"یہ لیں زوجہ محترمہ، میں وردی کے ساتھ گولڈ رنگ پہننا اچھا بھی نہیں لگوں گا۔" اس نے دوسری جیب سے چھوٹی ڈبیا نکال کر اس کی ہتھیلی پر دھر دی۔

"شکریہ۔ گفٹ بہت خوب صورت ہے۔"

"دیکھ تو لو۔" منصب نے اس کی بند مٹھی کی طرف اشارہ کیا، لیکن وسیلہ نے مسکرا کر ابرو اپنے پاؤں کی جانب اٹھایا، پیر کو حرکت دے کر پازیب کو ہلکا سا چھنکایا تو منصب کے ہونٹ مسکرا اٹھے، وہ پازیب کی بات کر رہی تھی۔

"بڑی نوازش جناب۔ تعریف اور پسندیدگی تحفے کی خوب صورتی کو کچھ اور بڑھا دیتی ہے۔ اور تحفہ دینے والے کا حوصلہ بھی۔" منصب نے مسکرا کر کہتے وسیلہ کا مہندی والا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا خوشی کی نمی وسیلہ کی پلکوں پر ستاروں کی طرح چمک اٹھی۔

تہہ خانے کی قید بے بسی میں اپنے پروردگار سے مانگی گئی اس کی تمام دعائیں پوری ہوئی تھیں۔ اللہ نے منصب کی صورت اسے ایک بہترین انعام سے نوازا تھا۔

☆☆

pklibrary.com

نظم

یاد ہے رستم و سہراب ہوا کرتے تھے
عشق اور جنگ کے آداب ہوا کرتے تھے

یاد ہے لوگ قناعت کی قبا اوڑھے ہوئے
زرد موسم میں بھی شاداب ہوا کرتے تھے

یاد ہے خستہ مکانوں میں فرشتوں جیسے
لوگ وہ گوہرِ نایاب ہوا کرتے تھے

یاد ہے طرزِ تخاطب میں بزرگوں کے لیے
قبلہ و کعبہ کے القاب ہوا کرتے تھے

کاش دُنیا میں محبت کے سوا کچھ بھی نہ ہو
یاد ہے آنکھ میں کیا خواب ہوا کرتے تھے

سو گئے اوڑھ کے مٹی کے لبادے وہ بھی
جو کبھی حسن کے مہتاب ہوا کرتے تھے

فاتحہ پڑھ کے مبارکؔ میں بہت رویا آج
آہ کیا پھول سے احباب ہوا کرتے تھے

مبارک صدیقی

ہوا تھمی تھی ضرور لیکن
وہ شام بھی جیسے سسک رہی تھی
کہ زرد پتوں کو آندھیوں نے
عجیب قصہ سنا دیا تھا
کہ جس کو سن کر تمام پتے
سسک رہے تھے
بلک رہے تھے
جانے کس سانحے کے غم میں
شجر جڑوں سے اکھڑ چکے تھے
بہت تلاشا تھا ہم نے تم کو
ہر ایک رستہ
ہر ایک وادی
ہر ایک پربت
ہر ایک گھاٹی
مگر
کہیں سے تیری خبر نہ آئی
تو یہ کہہ کر ہم نے دل کو ٹالا
ہوا تھمے گی تو دیکھ لیں گے
ہم اس کے رستوں کو ڈھونڈ لیں گے
مگر ہماری یہ خوش خیالی
جو ہم کو برباد کر گئی تھی
ہوا تھمی تھی ضرور لیکن
بڑی ہی مدت گزر چکی تھی
ہمارے بالوں کے جنگلوں میں
سفید چاندی اُتر چکی تھی
فلک پہ تارے نہیں رہے تھے
گلاب پیارے نہیں رہے تھے
وہ جن سے بستی تھی دل کی بستی
وہ یار سارے نہیں رہے تھے
مگر یہ المیہ سب سے بالاتر تھا
کہ ہم تمہارے نہیں رہے تھے
ہوا تھمی تھی ضرور لیکن
بڑی ہی مدت گزر چکی تھی

امجد اسلام امجد

pklibrary.com

آسماں پہ جو اب ستارے ہیں
میری یادوں کے یہ سہارے ہیں
تیرے بن دیکھتی بھی کیا آنکھیں
تیرے ہونے سے سب نظارے ہیں
لوٹ بھی آؤ جانے والے تم
ہم دل و جاں سے پکارے ہیں
تیرے بن زندگی گزرتی کیا
بن ترے دن فقط گزارے ہیں
روزِ اوّل سے ہم تمہارے تھے
روزِ اوّل سے ہم تمہارے ہیں
آؤ پھر سے سنوار دوں تم کو
تم نے کچھ دن کہیں گزارے ہیں
نہ سمجھ پایا وہ ظریف احسن
وہ جو اشعار میں اشارے ہیں

ظریف احسن

پھر وہی شباہت ہے

غم بھی اک امانت ہے
درد زدہ شب کی وحشت میں
ہجر کی علامت ہے
خامشی سے تکتے ہیں
آتے جاتے لمحوں کو
رُت بدل بھی جاتی ہے
درد کم نہیں ہوتا
شور کرنے لگتا ہے
بام و در کا سناٹا
شام کی اُداسی میں
پہلا زخم بھرنے تک
عکس خواب سے آگے
آئینوں کی حیرت ہے
پھر وہی شباہت ہے

خالد معین

اس ماہ کی سٹ ہٹ مسکراہٹیں

موبائل اور پٹائی

بیگم نے موبائل مانگا، شوہر نے کانپتے ہاتھوں سے موبائل دے دیا۔ ساری چھان بین کی جب کچھ نہ ملا تو تمام نمبر دیکھے۔ ایک نیا نمبر ملا۔ اختر کے نام سے سیو تھا۔ فوراً پوچھا یہ کس کا نمبر ہے۔ شوہر بے چارا کانپتے ہوئے بولا۔

"ماموں اختر کا نمبر ہے۔"

بیوی بولی۔ "پہلے تو یہ نمبر نہیں تھا۔"

شوہر بولا۔ "انہوں نے اب موبائل لیا ہے اس لیے اب نمبر سیو کیا ہے۔"

بیوی کو یقین نہیں ہوا۔ اس نے فوراً اس نمبر پر کال ملائی کال اٹینڈ ہوتے ہی کسی عورت کی آواز آئی۔

"ہیلو"

بیوی نے کال کاٹ کر بے چارے شوہر کو پکڑا جو چیز ہاتھ میں آئی، بیلن، ڈنڈے، کرسیاں، برتن سب میاں پر برسا دیے۔ زخمی شوہر جب ہاسپٹل میں پہنچا تو پتا چلا کہ ماموں اختر بھی زخمی ہو کر پہنچے ہوئے ہیں۔ ان سے معلوم کیا۔

"ماموں جان! آپ کو کیا ہوا؟"

ماموں جان فوراً بولے۔ "تمہاری کال سے ایک عورت کے ہیلو کی آواز آئی۔ بس کال کٹی۔ پھر یہی کچھ ہوا۔ جو آپ کے ساتھ ہوا۔"

لاجواب

برطانیہ کا ایک مشہور سیاست دان انتخابی مہم کے سلسلے میں ایک اجتماع میں تقریر کرنے کھڑا ہوا تو مجمع میں سے ایک آواز آئی۔ "اسے دیکھو! وہ تقریر کرنے لگا ہے جس کا باپ گدھا گاڑی چلایا کرتا تھا۔" سیاست دان نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ "یہ صاحب ٹھیک کہتے ہیں لیکن میرا باپ اور اس کی گاڑی آج موجود نہیں، تاہم گدھا ابھی تک ہمارے سامنے ہے۔"

جاہل

ایک پروفیسر ایک بار بس میں سفر کر رہے تھے سفر کے دوران کچھ کاغذات پڑھنا چاہتے تھے۔ جیب میں ہاتھ ڈالا تو معلوم ہوا اپنی عینک وہ گھر بھول آئے ہیں۔ انہوں نے ساتھ بیٹھے مسافر سے درخواست کرتے ہوئے کہا۔

"پلیز آپ یہ کاغذات مجھے پڑھ کر سنا سکتے ہیں؟"

"معاف کیجیے گا جناب! میں بھی آپ کی طرح جاہل ہوں۔"

فیس

ایک صاحب بہت کنجوس تھے ایک دن ان کے دانت میں تکلیف ہوئی۔ دانتوں کے ڈاکٹر کے پاس پہنچے، ڈاکٹر نے معائنے کے بعد کہا۔ "یہ دانت نکالنا ہی پڑے گا۔"

"کیا فیس ہوگی؟" ان صاحب نے دریافت کیا۔

"دو سو روپے" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

"یہ لیجیے پچاس روپے اسے تھوڑا ڈھیلا کر دیجیے، نکال میں خود لوں گا۔"

ورزش

ایک شادی شدہ فلمی ہیروئن اپنی اکلوتی فلم کی کامیابی کے لیے نماز پڑھ رہی تھی۔ اداکارہ کے پانچ سالہ بچے نے ماں کو پہلی مرتبہ نماز پڑھتے دیکھا تو گھبرا کر باپ کے پاس گیا اور بولا۔

"ڈیڈی! آئیں ذرا دیکھیں ماما نئی ورزش کر رہی ہیں۔"

خرابی

دو مکینک گاڑیوں کے بارے میں تبادلہ خیال کر رہے تھے۔ ایک بولا۔

"تمہیں گاڑیوں کی سیٹوں پر چمڑے کے کور اچھے لگتے ہیں یا کپڑے کے؟"

"کپڑے کے" دوسرے مکینک نے جواب دیا۔

"چمڑے کے کور پر اچھی طرح ہاتھ صاف نہیں ہوتے۔"

حاضر جوابی

ایک ان پڑھ ایم پی اے کو وزیر صحت بنا دیا گیا۔ وزیر بنتے ہی اس نے میڈیا کے ساتھ سرکاری اسپتال پر چھاپہ مارا۔ وارڈ میں دو مریضوں کو آکسیجن لگی ہوئی تھی جبکہ تیسرے مریض کو نہیں لگی تھی۔ وزیر صحت نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

"دو مریضوں کو سی این جی لگی ہوئی ہے، تیسرے کو کیوں نہیں لگائی؟"

ڈاکٹر نے سر سے پاؤں تک وزیر کو دیکھا اور پھر ڈرپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"سر! یہ مریض پٹرول پر چل رہا ہے۔"

ذہانت

ایک شخص کا بڑا چرچا تھا کہ وہ روحوں سے بات کروا دیتا ہے۔ وہاں ایک بچہ بھی اپنی ذہانت اور ہوشیاری کی وجہ سے مشہور تھا، بچہ اس شخص کے پاس پہنچا اور اس کو نذرانہ دینے کے بعد بولا۔

"میں اپنے دادا کی روح سے بات کرنا چاہتا ہوں۔" وہ شخص اسے ایک نیم اندھیرے کمرے میں لے گیا۔ وہاں موم بتی جل رہی تھی۔ اتنے میں اسے ایک بھاری آواز سنائی دی۔

"کیوں آئے ہو برخوردار؟" اس شخص نے بچے کی طرف دیکھ کر اسے بات کرنے کا اشارہ دیا اور کہا۔

"یہ تمہارے دادا کی روح بول رہی ہے پوچھ لو کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"

بچے نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔ "دادا جان! مجھے صرف یہ پوچھنا ہے کہ آپ کی روح یہاں کیا کر رہی ہے جب کہ آپ کا تو ابھی انتقال ہی نہیں ہوا؟"

لاعلمی

ایک صاحب کے بارے میں مشہور تھا کہ ان کا خط تحریر بڑا شاندار ہے۔ ایک دن ایک ان پڑھ بوڑھا ان کے پاس آیا اور کہنے لگا "وزیراعظم کے نام میری طرف سے خط لکھو اور انہیں میری بری حالت کے بارے میں آگاہ کرو۔"

ان صاحب نے خط لکھ دیا تو بوڑھے نے کہا "ذرا پڑھ کر سنایئے؟"

ان صاحب نے پڑھ کر سنایا تو وہ بوڑھا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ان صاحب نے پوچھا۔ "کیا بات ہے، کیوں رو رہے ہو؟"

بوڑھا کہنے لگا۔ "بیٹا! مجھے خود معلوم نہیں تھا کہ میرے حالات اتنے خراب ہیں۔"

مجبوری

ایک صاحب جو ہجوم سے گھبراتے تھے اور مجمع میں بات کرنا انہیں مشکل لگتا تھا ایک پارٹی نے انہیں اپنا ممبر بنا لیا۔ مجبوراً انہیں اسٹیج پر تقریر کرنا پڑی تو وہ حاضرین سے یوں مخاطب ہوئے۔

"معز...... ز...... خوا...... تین و حضر...... حضرات!" "مم مم میں جب یہاں...... آنے کے لیے نکلا تو...... تو...... جو...... کچھ میں کہنا چاہتا تھا۔ وہ...... وہ...... صرف مجھے یا...... وہ...... میرے خدا کو معلو...... م تھا لیکن...... لیکن وہ اب وہ...... صرف میرے...... خدا کو...... ہی معلوم ہے۔"

ثبوت

"یار رشید! پرسوں کراچی میں کمال نامی جو بزنس مین قتل ہوا ہے اس کے سلسلے میں تم پر شک کیا جا رہا ہے۔ پولیس تمہارے اڈے پر پہنچنے والی ہوگی۔ تمہارے پاس جائے واردات سے اپنی غیر موجودگی کا کوئی ثبوت تو موجود ہے نا؟"

"کیوں نہیں۔ بڑا پکا ثبوت موجود ہے۔" دوسرے نے لاپروائی سے جواب دیا۔ "پرسوں تو میں لاہور کے ایک سیٹھ شریف احمد کو ٹھکانے لگانے کے سلسلے میں لاہور میں تھا۔ میں تو کراچی میں تھا ہی نہیں۔"

☆

شگفتہ جاہ

کسی بات کو بلا تحقیق پھیلانا

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

"اے ایمان والو! اگر کوئی شریر آدمی تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو خوب تحقیق کرلیا کرو، کبھی کسی قوم کو نادانی سے کوئی ضرر نہ پہنچادو پھر اپنے کیے پر پچھتانا پڑے۔"

اللہ تبارک وتعالیٰ حکم فرماتا ہے کہ مکمل تحقیق و تفتیش سے پہلے فاسق کی خبر کا اعتماد نہ کرو، ممکن ہے کہ فاسق شخص نے کوئی جھوٹ بات کہہ دی ہو یا خود اسے غلط فہمی ہوئی ہو، اور تم اس کی خبر کے مطابق کچھ کر گزرو تو تم غلطی کے پیروکار بن جاؤ گے، اور مفسد لوگوں کے اتباع کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے۔ اسی آیت کو دلیل بنا کر بعض محدثین کرام نے اس شخص کی روایت کو بھی غیر معتبر بتلایا ہے۔ جس کے حالات معلوم نہ ہوں، اس لیے کہ ہوسکتا ہے یہ شخص فی الواقع فاسق ہو۔

یہ آیت ولید بن عقبہ بن ابی معیط کے بارے میں نازل ہوئی جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں قبیلہ بنی مصطلق سے زکوۃ لینے کے لیے بھیجا تھا۔

حضرت حارث بن ضرار الخزاعی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ

"میں بارگاہ نبوت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حاضر ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے دعوت اسلام دی جو میں نے قبول کی اور حلقہ بہ گوش اسلام ہوگیا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زکوۃ کی فرضیت کے متعلق بتایا میں نے اس کا بھی اقرار کیا اور کہا کہ میں اپنی قوم کے پاس جاتا ہوں اور مسلمان ہونے والوں سے زکوۃ جمع کرتا ہوں۔ اتنے دن بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرے پاس کسی شخص کو بھیج دیں۔ میں جمع شدہ مال زکوۃ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں ارسال کردوں گا۔"

علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے کوئی قاصد نہ پہنچا تو آپ رضی اللہ عنہ نے سرداران قوم کو جمع کیا اور کہا۔

"یہ تو ناممکن ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وعدہ کے مطابق اپنا کوئی قاصد نہ بھیجیں۔ مجھے ڈر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی وجہ سے ہم پر ناراض نہ ہو گئے ہوں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم خود ہی مال لے کر مدینہ منورہ حاضر ہوں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش کردیں۔"

ادھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کو اپنا قاصد بنا کر بھیجا لیکن یہ راستہ ہی سے ڈر کر واپس ہو گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا کہ حضرت حارث رضی اللہ عنہ نے زکوۃ دینے سے انکار کردیا ہے بلکہ وہ تو میرے قتل کے درپے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ناراض ہوئے اور کچھ صحابہ رضی اللہ عنہم حضرت حارث رضی اللہ عنہ کی تنبیہ کے لیے روانہ کیے۔ مدینہ منورہ کے قریب ہی اس دستے نے حضرت حارث رضی اللہ عنہ کو گھیر لیا۔

حضرت حارث رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ "کیا بات ہے؟ تم کہاں اور کس کے پاس جارہے ہو؟"

وہ کہنے لگے کہ۔ "ہم تو آپ رضی اللہ عنہ کی طرف بھیجے گئے ہیں۔"

پوچھا۔ "کیوں؟"

کہا۔ "اس لیے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قاصد ولید رضی اللہ عنہ کو زکوۃ ادا نہیں کی بلکہ ان کے قتل کے درپے ہوگئے۔"

حضرت حارث رضی اللہ عنہ نے کہا، "قسم ہے اس ذات کی جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو برحق رسول بنا کر بھیجا ہے نہ تو میں نے انہیں دیکھا ہے اور نہ ہی وہ میرے پاس آئے ہیں۔ چلو، میں خود ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہورہا تھا۔"

جب بارگاہ نبوت میں یہ حضرات پہنچے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ

"تم نے زکوٰۃ روک لی اور میرے قاصد کو قتل کرنا چاہا؟"

حضرت حارث رضی اللہ عنہ نے عرض کیا۔

"ہرگز نہیں یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس خدا کی قسم جس نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو رسول بنا کر بھیجا ہے نہ میں نے انہیں دیکھا اور نہ ہی وہ میرے پاس آئے۔ بلکہ جب میں نے یہ دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قاصد نہیں بھیجا تو میں اس ڈر سے کہ کہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ناراض نہ ہوں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔"

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"تحقیق وتلاش اور دور بینی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور جلد بازی شیطان کی طرف سے ہے۔"

(آج کل سوشل میڈیا کے ذریعے جھوٹ بول کر اور جھوٹی خبریں پھیلا کر لوگوں کے جذبات بھڑکائے جاتے ہیں۔ جس سے ملک میں انتشار اور بدامنی پیدا ہوتی ہے۔ بسا اوقات بہت سے لوگوں کی زندگی بھی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ اسی لیے قرآن پاک میں تاکید کی گئی ہے کہ بلا تحقیق کسی بات کو آگے نہ بڑھایا جائے)

ماہ رمضان کے قیام

یعنی نماز تراویح کا بیان

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس نے (اللہ کے وعدوں پر) ایمان رکھتے ہوئے ثواب کی نیت سے رمضان کے روزے رکھے اور رمضان کا قیام کیا، اس کے وہ گناہ معاف کر دیے جائیں گے جو پہلے (سرزد) ہو چکے ہیں۔"

امام یحییٰ نوفل بن حرث بن عبدالمطلب سے بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے شادی کرنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مدد طلب کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عورت سے ان کی شادی کر دی۔ پھر انہوں نے کھانے

کی کوئی چیز تلاش کی لیکن کچھ نہ پایا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو رافع اور ابو ایوب کو اپنا زرہ دے کر بھیجا۔ انہوں نے اس زرہ کو ایک یہودی کے پاس تیس صاع جو میں رہن رکھ دیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے نوفل کو دے دیا۔ نوفل کہتے ہیں کہ ہم اس جو کو چھ ماہ تک کھاتے رہے۔ پھر اس کو ماپا تو اتنا ہی پایا جتنا کہ ہم نے پہلے رکھا تھا۔ میں نے اس بات کا تذکرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اگر تم اس کو نہیں ماپتے تو اپنی زندگی بھر کھاتے۔"

سخاوت

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اول تو تمام لوگوں سے زیادہ سخی تھے (کوئی بھی آپ کی سخاوت کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا کہ خود فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے اور عطاؤں میں بادشاہوں کو شرمندہ کرتے تھے۔)

ایک دفعہ نہایت سخت احتیاج کی حالت میں ایک عورت نے چادر پیش کی اور سخت ضرورت کی حالت میں آپ نے پہنی، اسی وقت ایک شخص نے یہ مانگ لی۔ آپ نے مرحمت فرما دی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم قرض لے کر ضرورت مندوں کی ضرورت کو پورا فرماتے تھے اور قرض خواہ کے سخت تقاضے کے وقت کہیں سے اگر کچھ آ گیا اور ادائے قرض کے بعد بچ گیا تو جب تک وہ تقسیم نہ ہو جائے۔ گھر میں تشریف نہ لے جاتے تھے) بالخصوص رمضان المبارک کے مہینے میں اخیر تک بہت ہی فیاض رہتے (کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی گیارہ ماہ کی فیاضی بھی اس مہینے کی فیاضی کے برابر ہوتی تھی۔)

اس مہینے میں جب بھی حضرت جبریل علیہ السلام تشریف لاتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کلام اللہ سناتے۔ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھلائی اور نفع رسانی میں تیز بارش لانے والی ہوا سے بھی زیادہ سخاوت فرماتے۔

(خصائل نبویؐ)

ظالم سلطان کا ساتھی

حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یمنہ کے مقام پر اپنے ساتھیوں عقبہ بن ابی العیزار رحمتہ اللہ علیہ اور حر بن یزید کے ساتھ بیان کیا۔ پہلے اللہ کی حمد و ثناء بیان کی پھر فرمایا۔

"اے لوگو! حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو آدمی ایسے ظالم سلطان کو دیکھے، جو اللہ کی حرام کردہ چیزوں کو حلال سمجھے اور اللہ سے کیے ہوئے معاہدے کو توڑے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا مخالف ہو اور اللہ کے بندوں کے بارے میں گناہ اور زیادتی کے کام کرتا ہو اور پھر وہ آدمی اس بادشاہ کو اپنے قول و فعل سے نہ بدلے تو اللہ حق پر ہوگا کہ وہ اس کو جرم کے لائق جگہ یعنی جہنم میں داخل کرے۔

(حیاۃ الصحابہ)

حرام کمائی

حضرت ابوداؤد احمدی رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مدائن شہر کے لوگوں میں بیان فرمایا۔

"اے لوگو! اپنے غلاموں کی کمائی کی تحقیق کرتے رہو اور یہ معلوم کرو کہ وہ کہاں سے کما کر تمہارے پاس لاتے ہیں کیونکہ حرام سے پرورش پانے والا گوشت کبھی بھی جنت میں داخل نہیں ہو سکے گا اور یہ بات جان لو کہ شراب کا بیچنے والا، خریدنے والا اور اپنے لیے بنانے والا یہ سب شراب پینے والے کی طرح ہیں۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت ابو حبیبہ رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں، جن دنوں حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے گھر میں محصور تھے۔ میں ان کی خدمت میں ان کے گھر گیا وہاں میں نے دیکھا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ فرما رہے تھے۔

(حیاۃ الصحابہ)

رشک کرنا

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"صرف دو خصلتوں پر رشک کرنا جائز ہے:
ایک اس آدمی (کی خصلت) پر جسے اللہ نے قرآن مجید عطا فرمایا، پس وہ اس کے ساتھ رات کی گھڑیوں میں بھی عمل کرتا ہے اور دن کی گھڑیوں میں بھی۔ اور دوسرا وہ آدمی جسے اللہ نے مال عطا فرمایا۔ چنانچہ وہ اسے رات کی گھڑیوں میں بھی خرچ کرتا ہے اور دن کی گھڑیوں میں بھی۔" (بخاری و مسلم)

فائدہ:
قیام باالقرآن سے مراد تلاوت کرکے اور احکام بجالا کر عمل کرنا ہے۔

خالدہ جیلانی

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ

آسیہ جاوید ——— علی پور چٹھہ

عمر کی پوروں کو اس کی کرچیاں ملتی نہیں
کانچ کا لمحہ جو ہاتھوں سے پھسل کر گر پڑا

نمرہ عاقب ——— گرین سٹی

یہ اور بات تم میری دسترس میں نہ تھے
محبتوں کا شجر بُر بہار کتنا تھا
مجھے تو راس نہ آئے ملاپ کے موسم
شکستِ دل کا سماں ساز گار کتنا تھا

سحر سہیل ——— کراچی

سوال چاہت، جواب وحشت
ستم کمانے کا سوچتے ہو
نہیں ہے احسان گر محبت
تو کیوں جتلانے کا سوچتے ہو

اقرا انیس ——— فیصل آباد

کچھ ایسی مہربان تو نہ تھی ہم پہ زندگی
کیوں ہر کوئی جہاں میں ہمارا رقیب تھا

حبیبہ خان ——— کراچی

جانے کیا بات ہوئی ہے جو خفا بیٹھا ہے
مجھ میں اک شخص بغاوت پہ تلا بیٹھا ہے
تھک گیا دشتِ طلب میں تو رسوائی بن کر
میرا سایہ میری دہلیز پہ آ بیٹھا ہے

فاکہہ احمد ——— کراچی

کتنی دلکش ہے اس کی خاموشی
ساری باتیں فضول ہوں جیسے

صدف عمران ——— حیدر آباد

ممکن ہے وہ دن آئے کہ دنیا مجھے سمجھے
لازم نہیں ہر شخص ہی اچھا مجھے سمجھے
ہے کوئی یہاں شہر میں ایسا کہ جسے میں
اپنا نہ کہوں اور وہ اپنا مجھے سمجھے

لائبہ امین ——— مظفر آباد

حسرت ہے تجھے سامنے کبھی دیکھوں
میں تجھ سے مخاطب ہوں ترا حال بھی پوچھوں

اریبہ شمشاد ——— آزاد کشمیر

اپنا غم اب خود ہی اُٹھا لے ورنہ رسوائی ہو گی
تیرا بھید چھپا کر دل میں ناحق بوجھ اُٹھائے کون

طوبیٰ اظہر ——— کراچی

کیسے عیش سے رہتے ہوں گے کتنے اتراتے ہوں گے
جانے کیسے لوگ وہ ہوں گے جو اس کو بھاتے ہوں گے

ہما طارق ——— خانیوال

ناکام عشق ہوں سو مرا دیکھنا بھی دیکھ
کم دیکھتا ہوا ہوں اور غضب دیکھتا ہوں میں

صائمہ سلیم ——— کراچی

میں ہجر کے عذاب سے انجان بھی نہ تھی
پر کیا ہوا کہ صبح تلک جان بھی نہ تھی
روتی رہی اگرچہ میں مجبور تھی بہت
وہ رات کاٹنی کوئی آسان بھی نہ تھی

بشریٰ چوہدری ——— بہاولپور

کوئی موسم ہو دل میں ہے تمہاری یاد کا موسم
کہ بدلا ہی نہیں جاناں تمہارے بعد کا موسم
نہیں تو آزما کر دیکھ لو کیسے بدلتا ہے
تمہارے مسکرانے سے دلِ ناشاد کا موسم

مسرت طارق ——— راولپنڈی

یہ قطرہ قطرہ پگھلتی ہیں اور گھلتی ہیں
غلافِ غم کی تمازت میں لڑکیاں لکڑیں
تمام میں اپنے مقدر کو ڈھونڈ سکتے ہو
تمہارے سامنے میں نے ہتھیلیاں رکھ دیں

pklibrary.com

امت الصبور

قارون

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

قارون حضرت موسیٰ علیہ السلام کا چچازاد بھائی تھا۔ خوش الحانی اور تورات کو شیریں لہجے میں پڑھنے کی وجہ سے لوگوں میں منور کے نام سے معروف تھا۔ لیکن بدقسمتی سے سامری کی طرح وہ بھی منافق ہوا۔ مالی کثرت پر اترانے اور تکبر نے اس کو ہلاکت کے گڑھے تک پہنچایا۔

شہر بن خوشب فرماتے ہیں: دوسروں پر اپنی بڑائی اور برتری حاصل کرنے کے لیے اپنے لباس میں ایک بالشت اضافہ کرتا تھا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"ہم نے اس کو اموال کے خزانے دیے اور اتنے کہ ان خزانوں کی کنجیاں اتنی زیادہ تھیں کہ ان کو اٹھانے کے لیے مضبوط جوانوں پر مشتمل ایک جماعت تھی۔" اعمش نے خیثمہ کے حوالے سے فرمایا ہے: کہ قارون کے خزانوں کی چابیاں چمڑے کی تھیں۔ ہر چابی ایک انگشت کے برابر تھی۔ ہر خزانے کی الگ الگ چابیاں تھیں۔ جب سو رہے ہوتے تو یہ چابیاں ساٹھ خچروں پر لاد دیتے۔ واللہ اعلم۔

قوم کے نیک طبع اور صالح لوگوں نے اس کی اس خرابی کی طرف اس کی توجہ مبذول کرائی اور وعظ و نصیحت سے کام لیا اور اسے نصیحت کی "اپنی اس مالی وسعت سے زیادہ خوش نہ ہو، یعنی اس پر اترانے اور اکڑنے کا انداز چھوڑ دو۔ اللہ تعالیٰ اترانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ بدترین اترانے والے وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں کی ناشکری کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ عطا کیا ہے اس میں آخرت کو تلاش کر اور اپنے دنیاوی حصہ سے بھی غافل مت ہو، یعنی اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ مال و دولت اور نعمت عظمیٰ کو اس کی اطاعت اور رضائے خداوندی کے حصول میں صرف کرو۔ اور دنیا سے فائدہ بھی اٹھاؤ۔ کھاؤ پیو، پہنو۔ اچھے مکان بناؤ شادیاں کرو۔ تب یاد خداوندی کے ساتھ یہ تمام امور تمہارے لیے جائز ہیں۔ ہر ایک کو اس کا حق دو۔ رب کا بھی تم پر حق ہے۔ نفس اولاد اور بیوی کے حقوق ہیں۔ تمام کے حقوق ادا کرو۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے بندوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو جس طرح اللہ تعالیٰ نے تیرے ساتھ احسان کا معاملہ فرمایا ہے۔ زمین میں فساد مچانے کی کوشش نہ کرنا۔"

یعنی اپنے مال و دولت کو فساد برپا کرنے پر مت خرچ کرنا۔ قارون نے یہ سن کر ترجمہ:

"مجھ کو تو یہ سب کچھ میری ذاتی ہنرمندی سے ملا۔ کیا اس نے یہ نہ جانا کہ اللہ تعالیٰ اس سے پہلے گزشتہ امتوں میں ایسے ایسوں کو ہلاک کر چکا ہے جو قوت میں اس سے کہیں بڑھے ہوئے تھے۔ اور مجمع ان کا زیادہ تھا۔ اور مجرموں سے ان کے گناہوں کا سوال نہ کرنا پڑے گا۔"

یعنی قوم کی نصیحت پر بجائے عمل کرنے کے الٹا کہنے لگا۔ مجھے تمہارے مشوروں اور نصیحتوں کی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ نعمتیں مجھے اس لیے دی ہیں کہ میں اس کا مستحق تھا۔ اللہ کی مجھ سے محبت ہے۔ اور میرے علم و لیاقت کی بنیاد پر سب کچھ مجھے ملا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں ارشاد خداوندی ہے:

"اگر ہم اس کو اپنی طرف سے رحمت چکھا دیتے ہیں بعد پہنچے تکلیف کے تو کہہ اٹھتا ہے۔ یہ میرا حق ہے۔" یعنی میں اس کا مستحق ہوں۔

بعض کہتے ہیں: قارون اسم اعظم جانتا تھا۔ اس نے اسم اعظم کے ساتھ خدا تعالیٰ سے دعا کی تو اس کے

اللہ تعالیٰ نے اس کے دعویٰ کو رد کرتے ہوئے فرمایا:

''یعنی اس قارون سے بہت زیادہ مال دار پہلے گزر چکے ہیں جو اس بات کی علامت نہیں تھی کہ ان سے ہمیں محبت ہے، اللہ تعالیٰ نے تو اس کے باوجود ان کو ان کے کفر اور کفران نعمت کی وجہ سے ہلاک کردیا۔'' امام عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم نے اس آیت کی عمدہ تفسیر فرمائی ہے، وہ فرماتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد مبارک انما اوتیتہ علی علم عندی'' کا مطلب یہ ہے کہ قارون نے کہا کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھ سے راضی نہ ہوتا اور مجھ پر اس کا فضل نہ ہوتا تو مجھے اس قدر مال و دولت عطا نہ فرماتا۔ قلیل علم رکھنے والے بھی جب ان لوگوں کو دیکھتے ہیں جن پر اللہ نے وسعت فرمائی ہے تو اسی طرح کہا کرتے ہیں کہ اگر وہ اس علم کے مستحق نہ ہوتے تو اللہ تعالیٰ ان کو اس سے نہ نوازتے۔

اس کے بعد ارشاد ہے: ''مطلب یہ ہے کہ ایک روز جب قارون خوب آرائش و زیبائش سے اور زرق و برق لباس اور حشم و خدام کے ساتھ اپنی قوم کے سامنے نکلا تو جو لوگ دنیا کے طالب اور اس کی زینت و آرائش کے خواہاں تھے وہ کہنے لگے کیا خوب ہوتا کہ ہم کو بھی وہ ساز و سامان ملا ہوتا جیسا قارون کو ملا ہے، وہ واقعی بڑا ہی صاحب نصیب ہے۔ جب ان کی بات کو ان لوگوں نے سنا جن کو علم نافع عطا کیا گیا تھا تو انہوں نے ان سے کہا تمہارا ناس ہو اللہ تعالیٰ کے گھر کا ثواب ہزار درجہ بہتر ہے، جو ایسے شخص کو ملتا ہے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے نیک مومن بندوں کو آخرت میں جو ایمان لائے اور نیک عمل کرے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے نیک مومن بندوں کو آخرت میں جو اجر و ثواب عطا فرمائیں گے وہ اس مال و دولت اور ساز و سامان سے ہزار درجہ بہتر ہے جو تم یہاں دیکھ رہے ہو۔'' (القصص 79-80)

جیسے حدیث صحیح بھی ہے: ''اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے بندوں کے لیے وہ چیزیں تیار کر رکھی ہیں جو نہ کسی آنکھ نے دیکھیں، نہ کسی کان نے سنیں اور نہ

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''پھر ہم نے (قارون) کو اور اس کے محل سرائے کو زمین میں دھنسا دیا۔ کوئی ایسی جماعت نہ ہوئی جو اس کو اللہ سے بچا لیتی۔ اور نہ وہ ہی خود کو بچا سکا۔ اور کل جو لوگ اس جیسے ہونے کی تمنا کر رہے تھے وہ کہنے لگے بس جی یوں معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے زیادہ روزی دے دیتا ہے، اور تنگی سے دیتا ہے۔ اگر ہم پر اللہ کی مہربانی نہ ہوتی۔ تو ہم کو بھی دھنسا دیتا۔''

اللہ تعالیٰ نے قارون کے دجل و فریب، مکر و دسیسہ کاری، سرکشی و نافرمانی اور عظیم رب کے احکام کی خلاف ورزی پر زمین پر اکڑ کر اور اترا کر چلنے اور خود کو تمام لوگوں سے بہتر سمجھنے کے متعلق بیان فرمادیا۔ اور اس کو زمین کے اندر دھنسا دیا۔ جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: ایک شخص اپنا تہہ بند نیچے لٹکا کر متکبرانہ و فاخرانہ چال چل رہا تھا۔ کہ اسے زمین میں دھنسا دیا گیا جو قیامت تک دھنستا ہوا چلا جائے گا۔

حافظ ابن المنذر نے اپنی کتاب ''العجائب الغریبۃ'' نوفل بن ماحق کے حوالے سے ذکر کیا ہے۔ کہ وہ کہتے ہیں: میں نے نجران کی مسجد میں ایک جوان کو دیکھا اور دیکھتا ہی رہا۔ اس کی خوب صورتی، دراز قدی اور مضبوطی سے متعجب سا ہو گیا۔ اس جوان نے کہا:

''تم میری طرف اتنے غور سے کیوں دیکھ رہے ہو؟''

میں نے کہا: ''آپ کے جمال و کمال پر متعجب ہو کر، تو کہنے لگا: تو ہی کیا۔ خود اللہ تعالیٰ کو بھی تعجب ہے۔'' یہ جملہ کہتے ہی وہ گھٹنے لگا۔ اور پست قد ہونے لگا۔ اور گم ہوتے ہوئے ایک بالشت کی مقدار تک پہنچ گیا۔ اس کے کسی رشتے دار نے اس کو اپنی آستین میں ڈالا اور لے گیا۔

یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ قارون کی ہلاکت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے ہوئی ہے۔ اس بددعا کے سبب کے بارے میں اقوال مختلف ہیں۔

سدی کی روایت کے مطابق اس کا سبب یہ ہے

آمادہ کیا کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر بنی اسرائیل کے سرکردہ لوگوں کی مجلس میں بہتان لگائے اور بھری مجلس میں جب موسیٰ بیان کر رہے ہوں یہ کہہ دے۔

"اے موسیٰ! تم نے میرے ساتھ یہ کیا ہے۔ (نعوذ باللہ منہ) چنانچہ قارون کے مالی لالچ میں آکر اس عورت نے بھری مجلس میں عین بیان کے وقت تیار کردہ پلان کے مطابق کہہ دیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر خوف کی وجہ سے لرزہ طاری ہوا۔ دو رکعت نماز پڑھنے کے بعد اس عورت کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا:

"میں تجھے اس خدا کی قسم دیتا ہوں جس نے سمندر کو بانٹ کر دو حصے کر دیے اور تمہیں فرعون کے پنجہ استبداد سے خلاصی دی۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سارے انعامات سے نوازا تو سچ سچ بتا کہ یہ کہنے پر کس چیز نے تجھے تیار کیا۔"

تو وہ عورت کہنے لگی: "آپ نے جب اللہ کا واسطہ دیا تو میں سچ بیان کرتی ہوں۔ ہوا یہ کہ قارون نے مجھے اتنا اتنا مال دیا کہ میں تیرے بارے میں بھری مجلس میں یہ نازیبا الفاظ کہہ دوں۔ اب میں اللہ تعالیٰ کے دربار میں توبہ کرتی ہوں اور اپنے گناہ اور خطا کی معافی کی طلب گار ہوں۔

اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پھر دربار الٰہی میں جبین نیاز خم کی اور قارون کے خلاف اللہ تعالیٰ کی مدد چاہی۔ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی خبر دی کہ میں نے زمین کو حکم دیا ہے کہ وہ تیری اطاعت کرے گی۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے زمین کو حکم دیا کہ اس کو نگل لے۔ تو زمین نے حق اطاعت ادا کرتے ہوئے قارون کو لقمہ بنایا۔

بعض حضرات نے اس کی تفصیل یوں بیان کی ہے: قارون جب باہر نکلتا تو بڑے ٹھاٹ باٹ سے نکلتا ایک سفید و خوب صورت سواری پر سوار ہوتا۔ خوب صورت سرخ، رنگ دار لباس خود بھی پہنتا اور اپنے خدام و حشم کو بھی پہناتا۔ اس طرح رنگ ڈھنگ سے ایک دن باہر نکلا حضرت موسیٰ علیہ السلام محفل میں اللہ تعالیٰ کے السلام کے پاس سے گزرا۔ لوگوں کی نظریں جب اس پر پڑیں تو سب اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کو اپنے پاس بلا کر پوچھا۔ ایسا کام کرنے پر کس چیز نے تمہیں برانگیختہ کیا؟"

کہنے لگا: "موسیٰ! اگر تو نبی ہونے کی وجہ سے ہم پر فضیلت رکھتا ہے۔ میں مالی وسعت کی بنا پر تم پر فضیلت رکھتا ہوں۔ اگر چاہو تو ہم ایک دوسرے کے خلاف بددعا کریں دیکھتے ہیں کس کی دعا قبول ہوتی ہے۔"

چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کے لیے تیار ہوئے۔ اور وقت مقرر میں تشریف لائے۔ اور قارون بھی اپنی قوم قبیلے کے ساتھ حاضر ہوا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

"تم پہلے دعا کرو گے یا میں کروں؟"

قارون نے کہا: "میں پہلے دعا کرتا ہوں۔"

اس نے دعا کی مگر قبول نہ ہوئی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: "اب میں مانگوں؟"

قارون نے ہاں میں جواب دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دربار الٰہی میں دست دعا دراز کیا اور فرمایا: "یا اللہ! زمین کو حکم دیجیے آج وہ میری بات مانے۔"

اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی فرمادیا "آپ کی دعا قبول کی۔"

چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے زمین کو حکم دیا۔

"اے زمین اس کو پکڑ لے"

تو زمین نے اس کو ٹخنوں تک دھنسالیا۔ پھر آہستہ آہستہ کندھوں تک اپنے اندر لے لیا۔ پھر اس کو حکم دیا۔

"اس کے خزانوں کی طرف متوجہ ہو جا" زمین نے اس کی طرف بھی توجہ دی۔ تو ان کو بھی نگل لیا۔

(تفسیر ابن کثیر)

☆☆

بات کرتے ہیں تو اچھا لگتا۔"

"روٹین لائف میں تبدیلی آئی؟"

"بالکل آئی..... زندگی میں ایک نیا کام شروع ہوا تو روٹین بھی متاثر ہوئی..... اور یہ بات بھی اب پرانی ہو چکی ہے اور اب تو سب کچھ سیٹ ہو گیا ہے کہ کس وقت کیا کام کرنا ہے، کہاں جانا ہے وغیرہ وغیرہ بہت بزی لائف ہے۔"

"اور اگر فراغت ملے تو کیا کرتی ہیں؟"

"تو پھر میں ہوتی ہوں اور میری فیملی..... سارا وقت ان ہی کے ساتھ گزارتی ہوں۔"

"آئے دن آپ ملک سے باہر ہوتی ہیں۔ باہر کی ترقی دیکھ کر کیا احساسات ہوتے ہیں؟"

"باہر جا کر دنیا کی ترقی دیکھ کر بہت رشک آتا ہے اور اپنے ملک کے بارے میں سوچ کر دل کڑھتا ہے کہ ہم ایسے کیوں نہیں ہیں۔ سچ پوچھیں تو مجھے تو اپنے ملک کے حالات دیکھ کر بہت مایوسی ہوتی ہے۔"

"ایسا کیوں ہے؟"

"نہ عوام سنجیدہ ہیں نہ حکمران اور پھر عوام میں اس بات کا شعور ہی نہیں ہے کہ ہمارے ملک میں کون بہتر کام کر سکتا ہے یا کون ہمارے ملک کے لیے مخلص ہے۔ اور اس کی سب سے بڑی وجہ تعلیم کی کمی ہے۔ تربیت کی کمی ہے۔"

"افغانستان سے تعلق، انگریزی زبان میں تعلیم پھر بھی اردو بہترین ہے؟"

"اردو اس لیے اچھی ہے کہ میرا پسندیدہ مضمون اردو تھا اور میں اسکول میں شوق سے اردو پڑھتی تھی۔ اور پھر جب A لیول میں آئی تب بھی میں نے اردو کا مضمون رکھا۔ کیونکہ مجھے مزہ آتا تھا اردو پڑھنے میں..... ویسے گھر میں ہم زیادہ تر "فارسی" بولتے ہیں۔"

"اپنی عادات کے بارے میں کیا کہو گی؟"

"عادات!" سوچتے ہوئے۔ "ہاں نہ میں جھوٹ بولتی ہوں اور نہ ہی مجھے جھوٹ بولنے والے پسند ہیں۔ لیکن..... لیکن اگر کوئی پریشانی ہے اور میرے ایک جھوٹ بولنے سے کسی کی پریشانی دور ہو سکتی ہے تو پھر ضرور بولتی ہوں۔

کسی کی برائی نہیں کرتی، بہت نرم دل ہوں اور ہاں بات کو دل میں نہیں رکھتی، منہ پر بول دیتی ہوں اگر کسی سے کوئی شکایت ہوتی ہے۔

فضول خرچ بھی ہوں لیکن صرف اپنی فیملی کے لیے یا پھر اپنے لیے..... غصے کی میں بہت تیز ہوا کرتی تھی گزرے دور میں لیکن اب ایسا نہیں ہے۔ اب میرا غصہ کافی حد تک کم ہو گیا ہے۔ اور غصے میں جو منہ میں آتا ہے بول دیتی ہوں اور روکھی اور روڈ ہو جاتی ہوں۔ بولتے وقت لفظوں کا بہت خیال رکھتی ہوں کہ کسی کا دل برا نہ ہو..... اور ایسا میں غصے کے وقت بھی کرتی ہوں۔ لہجہ روکھا ہو جاتا ہے مگر الفاظ سخت نہیں ہوتے۔"

"یہ میری عادتیں ہیں جن کو میں نے تفصیل کے ساتھ بتا دیا؟"

"بہت شکریہ..... اور اس بات کا بھی شکریہ کہ تم نے ایک بار پھر انٹرویو دیا۔"

☆☆

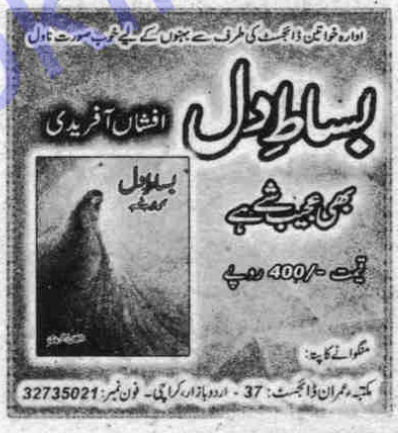

موسم کے پکوان

واصفہ سہیل

وانٹون

ضروری اشیاء:

مرغی کا گوشت	ایک کپ
کالی مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
سویا ساس	ایک کھانے کا چمچہ
چلی ساس	ایک کھانے کا چمچہ
تیل	حسب ضرورت
نمک	حسب ذائقہ
سموسہ پٹی	حسب ضرورت

ترکیب:

سب سے پہلے بغیر ہڈی مرغی کے گوشت کو پانی میں ابال لیں۔ جب پانی خشک ہو جائے تو اس کو نکال کر ریشہ کر لیں۔ کالی مرچ، نمک، سویا ساس اور چلی ساس ملا کر اچھی طرح مکس کر لیں۔ سموسہ پٹی پر فلنگ رکھیں اور تکون بنا کر ڈیپ فرائی کر لیں۔

مونگ کے دہی بڑے

ضروری اشیاء:

مونگ کی دال	ایک پاؤ
میٹھا سوڈا	آدھا چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
دہی	ایک کلو
شکر	چار کھانے کے چمچے
تیل	حسب ضرورت

ترکیب:

دال کو دھو کر رات سے پانی میں بھگو دیں۔ صبح پانی نکال کر پیس لیں۔ اس میں نمک سوڈا ملا کر اچھی طرح پھینٹ لیں۔ پھر گہرے تیل میں بڑے تل لیں۔ سنہری ہونے پر اتار لیں۔ نیم گرم پانی میں نمک ڈال کر بڑے اس میں ڈال دیں۔ پندرہ منٹ بعد بڑے نکال کر پانی ہاتھ سے دبا دبا کر نکال دیں۔ پھر دہی ایک کلو لے کر چار کھانے کے چمچے شکر دہی میں ملا کر پھینٹ لیں۔ بڑوں کے اوپر یہ دہی ڈال دیں۔ چاٹ مسالا اوپر ڈال کر نوش فرمائیں۔

کھجور کی چٹنی

ضروری اشیاء:

کھجور	پندرہ عدد
زیرہ	دو چائے کے چمچے
سونف	ذرا سی
گڑ (پسا ہوا)	آدھا کپ
املی کا گودا	ایک کپ
پسی لال مرچ	دو چائے کے چمچے
سونٹھ	ایک چائے کا چمچہ
کالا نمک	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب: کھجور کو دھو کر صاف کر لیں اس کے بیج نکال کر اسے باریک کر لیں۔ زیرے اور سونف کو توے پر بھون لیں تھوڑا ٹھنڈا ہو جائے تو پیس لیں۔

ایک ساس پین میں کھجور، گڑ، املی کا گودا، لال مرچ، سونٹھ، کالا نمک، نمک اور بھون کر پیسا ہوا زیرہ ڈال کر نوش کریں۔

چنا چاٹ

ضروری اشیاء:

سفید چنا	ایک کلو
لال مرچ (کٹی ہوئی)	ایک کھانے کا چمچہ
املی	دو کھانے کے چمچے

pklibrary.com

کھوئی ہری مرچ	حسب پسند
لیموں کا جوس	حسب ضرورت
پیاز	دو عدد
آلو	تین کپ
نمک	حسب ذائقہ
چاٹ مسالا	دو چائے کے چمچے
پاپڑی	حسب ضرورت
پودینہ	آدھا پیالی
ہرا دھنیا	آدھی پیالی
ٹماٹر	تین عدد

ترکیب: چنوں کو پوری رات کے لیے بھگو دیں۔ چنوں کو ابال لیں۔ املی کو بھگو دیں۔ پودینہ، ہری مرچ اور ہرا دھنیا باریک کاٹ لیں کر لیں۔ ٹماٹر، پیاز باریک کاٹ لیں آلوؤں کے کیوبز کاٹ لیں۔ آلوؤں کو ابال لیں۔ آلو، ٹماٹر، پیاز، لیموں کا جوس، نمک، لال مرچ، چاٹ مسالا، املی، پاپڑی، پودینہ، ہرا دھنیا مسالا مکس کر لیں اور سرو کریں۔

تکہ اور پراٹھا

ضروری اشیاء:

مرغی	آدھا کلو
دہی	ایک کپ
ادرک، لہسن پیسٹ	ایک چائے کا چمچہ
زیرہ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
پسا گرم مسالا	ایک چائے کا چمچہ
میدہ	آدھا کپ
نمک	آدھا چائے کا چمچہ
ہلدی پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
پسی ہری مرچ	ایک چائے کا چمچہ
زردے کا رنگ	ذرا سا
بڑی الائچی	ایک عدد
لیموں کا رس	دو چائے کے چمچے

پراٹھے کے لیے:

میدہ	ایک کپ
سفید فائن آٹا	ایک کپ

ترکیب: غیر ہڈی کے مرغی کے گوشت میں دہی، ادرک، لہسن، زیرہ پاؤڈر، پسی ہری مرچ، زردے کا رنگ، پسی بڑی الائچی اور لیموں گرم مسالا، ہلدی پاؤڈر اور نمک لگا کر ایک گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ اس کے بعد سیخوں میں لگا کر اوون میں بیک کر لیں اور پتیلی میں رکھ کر کوئلے کا دھواں بھی دے دیں تکہ تیار ہے۔ (اگر اوون نہ ہو تو کسی دیگچی میں پکا لیں اس کے بعد کوئلے کا دھواں دے لیں)

پراٹھے کے لیے:

آٹا اور میدہ ملا کر چھان لیں اس کے بعد گوندھ کر اس کے چھوٹے چھوٹے پیڑے بنائیں روٹی کو بیل لیں اور اس پر گھی لگا کر اسے رول کر لیں اور دوبارہ پیڑے کی شکل میں لے آئیں اور بیل کر پراٹھا بنا لیں توے پر سینکیں اور گھی لگا کر فرائی کر لیں۔

سرونگ پلیٹ میں تیار کیا ہوا تکہ رکھیں، گرم گرم پراٹھے رکھیں لیموں کی قاشوں سے گارنش کر کے دہی کے ساتھ سحری کے مزے لیں۔

اریان

ضروری اشیاء:

دہی	ڈھائی کپ
ٹھنڈا پانی	دو کپ
نمک	ایک چٹکی
پودینہ	چند پتے

ترکیب:

ٹھنڈے دہی میں پانی ڈال کر اچھی طرح پھینٹ لیں اب اس میں نمک شامل کریں۔ سرونگ گلاس میں نکال کر اوپر پودینہ ڈال کر افطار میں نوش کریں۔

☆☆

pklibrary.com

خوب صورت بالوں کے لیے

مضبوط اور چمک دار بالوں کے لیے

بے رونق، بے جان اور الجھے ہوئے بال عام مسئلہ ہے۔ بالوں کو بہت زیادہ دھونے اور کیمیکل سے بھرپور شیمپو کا استعمال کرنے سے بال الجھے الجھے اور بے جان نظر آتے ہیں۔

آپ بالوں کو قدرتی چمک اور مضبوطی عطا کرنے کے لیے مہنگی پروڈکٹ کے بجائے گھر پر موجود قدرتی اجزاء سے تیار کردہ نسخوں پر عمل کر کے بالوں میں جان اور رونق پیدا کر سکتی ہیں۔

بالوں میں خوب صورتی پیدا کرنے کے لیے ہم کچھ نسخے دے رہے ہیں۔

1۔ خشک اور روکھے بالوں کی خوب صورتی بحال کرنے کے لیے انڈے کی زردی بے حد مفید ثابت ہوئی ہے۔

بالوں کو شیمپو کرنے سے پہلے ایک انڈے کو اچھی طرح پھینٹ لیں اور اسے بالوں میں لگائیں۔ بالوں کو شاور کیپ سے ڈھانپ لیں اور آدھے گھنٹے بعد انہیں شیمپو سے دھولیں۔ بال گرنا بند ہوجائیں گے۔ اور کیپ نہ ہو تو کسی کپڑے میں لپیٹ لیں۔

2۔ چار کھانے کے چمچے زیتون کا تیل لیں اسے نیم گرم کرلیں۔ اس تیل کو انگلیوں کی پوروں سے بالوں کی جڑوں میں لگائیں پھر سارے بالوں میں لگالیں۔

ایک تولیہ گرم پانی میں بھگولیں اور نچوڑ کر سر پر لپیٹ لیں پندرہ منٹ بعد شیمپو کرلیں۔

مہینے میں تین سے چار بار یہ عمل بالوں کو خوب صورت بنانے کے ساتھ ساتھ انہیں مضبوط بھی کرتا ہے۔

3۔ ثابت مونگ کی دال ایک مٹھی پیس لیں۔ اس میں آدھا کپ دہی ملائیں اور اس آمیزے کو بالوں پر لگا کر سر اچھی طرح ڈھانپ لیں۔ آدھے گھنٹے بعد سر دھولیں۔

4۔ ابلتے ہوئے پانی میں چائے کی پتی ڈال کر ایک منٹ پکائیں۔ پھر اسے چھان لیں۔ اس کے بعد ایک چمچہ لیموں کا رس ملائیں اور بالوں کو شیمپو کرنے کے بعد اس آمیزے کو بالوں پر ڈالیں۔ چند منٹ بعد سر پانی سے دھوئیں۔ بال مضبوط ہوجائیں گے۔

ہلکے بالوں کے لیے ماسک

کچھ لوگوں کے بال نہایت ہلکے ہوتے ہیں چمک دار ہونے کے باوجود وہ پرکشش نظر نہیں آتے بالوں کے ہلکے پن کی وجوہات موروثی بھی ہوسکتی ہیں اور بچپن میں ہونے والی غذائی قلت بھی اس کی بڑی وجہ ہوسکتی ہے۔ سرسوں کا تیل، زیتون کا تیل اور کیسٹر آئل کی یکساں مقدار کو ملا کر ایک مکسچر آئل تیار کریں اس سے بالوں میں 15-20 منٹ تک ملائمت سے مساج کریں اور رات بھر سر میں لگا رہنے دیں اور صبح ریٹھے، آملہ اور سیکا کائی کے مکسچر سے (رات بھر بھگوئے ہوئے) سر دھولیں۔ اس کے بعد بالوں کو صرف اتنا خشک کریں کہ ان میں ہلکی ہلکی سی نمی باقی رہے اس کے بعد ایک اسپرے بوتل میں تین کھانے کے چمچے لیموں کا رس دو کھانے کے چمچے ناریل کا پانی ڈال کر ہلکے نم بالوں پر اسپرے کرلیں اور استعمال کرنے کے بعد اس مکسچر کو فریج میں رکھ دیں۔ مہینے میں دو مرتبہ مندرجہ بالا طریقے پہ باقاعدگی سے عمل کرنے سے محض چند مہینوں میں آپ کے بال گھنے چمک دار اور انتہائی دلکش دکھائی دینے لگیں گے۔

☆☆

pklibrary.com